/ Maqām-i Khilāfat

// ʿAbd al-Qādir, Shaykh

مقامِ خلافت

یعنی

استانبول

پایہ تختِ دولتِ عالیہ عثمانیہ

کے

دلچسپ حالات اور اُس کے اہالی اور اُس کے قُرب و جوار کے متعلق تازہ ترین معلومات

جو

شیخ عبدالقادر صاحب بی۔اے ایڈیٹر مخزن کے سفرِ قسطنطنیہ کا نتیجہ ہیں

بار اوّل 1906

قیمت ہے
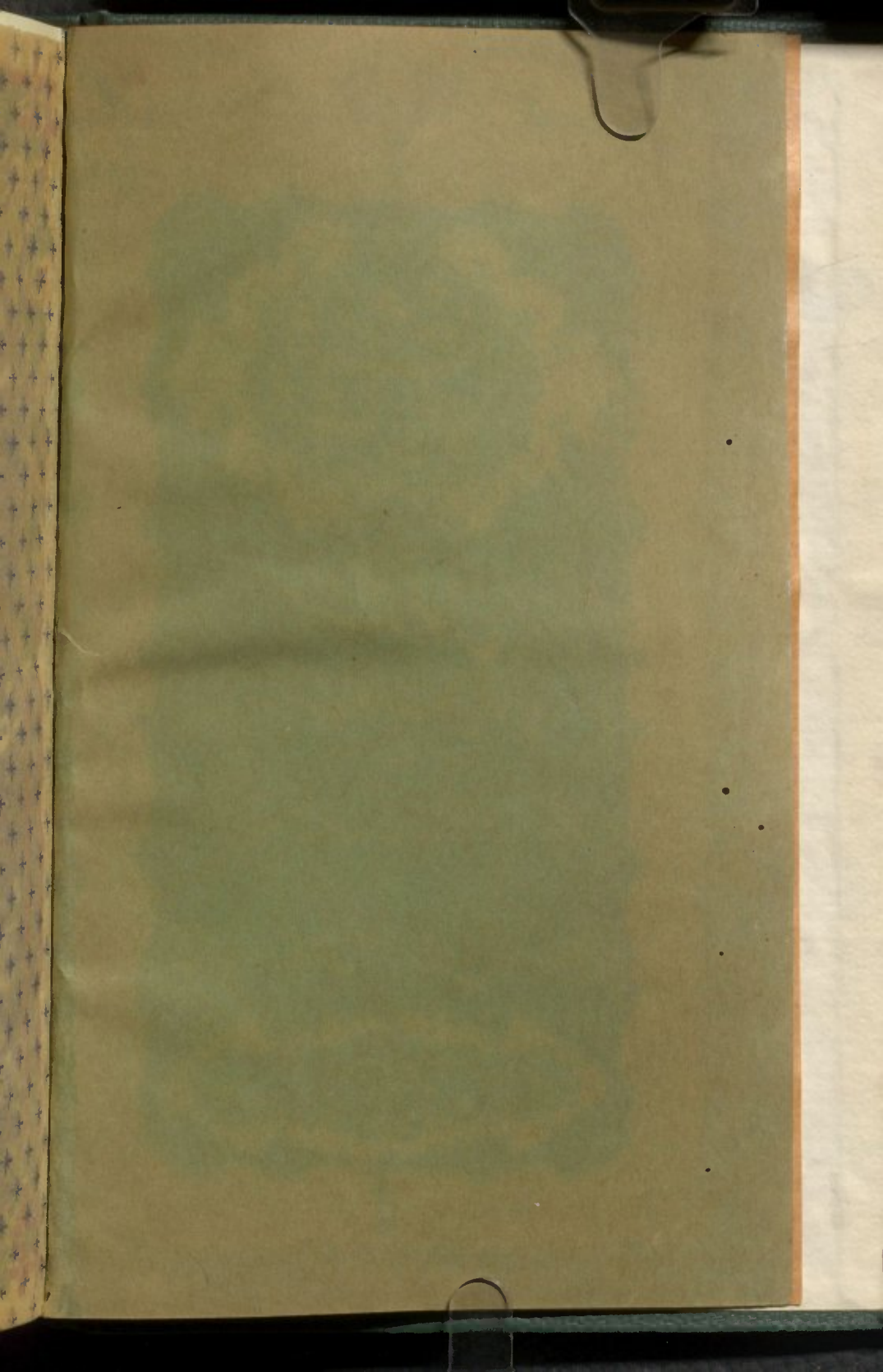
مقامِ خلافت

یعنی

سفرِ استانبول کے حالات

از

شیخ عبد القادر صاحب بی۔ اے بیرسٹر ایٹ لا

باہتمام شیخ محمد اکرام مخزن پریس دہلی میں چھپکر شایع ہوئی

فہرستِ مضامینِ مقامِ خلافت

فہرستِ تصاویر مقامِ خلافت

جامع حضرت ایوب انصاری
Apollon. No. 45 176
Vue d'Eyoub Sultan

آب و دانہ کی کشش۔ سیر و سفر کی عادت یا مقامِ خلافت کی زیارت کی دیرینہ آرزو۔ گذشتہ سال موسمِ گرما میں مجھے استانبول لے گئی۔ وہاں چند ہفتے نہایت لُطف سے گذرے۔ عُثمانیوں کی اُخوّتِ اِسلامی نے غربت میں وطن کا سماں باندھ دیا۔ دِن گذرتے معلوم نہ ہُوئے۔ چار ہفتے ٹھہرنے کے ارادے سے گیا۔ سات ہفتے رہا۔ اِس پر بھی دل یہی کہتا تھا کہ ابھی اَور رہیئے۔ مگر تعطیل کا زمانہ تمام ہوا۔ لندن واپس پہنچنے کا وقت قریب آگیا۔ ناچار استانبول کو خیرباد کہنا پڑا۔ واپسی پر یارانِ وطن

کے خط پہنچے کہ معلُوماتِ سفر میں ہمارا بھی حصہ ہے"۔ اِتنے دنوں کے سفر میں کیا معلومات ہم پہنچ سکتی تھیں۔ مگر جو کچھ معلوم ہوا اُس سے دریغ نہیں۔ حاضر کئے دیتا ہوں۔

یہ مختصر سی کتاب نہ سفرنامہ ہے۔ نہ سیاحت نامہ۔ اور نہ مَیں چاہتا ہُوں کہ اِسے اِس نظر سے دیکھا جائے۔ بعض اتّفاقات ایسے جمع ہو گئے۔ کہ مَیں نے استانبول کے قابلِ دید مقامات کو نہایت مُعتبر رہبروں کی معیّت میں دیکھا اور وہاں کے اکابر سے ملاقات کی۔ اِس لئے اِن چند ہفتوں کے مشاہدات اس قابل ہو گئے کہ انہیں حوالۂ قلم کیا جائے۔ آنکھوں نے استانبول اور اس کے قُرب و جوار کے دلپذیر مناظرِ قدرت کے مزے لئے۔ کانوں نے شیریں زبان ترکوں کی گفتگوئیں سُنیں۔ یہ جو کچھ مَیں پیش کرتا ہُوں اُن مناظر کی ایک دُھندلی سی تصویر اور اُن دلنشین لہجوں کی ایک ہلکی سی صدا ہے۔

عبدالقادر

اِستانبول

قُسطنطُنیہ اور استانبول دو ناموں سے یہ شہر مشہور ہے اور دونوں اپنی اپنی جگہہ تاریخی حکایات سے بھرے ہُوئے ہیں۔

قسطنطنیہ! نام لیتے ہی کیا کیا نقشے آنکھوں کے روبرو آجاتے ہیں۔ روما کی عظیم الشّان سلطنت کا زمانہ عروج۔ قسطنطینِ اعظم کا دَور۔ جسطنتین کا عہد۔ رومی قیصروں کی خواہش کہ ایک نیا روما بنائیں۔ اس خواہش کے پُورا کرنے کے اہتمام۔ اس کی تکمیل۔ اور صدیوں کی تعمیرات۔ اب وُہ سب کہاں ہیں؟ اِسی نام میں پنہاں ہیں اور چند شکستہ آثار کے سوا یہی اُن گذشتہ صدیوں کی یادگار باقی ہے۔

استانبول! اس نام کے ساتھ قسطنطنیہ کے موجُودہ فرمانرواؤں کی تاریخ وابستہ ہے۔ اور اُن کی عظمت و اقتدار کی حکایت گویا اس لفظ میں بند ہے۔ سُلطان محمد فاتح کی مشہور فتوحات سے لیکر مختلف سلاطین عالی وقار کی کامیابیوں اور ناکامیوں کا تماشا اسی استانبول نے دیکھا ہے۔ اس کی سرزمین کا چپہ چپہ اپنے اندر ایک ہسٹری چھپائے ہُوئے ہے۔ اور اس کی پُرانی پُرانی دیواریں اور اونچی نیچی گلیاں اپنی اپنی کہانی سُنا رہی ہیں۔

لیکن اس نادر شہر کی دِلچسپی صِرف تاریخی ہی نہیں۔ جُغرافیہ نے بھی اس کی اہمیت بڑھانے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا۔ یورپ اور ایشیا کا مقامِ اتّصال یہی ہے۔ کُرۂ زمین کے نقشے پر اگر نگاہ دوڑائیں تو آسانی سے نظر آسکتا ہے کہ لکھنے والوں نے

اسے "کلیدِ عالم" بجا نہیں لکھا جب تک عثمانی سلطنت بری اور بحری قوت میں یورپ کی دوسری سلطنتوں کے جوڑ کی تھی۔ اور عیسائی سلطنتوں نے مذہبی تعصب سے کام لیکر اس کے خلاف ایکا نہیں کیا تھا۔ اُس وقت تک یورپ کی ہر سلطنت فرداً فرداً سلطنتِ عثمانیہ سے کانپتی تھی۔ کیونکہ اُنہیں معلوم تھا کہ قسطنطنیہ کے محلِ وقوع نے اسے کس قدر محفوظ بنا دیا ہے اور اُسے دوسروں پر حملہ کرنے کے لئے کتنی آسانیاں دے رکھی ہیں۔ خشکی اور تری دونوں راستے اُس کے لئے یکساں کھلے ہیں۔ اب بھی اگر ترکوں کی بحری طاقت سنبھل جائے اور اندرونی انتظام میں اغیار کی مداخلت نہ رہے تو قسطنطنیہ کا محلِ وقوع اس کے مالکوں کو یہ موقعہ دیتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو زیادہ خطرہ میں ڈالنے کے بغیر دوسروں کی عافیت کو معرضِ خطر میں رکھیں۔ اسی لئے تو اُن کے بیدار ہمسائے اُنہیں چین سے رہنے نہیں دیتے۔ اور ہمیشہ "مشرقِ قریب" میں کوئی نہ کوئی بکھیڑا کھڑا رکھتے ہیں۔

• علومِ تاریخ و جغرافیہ کے اعتبار سے جو اہمیت استانبول کو ہے۔ اس کے علاوہ اس کے کوہ و دریا کا لطف۔ اس کے باغ و راغ کے نظارہ کا شوق۔ اس کی مخلوط آبادی کا تماشا اور موسمِ گرما میں اس کی آب و ہوا کا اعتدال ہر سال دنیا کے ہر گوشے سے لوگوں کو کھینچتا ہے۔ امریکا کے لوگ جو سیر و سیاحت میں سارے جہان سے سبقت لے گئے ہیں۔ ہزاروں آتے ہیں۔ اور اگر آمد و رفت میں گیر و دار۔ روک تھام اس قدر نہ ہو جس قدر اب ہے تو اور بھی زیادہ آئیں۔ ان کے علاوہ انگریز آتے ہیں۔ فرانسیسی آتے ہیں۔ جرمنی آتے ہیں۔ غرض یورپ کی ہر قوم کے افراد ہر وقت استانبول میں موجود رہتے ہیں۔ اور اس کے حالات معلوم کرنے

کے مشتاق - مگر مسلمانوں کے لئے استانبول میں ایک خاص کشش ہے - اور وہ یہ
یہ مقام ایک ایسے بادشاہ کا پایۂ تخت ہے - جو نہ صرف اسلامی تاجداروں میں سب سے
بڑا ہے - بلکہ دُنیا کے مسلمانوں میں بیشتر کے نزدیک خلیفۂ وقت ہے اور اسی لئے
مُسلمان اکثر اِس مقام کو مقامِ خلافت کہتے ہیں اور اس کے حالات سُننے کا
بیحد شوق رکھتے ہیں - روس کے مُسلمان تو اکثر حجِ بیتُ اللہ شریف کو جاتے
وقت اسی راستے سے گذرتے ہیں اور مقامِ خلافت کی سَیر کو اپنے مقدس سفر
کا ایک ضروری جُزو سمجھتے ہیں - لیکن ان کے سِوا اَور ممالکِ اسلام سے بھی زائر
آتے جاتے ہیں - ہندوستانی مُسلمان بھی وقتاً فوقتاً وہاں پہنچتے ہیں - مگر تعجب
کی بات ہے کہ چین کے مُسلمان جو اس دارالخلافت سے ہندوستانیوں سے
بھی دُور ہیں - اکثر آتے رہتے ہیں - اور بعض اپنے بچّوں کو وہاں تعلیم و تربیت
کے لئے بھیجتے ہیں - گویا تاریخ اور جغرافیہ کی کوشش کے سوا مذہب کی زبردست
قوّت بھی اس عجیب مقام کی قدر بڑھانے میں مدد دے رہی ہے - قسطنطنیہ میں
ایسے لوگ موجود ہیں جو اس مقامِ خلافت کی حفاظت کے لئے اپنی جان نثار کرنا نہ صرف
قومی اور ملکی بلکہ مذہبی فرض جانتے ہیں - کیونکہ وہاں ایک روایت نہایت مقبول ہے کہ
اس شہر کا فتح ہونا جناب سرورِ کائنات صلّی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث کی تصدیق کے لئے
لازم تھا - مسلمانوں نے اس کے فتح کرنے میں اپنا فرضِ مذہبی ادا کیا اور اس قبضہ کا
قائم رکھنا اسی اعتبار سے اُن پر واجب ہے -

فتوحات کی تاریخ میں شاید "فتحِ جلیل[1] قسطنطنیہ" سے بڑھ کر عجیب حالات کسی بڑے

[1] اس نام کی ایک کتاب ترکی زبان میں شائع ہوئی ہے جسمیں اس اہم تاریخی واقعہ کی کیفیت شرح و بسط کے ساتھ بیان کیگئی ہے"

پایۂ تخت کے فتح ہونے کے متعلق مروی نہیں ہیں۔ جامع فاتح کے ایک دروازہ پر وہ حدیثِ نبویؐ لکھی ہے۔ جس سے فتح قسطنطنیہ کے لیے مُسلمانوں کی متواتر کوششیں منسوب ہیں۔ حدیث شریف کی عبارت یہ ہے:۔ لَتُفْتَحَنَّ[۱] الْقُسْطُنْطِينِيَّةُ فَلَنِعْمَ الْاَمِيرُ اَمِيرُهَا وَلَنِعْمَ الْجَيْشُ ذٰلِكَ الْجَيْشُ۔ اِس پیشین گوئی سے بڑھ کر حیران کرنے والی پیشین گوئی کیا ہوسکتی ہے۔ کہ ساتویں صدی عیسوی کے نصف اوّل میں عرب کے چند بادیہ نشینوں کو جو پیغمبرِ عربؐ کے زبردست منقناطیسی اثر سے اس کے گرد جمع ہوگئے تھے۔ یہ مژدہ دیا جائے کہ مُسلمان قیصرِ روما کی عالیشان سلطنت کی بنیاد اُکھیڑ دینگے۔ اور خود اُس کی جگہ لینگے۔ اور اُن لوگوں کے عقیدہ کی پختگی کو دیکھیے کہ وُہ اُس بے سروسامانی میں بھی اس اُمّید پر اُٹھ کھڑے ہُوئے کہ وہاں پہنچنے کی دیر ہے۔ پھر وہاں کی کلید ہمارے ہاتھ میں ہے۔ ۶۶۸ء میں یعنی رسُولِ مقبولؐ کے وصال کے بعد تھوڑے سے عرصے کے اندر ہی اِن باحوصلہ عربوں نے قسطنطین کے پایۂ تخت کے دروازہ پر آ دستک دی۔ حضرت ایُّوب انصاری عَلَم بردارِ نبویؐ اس لشکر کے سرگروہ تھے۔ اُس زمانے میں شہر کے گرد مضبُوط دیواریں تھیں۔ عیسائی خبر پاتے ہی دروازے بند کر کے قلعہ بند ہو بیٹھے۔ مُسلمانوں نے باہر ڈیرے ڈال دیئے۔ آخر دونوں کی مُٹھ بھیڑ ہُوئی۔ مُسلمانوں نے دادِ مردانگی دی۔ تعداد میں کم تھے اور گھر سے منزلوں دُور۔ کئی خشک بیابان اور کئی دشوار گزار پہاڑی راستے۔ کئی دریا اور کئی وادیاں درمیان حائل تھیں۔ بھاگ کر جاتے تو کہاں جاتے اور بھاگنے والے ہوتے تو اتنی دُور کیوں آتے۔ کچھ لڑائی میں کام آئے

---

[۱] ترجمہ۔ تم فتح کرو گے قسطنطنیہ کو پس مبارک ہو وہ امیر جو اس شہر کا امیر ہوگا اور مبارک ہو وہ لشکر جو اس کا لشکر ہوگا۔

اور کچھ وبا کی نذر ہوئے - مگر مرتے ہوئے اپنے مغرور غنیم سے یہ کہہ گئے - کہ یہ نہ سمجھنا کہ یہ ہڈیاں یہاں بے سبب گڑی ہیں - اس خاک پر ہم بے وجہ نہیں لیٹے جب یہ ہڈیاں پیوندِ خاک ہو جائیں گی - تب اس خاک سے ایک خمیر اُٹھے گا - اور وُہ خمیر مائہ دُکانِ اسلام ہوگا - جس کی گرم بازاری کا زمانہ آنے والا ہے -

یہ بہادر مرنے کو تو مر گئے - مگر عجب کام کر گئے - بجائے اس کے کہ انکی یہ شکست مسلمانوں کی ہمت کو شکست دے - اس کے لئے اَور تازیانہ بنی - شُبہ تو اس زمانے کے استوار عقائد میں راہ پا نہیں سکتا تھا - وُہ دِل سے مانتے تھے کہ جناب رسالت مآب کی زبان وحی ترجمان سے جو بات نکلی ہے وُہ پُوری ہو کر رہیگی خواہ اسباب اس کے کتنے ہی مخالف کیوں نہ نظر آئیں - اب انہیں مزید ترغیب یہ ہوگئی - کہ اپنے شہیدوں کا خُون بہالیں - اُن کی ہڈیوں کی حفاظت کریں - اُن کے مزار بنائیں اور اُن مزاروں کو بے حُرمتی سے بچائیں - آئے اور بار بار آئے - عربوں نے سات سال متواتر حملہ کیا - خُلفائے بغداد کے عروج کے زمانہ میں ہارون رشید آیا - اور اسکدار (سقوطری) پر اس کا جھنڈا گڑ گیا - اُس وقت ایک ملکہ قسطنطنیہ کی حکمران تھی - اس نے خراج دینا منظور کر کے صلح کر لی - پھر ایک زمانہ گذر گیا - مگر مسلمان اس پیشین گوئی کو نہیں بھولے - عُثمانی تاجدار کوششیں کرتے رہے - لیکن جس نامور کے زورِ شمشیر سے آخر علَمِ قسطنطین سرنگوں ہوا - وُہ فخرِ خاندانِ عُثمانی سلطان محمد ثانی تھا - جس نے ۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ کو فتح کیا اور فاتح کے لقب سے ممتاز ہوا - اور اسی نام سے آج تک دشمن و دوست اُسے یاد کرتے ہیں - اسی کے حُسنِ تدبیر نے خشکی پر کشتیاں چلادیں - اور وُہ مہم سر کی جس کی فکر میں مُسلمان آٹھ سو سال سے تھے - مگر کامیاب

نہ ہُوئے تھے۔

حال میں ایک فرانسیسی مولّف موسیو بارتھ نامی نے "قسطنطنیہ" پر ایک کتاب لکھی ہے جس کے بعض حصے قابلِ اقتباس ہیں۔ اُس نے معرکۂ قسطنطنیہ کا جو بیان لکھا ہے۔ اُس کا ترجمہ یہاں درج کرنا خالی از لطف نہیں:۔

۲۳۔ مارچ ۱۴۵۳ء کو محمد ثانی اپنے دارالخلافہ اوریانوپل سے چلا اور ۶۔ اپریل کو اس نے قسطنطنیہ کا برّی اور بحری محاصرہ کر لیا۔ ترکی جہاز بشکطاش کے مقابل آکھڑے ہُوئے۔ لیکن آہنی زنجیریں جو بندرگاہ کی حفاظت کے لئے لگی ہُوئی تھیں جہازوں کے بندر میں داخل ہونے کی مانع تھیں۔ سُلطان محمد نے چھوٹی کشتیوں کو پہیّے لگوا دیئے اور خشکی پر اُس وادی کے راستے۔ جو غلطہ کے پیچھے واقع ہے اُنہیں چلا کر وُہ بندرگاہ کی دُوسری طرف لے آیا۔ جہاں اب جامع ایوّب ہے۔ اُس حصّے کے سامنے جب اچانک یہ کشتیاں پانی میں ڈالی گئیں اور آناً فاناً سارے بندرگاہ پر چھا گئیں تو شہر بھر میں بیحد گھبراہٹ پھیل گئی۔ حملہ آوروں نے پیغام دیا کہ اگر اطاعت قبول کرلو تو تمہارے جان و مال کو امان دی جائیگی۔ لیکن قسطنطین پازدھم نے دلیرانہ انکار کیا۔ پانچ ہزار یونانی وفادار اور تین ہزار اہل جنوا جان نثار ساتھ دینے کو تیار ہوئے اور سات ہفتے تک غنیم کا جو تعداد میں اُن سے بڑھ کر تھے۔ بہادرانہ مقابلہ کرتے رہے۔ فنار میں ڈیوک نوٹرس ناظر امور عسکر تھا۔ تیر انداز اور سنگ انداز بندر کے مختلف حصّوں میں تقسیم شدہ تھے۔ قیصر خود فصیل پر جرنیل گسطینانی کے ساتھ موجود تھا جہاں اب توپخانہ کا دروازہ ہے۔ وُہ حصّہ سب میں کمزور اور غیر محفوظ تھا۔ اور محمد ثانی نے اپنی ساری سعی اس دروازہ کے خلاف صرف کرنی شروع کی۔ اُس نے اس دفعہ یہ

یو قامت توپوں سے کام لیا جو اربان نامی باشندۂ ہنگری نے تیار کی تھیں اور جن سے
ے بڑے چٹان تین ساڑھے تین قنطار[۱۵] وزن کے پھینکے جا سکتے تھے۔ سُلطان خود
وپچیوں کے قریب کھڑا تھا جہاں سے وُہ غنیم کی سب حرکات دیکھ سکتا تھا۔ ۲۹ مئی
و اُس نے حملے کا حکم دیا۔ اور عثمانی فتحیاب ہُوئے۔ مگر یُونانی شکست کھانے پر بھی
س طرح جان لڑا رہے تھے کہ فاتحین شہر میں داخل نہ ہو سکے اور ینی چری فوج دو دفعہ
پس پا ہُوئی۔ اس وقتِ نازک میں ایک مُسلمان درویش کا خواب مُسلمانوں کی حوصلہ افزائی
کا باعث ہوا۔ جس نے دعویٰ کیا کہ رسُولِ مقبُول کے صحابی حضرت ایوب انصاری کا
مزار اُسے خواب میں دکھایا گیا ہے۔ اس خبر کے سُنتے ہی مُسلمانوں کے جسم میں ایک
تازہ جان پڑ گئی اور وُہ از سرِ نو حملہ آور ہُوئے۔ ان میں سے کوئی پچاس آدمی ایک
تہ زمینی راستے سے جس کا دروازہ یونانی بند کرنا بھُول گئے تھے شہر کے اندر گھُس آئے۔
محصُورین جنہیں ان کے داخل ہونے کا کچھ علم نہیں تھا۔ اپنی جگہ پر روکنے کے لئے
ڈٹے ہُوئے تھے کہ موت نے اُنہیں پیچھے سے آ لیا۔ اس حالت کے دیکھتے ہی
نہیں ایک تشنج سا ہو گیا۔ اُن کی گھبراہٹ دیکھ کر غنیم دیواروں پر چڑھ آئے۔
سطینیانی ایک گولے سے زخمی ہو گیا اور اپنے جہاز میں لا کر لٹا دیا گیا۔ اور لیٹتے
ہی اُس کی جان نکل گئی۔ قیصر جوانمردی سے اپنے بزرگوں کے ورثہ کی حفاظت کرتا
ہوا اسی معرکے میں کام آیا۔ غنیم کی فوج جسے اب کوئی روکنے والا نہیں رہا تھا مصروفِ
غارت ہُوئی۔ اور تین دن تک کُشت و خوُن جاری رہا۔ سلطان محمد بسرکردگی عُثمانیاں

---

۱۵ فرانسیسی میں لفظ قنطال اس کے لئے استعمال کیا گیا ہے اور ایک قنطال کا وزن ایک سو کیلو لکھا ہے۔ اور
کیلو انگریزی پونڈ کے قریب ہوتا ہے۔ پس قنطال کوئی سوا من ہندوستانی ہوا ۱۲

جب داخلِ شہر ہوا تو ایک شہر کا جمِ غفیر سینٹ صوفیا کے گرجے میں پناہ گزین تھا۔ شہر والوں کا ہر طبقہ وہاں لڑائی کے انجام کا منتظر تھا اور پادری خدا سے دعائیں مانگ رہے تھے اور خوش عقیدت عورتیں مذہبی گیت گا گا کر دعا کر رہی تھیں کہ خدا انہیں بچالے مگر فاتحین نے دروازے توڑ ڈالے۔ اور قتلِ عام شروع ہوا تین ہزار آدمی مارے گئے ہونگے۔ سلطان گھوڑے پر سوار خود دروازہ پر آپہنچا۔ اور سوار ہی زینوں کو پھاند کر از خود رفتہ گروہ کے روبرو آ پکارا "لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ" گرجے کی یہ بے ادبی گویا اس کے توڑنے پھوڑنے کا اعلان تھا۔ بُت اور صلیبیں گلہاڑیوں سے توڑی گئیں اور قیمتی ظروف فاتحین کے پاؤں میں روندے گئے۔ ایک کھڑکی کے مقابل جسے "دریچہ سرد" کہتے ہیں۔ اب تک پتھر کے ستون میں ایک ہاتھ کا نشان گڑا ہوا نظر آتا ہے۔ کہتے ہیں کہ محمد فاتح نے گرجے پر قبضہ کرتے وقت یہ نشان اپنے ہاتھ سے لگا دیا تھا۔ اس طرح سینٹ صوفیہ کا گرجا جو نو سال سے عیسائیوں کے جمع ہونے کا مقام تھا اسلام کی ملک ہوگیا یونانیوں میں ایک قصہ مشہور ہے کہ ایک متبرک پادری اس قبضے کے وقت ایک دروازہ سے معجزانہ غائب ہوگیا۔ اور وہ دروازہ خود بخود بند ہو گیا اور آج تک بند ہے جس دن پھر صلیب ہلال کی جگہہ لے گی۔ اُس دن وہ دروازہ کھُلے گا اور وہ پادری جیتا جاگتا اُس عبادت میں مصروف نظر آئیگا جو وہ اُس وقت کر رہا تھا۔"

موسو بارتھ عیسائی ہے اور عیسائی ناظرین کے لئے کتاب لکھ رہا ہے۔ اِس لئے اُس کے بیان میں تعصب صاف نظر آرہا ہے۔ مثلاً گرجے کے اندر قتل کا جو بیان اس نے لکھا ہے۔ اس کی تردید ایک اور عیسائی مؤلف مسٹر مرے یوں کرتا ہے:۔
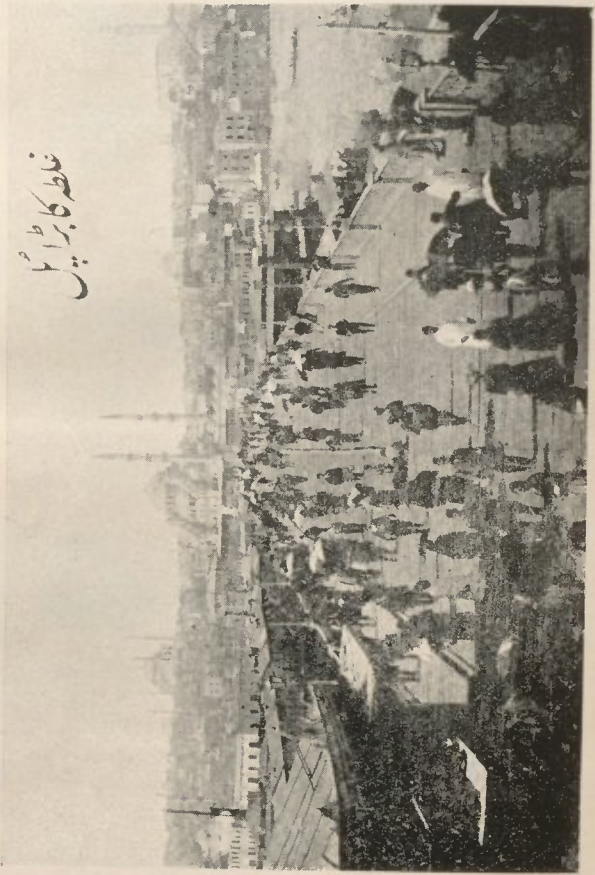
غلطہ کا بڑا پُل

ہاتھ کے اس نشان کی بابت کہا جاتا ہے کہ فاتح جب گھوڑے پر سوار مقتولین کی لاشوں کے ڈھیر کے اوپر گذر رہا تھا۔ اُس وقت اُس کا ہاتھ اتنی بلندی تک پہنچ سکتا تھا مگر اس روایت کے راوی یہ بھول جاتے ہیں کہ جو جماعت فتح کے دن گرجے کے اندر تھی وُہ قید کر لی گئی تھی اور قتل نہیں ہوئی تھی"۔ ہم نے قصداً موسیو بارتھ کو موقعہ دیا ہے کہ وُہ اس واقعہ کو عیسائیوں کی روایات کی رو سے بیان کر دے۔ کیونکہ اول تو مخالف شہادت کا وہ حصّہ جو باوجود مخالفت کے آہنگ کے واقعات اصلی کی تائید کرے۔ موافق شہادت سے زیادہ باثر ہوتا ہے اور دُوسرے ان بیانات سے جو نقل کئے گئے ہیں۔ اُن احساسات پر روشنی پڑتی ہے جو عیسائی عموماً قسطنطنیہ اور ایا صُوفیہ کے متعلق رکھتے ہیں اور جن سے اُس عناد کا عقدہ حل ہوتا ہے جو عالم عیسوی کو بالعموم سلطنت عثمانی کے ساتھ ہے۔ وُہ ان بے سروپا کہانیوں سے برافروختہ ہوتے ہیں۔ اور انہیں یہ یاد نہیں رہتا کہ سلطان فاتح ہی وُہ سلطان ہے جس نے یُونانی گرجے کے پادریوں کو خاص حقوق عطا کئے۔ اُن کو گرجے کے اندرونی انتظام میں پُوری آزادی دی۔ دُوسرے عیسائیوں کی مداخلت سے اُن کے گرجے کو بچایا اور رعایا کی مذہبی آزادی اور ایک نہایت معقول حد تک مساوات حقوق کی ایسے وقت میں بُنیاد ڈالی۔ جب یورپ کے دُوسرے حصے مساوات کا خیال بھی نہ رکھتے تھے۔

سنہ ۱۴۵۳ء سے لیکر آج تک استانبول سلاطین عثمانیہ کا دارالخلافہ چلا آتا ہے۔

سُلطان محمد فاتح نے اپنی فتح کی کئی یادگاریں چھوڑیں۔ جن میں رُوم ایلی حصار اور جامع فاتح خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ اس کے بعد یہ رسم ہو گئی۔ کہ قریب قریب ہر سُلطان اپنے عہد کی یادگار میں ایک مسجد بنا کرے اور اسی لئے استانبول مساجد کے اعتبار سے

شہرت خاص رکھتا ہے - شاید کسی اَور اسلامی مرکز میں بڑی مسجدیں اس کثرت سے نہیں مل سکتیں۔ مسجدوں کے بلند مینار دُور سے نظر آنے لگتے ہیں - اور آسمان سے باتیں کرتے معلوم ہوتے ہیں - اس کی صُورت کا یہی وُہ حصّہ ہے جس پر فرنگستان کے بامذاق نظارہ پسند وجد کرتے ہیں اور اس کی تعریف کرتے نہیں تھکتے - گو اُنکا جوشِ تعریف شہر میں قدم رکھتے ہی گلی کوچوں کی حالت کو دیکھ کر فرو ہو جاتا ہے اور پھر مذمت بھی ایسی ہی کرتے ہیں - تاہم اس شہر کی دو خوبیوں کا وُہ ہمیشہ اعتراف کرتے ہیں - ایک یہ کہ دُور سے استانبول بجائے معمُولی انسانی آبادی کے عالم بالا کی کسی بستی کی تصویر نظر آتا ہے - جس کا نقشہ صاف نیلگوں آسمان کے وسیع کینوس[1] اس پر نقاشِ ازل نے اپنے ہاتھ سے کھینچا ہے - اور دُوسرے یہ کہ تاریخی نشانیوں کی بوقلمونی کے لحاظ سے یہ دارالخلافہ اپنی مثال نہیں رکھتا -

اصل پرانا قسطنطنیہ تو وُہی ہے جسے اب استانبول کہتے ہیں - مگر اب رفتہ رفتہ پھیلتے پھیلتے یہ نام کئی حصّوں پر جو پہلے غیر آباد تھے یا علیحدہ سمجھے جاتے تھے حاوی ہو گیا ہے - اس کے اب تین بڑے حصّے ہیں - استانبول - پیرا غلطہ اور اسکدار - ان میں استانبول اور پیرا غلطہ یورپی ساحل پر واقع ہیں اور اسکدار (سقوطری) ایشیائی ساحل پر - یورپی ساحل اور ایشیائی ساحل کے درمیان آبنائے باسفورس ہے اور استانبول اور پیرا غلطہ کے درمیان "شاخِ زرّین" کا پانی حائل ہے - شاخِ زرّین پر صبح سے شام تک آیند و روند کی کثرت رہتی ہے - اور باوجود اپنی کُہنگی کے یہ پُل نہایت دلچسپ ہے، دُنیا کی ہر قوم کا نمونہ اس پُل پر نظر آسکتا ہے اور مشرق و مغرب کے سب لباسوں کی آمیزش

[1] انگریزی میں اس کھُردرے سے کپڑے کو کہتے ہیں - جس پر نقاش تصویریں کھینچتے ہیں ۱۲

غلطہ مینا

اس کے منظر کو نہایت دلپذیر بناتی ہے - اسکدار کی آبادی بیشتر مسلمانوں کی ہے - استانبول میں بھی زیادہ تر مسلمان ہی آباد ہیں - گو تاجر اور دوکانداروں میں عیسائی اور یہودی بھی بکثرت ہیں - بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ تجارت کا ایک کثیر حصہ اُنہی کے ہاتھ میں ہے - اِسی حصہ میں ایاصوفیہ - اسی میں باب عالی - باب مشیخت - عدالتیں - اور دیگر دفاتر سرکاری ہیں - اسی میں زیادہ تر مساجد - اسی حصہ میں قسطنطنیہ کا مشہورِ عالم مسقف بازار ہے اور یہیں خانِ والدہ میں ایرانی تجار کی بستی ہے - مُسافر کی دلچسپی کے جس قدر سامان اس حصے میں جو پُرانی چار دیواری کے اندر ہے موجود ہیں - اَور کسی حصے میں نہیں - پیرا غلطہ ایک دوسرے سے ملے جُلے ہُوئے ہیں - لیکن اصل میں دو حصے ہیں - پیرا نقافی عیسائیوں اور یورپ کے عیسائیوں کی بود و باش کا مرکز ہے یہیں یورپی ہوٹلوں کے نمونے کے ہوٹل ہیں - اور یہیں دُوَلِ خارجیہ کے سفیروں کے مکان ہیں غلطہ میں غلطہ سرائے نام شاہی محل ہے جو سلطان عبد العزیز کے زمانے سے مکتبِ سلطانی کو دیدیا گیا ہے - یہیں غلطہ مینار ہے - جس پر چڑھنے سے استانبول بہ تمام و کمال نظر آسکتا ہے - اور اسی کے پرے اگر کچھ دُور نکل جائیں تو نشان طاش - بشکطاش وغیرہ شہر کے کھلے اور نو تعمیر شدہ حصے آجاتے ہیں - جہاں اُمرا کے مکانات - شاہی محلات اور موجودہ قصر شاہی یعنی یلدیز ہے جسے استانبول کے روزمرّہ میں "سرائے ہمایون" کہتے ہیں +

سرائے ہمایوں

استانبول مقامِ خلافت ہی۔ تو سرائے ہمایون مرکزِ خلافت۔ سب بڑے بڑے مُلکی معاملات اسی قصرِ شاہی کی چار دیواری کے اندر فیصلہ ہوتے ہیں اور اسی طرح کاروبار خلافت کے متعلق احکام یہیں سے صادر ہوتے رہتے ہیں۔ سلطان المعظم خادم حرمین شریفین ہیں۔ اور وہاں کے کارکن مختلف اُمور میں حکم احکام حاصل کرنے کے لئیے یہیں سے رجُوع کرتے ہیں۔ جب سے دولتِ عثمانیہ کے موجُودہ فرمانروا سُلطان عبدالحمید خاں غازی تختِ نشینِ سلطنت ہُوئے ہیں۔ سکونتِ شاہانہ کا فخر اس محل کو بخشا گیا ہے۔ اور اس کے بڑے احاطے کے اندر کی تعمیرات بیشتر سلطان المعظم کے عہد کی تعمیرات ہیں۔ اُن کے جد مرحوم سلطان محمُود نے ۱۸۳۲ء میں اس محل کی بنیاد ڈالی تھی۔ مگر اُس وقت بشکطاش کی چوٹی پر یہ صرف چھوٹا سا کیوشک تھا۔ اور اس کے گرد ایک نہایت وسیع باغ تھا۔ جہاں وُہ کبھی تفریحًا جاتے تھے۔ مرحوم سُلطان محمُود ہی نے اس کا نام یلدیز کوشک رکھا۔ یلدیز تُرکی میں ستارے کو کہتے ہیں اور اس چھوٹے سے محل کو اس کی خوبصورتی اور بلندی کی وجہ سے یہ نام دیا گیا۔ ۱۸۴۲ء میں سلطان عبدالمجید مرحوم و مغفور نے اسے اور بڑھایا اور آراستہ کیا۔ اُن کے بعد سُلطان عبدالعزیز مرحوم نے اس کے باغ کو اور وسعت دی یہانتک کہ یلدیز کا باغ قصرِ چراغاں تک جا پہنچا۔ جو عین لب باسفور واقع ہے۔ اُنہوں نے چند اور کوشک بھی اس میں تعمیر کیئے اور سب سے بڑی تعمیر محل کے
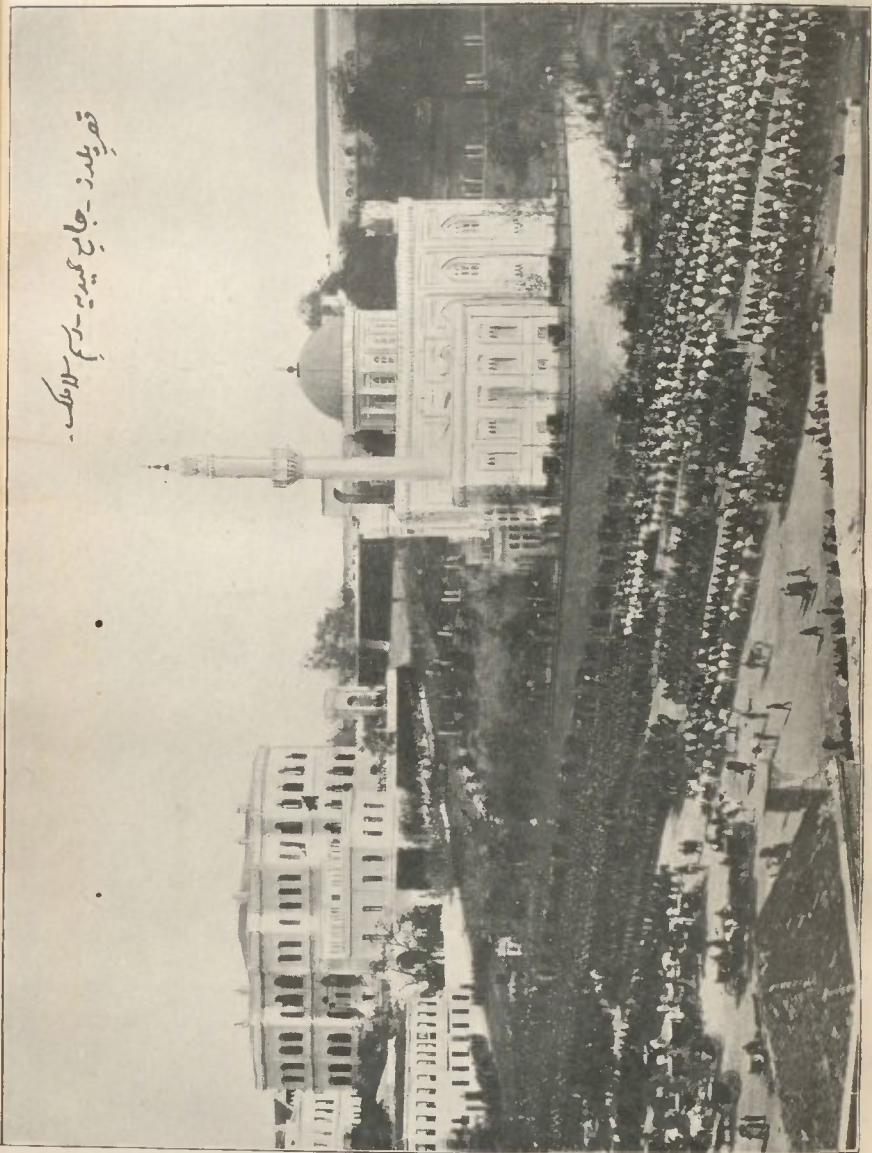
قصرِ یلدز - جامع حمیدیہ - رسمِ سلاملک۔

اُس طرف کی جو "مابینِ ہمایوں" کے نام سے موسُوم ہے اور جہاں شاہی چیمبرلین جسے تُرکی میں جاسش مابینجی کہتے ہیں اجلاس کرتا ہے ۔

جب سے سُلطانِ وقت نے یہاں مستقل سکونت اختیار کی ہو۔ اس کی اندرونی زینت اور بیرونی مضبوطی کی طرف خاص توجہ کی گئی ہے ۔ یہاں تک کہ اب وُہ استانبول میں سب سے محفوظ اور سب سے پُرفضا جگہہ ہے۔ یورپ میں سُلطان المعظّم کے بیشمار مخالف ہیں جو اُن کی ہر بات میں نقص نکالتے ہیں اور اُن کے اچّھے کاموں کو بھی کسی نہ کسی بُرائی کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ اُنھوں نے اس تبدیلیٔ مکان پر عجب عجب چہ میگوئیاں کی ہیں۔ چُونکہ پہلے بادشاہ اور محلات میں رہتے تھے ۔ اس لیے ان کا قصر یلدیز کو پسند کرنا اعتراضات کے لیے آسان بہانہ بن گیا۔ بجائے اِس کے کہ تسلیم کریں کہ بلحاظ ہوا کی پاکیزگی اور صفائی کے ۔ اور بلحاظ منظر کی خوبصُورتی کے اس قصر کو قدرتی طور پر ترجیح دی گئی ۔ وُہ یہ لکھتے ہیں کہ سُلطان المعظّم ڈر کے مارے اس میں رہتے ہیں ۔ کیونکہ دُوسرے محلّات قربِ شہر یا قربِ دریا کی وجہ سے اُن کے لئے ہمیشہ باعثِ خطر رہتے ۔ اور اُن کے خلاف سازشیں کرنے والے آسانی سے دُوسرے محلّوں پر حملہ کر سکتے ہیں ۔ اس میں شک نہیں کہ قسطنطنیہ میں بادشاہ کی زندگی کی حفاظت پر خاص توجّہ ہے ۔ مگر یہ ضرورت وہاں کی رعایا کے بعض شورہ پُشت لوگوں کی کارستانیوں اور یورپ کے انارکسٹ لوگوں کی سازشوں کے باعث پیدا ہُوئی ہے ۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکل سکتا ۔ کہ قصرِ یلدیز کی اقامت کا باعث خوف ہو۔ اصل بات یہ ہو کہ شہروں کی گنجان آبادی سے الگ رہنے کا خیال

جدید طبّی تحقیقات نے ہر ملک میں پیدا کر دیا ہے۔ اور جس کو توفیق ہوتی ہے شہر سے باہر رہنے کی فکر کر لیتا ہے۔ جب قسطنطنیہ میں معمولی اُمرا اور رؤسا تک اپنے شہر کے مکانات چھوڑ کر سال کے اکثر مہینے باہر دیہات کے کُھلے بنگلہ نما مکانات میں کاٹتے ہیں تو کون تعجب کر سکتا ہے کہ یلدیز کی مرتفع کرسی اور اس کا صحت بخش موقع سُلطان المعظّم نے اپنے لئے چُن لیا۔ خصوصًا اُس حالت میں جب اُن کے چچا کے وقت میں ہی اسے محلِ تفریح کی جگہہ محلِ سکونت بنانے کا خیال پیدا ہو گیا تھا۔ جیسا کہ اُس زمانے میں "مابین" کی تعمیر سے ظاہر ہوتا ہے۔

قصرِ یلدیز کی عمارات کی طرزِ تعمیر جدید ہے اور اُن میں عثمانی طرزِ تعمیر کی خصوصیات کم نظر آتی ہیں۔ بہ خلاف بعض دُوسرے محلّاتِ شاہی کے جن کا نقشہ سمندر کے راستے سے آنے والے مسافر کی نظر کو دُور ہی سے لبھاتا ہے۔ اندرونی آرائش میں بھی گراں بہا اور خوبصورت ترکی قالینوں اور ہیرکیہ کے نفیس ریشمی پردوں کے سوا شیشہ و آلات و سامانِ زینت زیادہ تر یورپی ہے۔ کہتے ہیں کہ سلطان المعظّم کا مذاق زمانۂ حال کی طرزِ تعمیر کا مؤید ہے اور حفظانِ صحت کے اصولِ جدیدہ کو مدِّنظر رکھنا نہایت ضروری سمجھتے ہیں۔ اور اُنہیں خود فنِ تعمیر میں معقول دخل ہے۔ چنانچہ ایک مشہور یوروپین کا بیان ہے کہ جب وُہ محل کے اندر کام کرتا تھا تو کئی دفعہ اتفاق ہُوا۔ کہ سُلطان المعظّم اپنے ہاتھ سے محل کے کسی حصّہ کا نقشہ پنسل سے کھینچ کر دیتے تھے۔ جس سے فن کی واقفیت اس درجہ ظاہر ہوتی تھی۔ کہ ماہرانِ فن حیران رہ جاتے تھے۔

یلدیز کی عمارات اور باغات کے احاطہ کرنے کے لئے ایک بہت لمبی چوڑی دیوار

ہے جس کے گرد گارد کے سپاہی ہر وقت پہرا دیتے ہیں - شمالی حصّے میں شاہی سکونت کے مکانات ہیں - جن میں خود بادشاہ اور ان کے حرم اور شاہزادے رہتے ہیں - اس حصّے کے گرد ایک اَور دیوار ہے - جو ایک شش پہلو احاطہ بناتی ہے - حرم اس شش پہلو احاطہ کے مشرقی طرف ہے - اور کوشک شاہی سے اس میں آمد و رفت ایک گیلری کے ذریعے سے ہے - شاہزادوں کے مکانات اور حرم شاہی کے درمیان ایک اُونچی دیوار حدِ فاصل ہے - قریب ہی ایک اَور چھوٹا سا کوشک ہے - جسے سلطان المعظّم نے ۱۸۹۴ء کے سخت زلزلہ کے بعد تعمیر کرایا - اس میں صرف گیارہ کمرے ہیں - مگر اس کی صنعت میں جدید فنِ تعمیر کی ساری کوشش صرف کردی گئی ہے - اِسے آتشزدگی اور زلزلہ دونوں کے صدمے سے محفوظ بنایا گیا ہے - اِس چھوٹے سے محل اور بڑے محل کے درمیان مسقّف راستہ ہے - اس کے گردا گرد ایک گیلری ہے - جس پر رات کو البانیہ کے سلحشوروں کا پہرا ہوتا ہے -

کوشک شاہی کے ایک طرف چھوٹا سا تھیٹر بنا ہوا ہے جہاں کبھی کبھی یورپ کے مشہور تماشا گر تماشا کرتے ہیں - خصوصاً جب کوئی معزّز مہمان یورپ سے آتے ہیں تو یہ تھیٹر اُن کی مدارات کا ضروری حصّہ ہے - کوشک کے دُوسری طرف آبشار والی بارہ دری ہے - جہاں سے باسفورس کا منظر نہایت عُمدگی سے دکھائی دیتا ہے اور جہاں بادشاہ کبھی کبھی وقت فرصت ٹہلنے جاتے ہیں - کوشک کے سامنے مصنوعی جھیل بنائی گئی ہے - جس میں کئی مصنوعی آبشار گرتے ہیں - اس میں سلطان المعظّم گاہے گاہے کشتی چلاتے ہیں -

ایک اَور محل ہے جسے قصرِ مراسم کہتے ہیں۔ اس میں تصاویر رکھی ہیں۔ چُونکہ یورپ کے سب شاہی محلات میں یہ دستور ہے۔ کہ مشہور نقاشوں کی تصاویر جمع کی جاتی ہیں جس میں سے ہر ایک ہزار ہا روپئے دام پاتی ہے اور جو بہت نادر ہوں بعض لاکھوں تک پہنچتی ہیں۔ یہ محل شش پہلو تعمیر کے باہر واقع ہے۔ اور سہ منزلہ بنایا گیا ہے۔ امپراطور ولیم ثانی جب سلطان المعظم کی ملاقات کو آئے تھے تو یہیں ٹھہرائے گئے تھے اور تصاویر کی گیلری ایسے ہی موقعوں پر کھولی جاتی ہے۔

یورپ کے سیاح اپنی کتابوں میں قصرِ یلدیز کا ذکر کرتے ہوئے اکثر حیرت ظاہر کرتے ہیں کہ یلدیز محض بادشاہ اور اس کے ذاتی خُدّام کے رہنے کی جگہہ نہیں۔ بلکہ ایک شہر کا شہر ہے۔ جس کے باشندوں کی سب ضروریات کے لئے سامان اُس کے اندر موجُود ہے۔ چونکہ اُن کے ہاں یہ رواج کم ہے اس لئے انہیں تعجب ہوتا ہے۔ لیکن جو لوگ ایشیا کے مشہور بادشاہوں کے حالات سے واقف ہیں۔ اُن کی نظر میں یہ ایک ایسی چیز ہے جو لازمۂ شاہنشاہی ہے۔

محل کے اندر عمارات کا کام تھوڑا بہت ہر وقت جاری رہتا ہے۔ اِس لئے ایک حصّہ اس کا تعمیر خانہ کے نام سے موسوم ہے۔ تعمیر تُرکی میں مرمّت کو کہتے ہیں اور اس تعمیر خانہ میں لوہاروں۔ ترکھانوں اور معماروں کے کارخانے شامل ہیں۔

ایک کارخانہ ظروف چینی کا بھی یلدیز کے احاطے کے اندر ہے۔ جس میں چینی کے نہایت نفیس برتن بنتے ہیں۔ اس کا منشا نہ صرف محل کی ضروریات کے لئے عمدہ برتن بہ کفایت مہیا کرنا ہے۔ بلکہ صنعت کا ایک تجربہ ہے۔ جس کی بنا پر اَور کارخانے مُلک میں بڑھائے جا سکتے ہیں۔ اِس کے دیکھنے کی اجازت خاص طور پر حاصل کرنی

پڑتی ہے۔

یلدیز میں ایک سلاح خانہ بھی ہے۔ جس میں ہر قسم کے ہتھیار۔ پُرانے اور نئے۔ مشرقی اور مغربی رکھے ہیں۔ ونچسٹر۔ مارٹینی۔ موزر۔ بندوقیں اور کرپ اور میکسم توپیں سب یہاں موجود ہیں۔ یہ میگزین کا میگزین اور عجائب خانے کا عجائب خانہ ہے۔

اِس کے سوا ایک اور عجائب خانہ بھی ہے۔ جس میں ایک ذخیرہ قلمی کتابوں کا ہے۔ کچھ پُرانے ظروفِ چینی۔ کچھ جواہرات اور کچھ نمونے مختلف صنائع کے ہیں۔ ایک حصّے میں نیچرل ہسٹری کا عجائب گھر ہے۔ جہاں طرح طرح کے جانور بُھس سے بھرے ہُوئے شیشوں کی الماریوں میں بند ہیں۔ یہیں ایک عُمدہ رصدگاہ ہے۔ جس میں علمِ ہیئت کا سامان بخوبی مہیا کیا گیا ہے۔

محل کے باہر جو جامع حمیدیہ نمازِ جُمعہ اور سلاملق کے لئے بنی ہے۔ اس کے سوا دو اَور مسجدیں محل کے اندر ہیں۔ جن میں سے ایک خود سلطان المعظم اور اور ارکینِ خاص کی نماز کے لئے محل شاہی کے قریب ہے۔ اور دُوسری گارد کے سپاہیوں کی نماز کے لئے ہے۔

چار اصطبلِ شاہی ہیں۔ جن میں سے ایک خاصہ سواری کے گھوڑوں کے لئے مخصوص ہے اور تین اَور ہیں جن میں سے ہر ایک میں کوئی ایک سو گھوڑے رہتے ہیں۔ اُن میں سے ایک نہایت ہی جدید سامان سے آراستہ ہے۔ اصطبل کے قریب سواری کا مدرسہ ہے۔ وہاں شاہزادوں کو سواری کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اس مدرسہ کے قریب ایک سایہ دار گیلری بنی ہے۔ جہاں سے کبھی کبھی بادشاہ

خود بچوں کی تعلیم کا معائنہ کرتے ہیں۔ خود جوانی میں سواری کا بہت شوق رکھتے تھے اور اب بھی وقت ضرورت نہایت عمدہ سوار ہیں۔ انہیں گھوڑوں کے سوا اور حیوانوں اور جانوروں کے پالنے کا بھی شوق ہے۔ اس لئے ایک خاصہ چڑیا گھر قصرِ یلدیز میں ہے۔ باغ پر بھی اُن کی توجہ خاص ہے۔ اور اس لئے باغ میں بہت سے نادر درخت ہیں اور درختوں کو مختلف پیوند لگانے کے تجربے اکثر ہوتے رہتے ہیں

گارد کے سپاہیوں کے سوا جو سات ہزار کے قریب ہیں اور جن میں مختلف افواجِ سلطانی کے چیدہ دستے شامل ہیں۔ تخمیناً کوئی پانچ ہزار آدمی محل کے اندر رہتے ہیں۔ مستوراتِ حرم اور اُن کی لونڈیاں اور خواجہ سرائے۔ شاہزادے اور اُن کا اپنا اپنا سٹاف۔ چیمبرلین اور اُن کے ماتحت ملازمین۔ ایڈیکانگ۔ دربان۔ باغبان۔ باورچی۔ سائیس اور دیگر خُدّام یہ سب محل کی آبادی کا باعث ہیں اور اُن میں سے اکثر کے لئے مطبخِ شاہی سے کھانا پکا پکایا آتا ہے۔

محل کے سب حصّوں کا مختصر سا بیان آ گیا۔ لیکن "مابین" کا ذکر باقی ہے۔ یہی وُہ حصّہ ہے جس سے رعایا کے معزز افراد اور سرکاری اہلکاروں اور خاص خاص مہمانوں کو اکثر کام پڑتا ہے۔ مجھے اپنے زمانۂ قیام میں کئی بار "مابینِ ہمایوں" جانے کا اتفاق ہُوا اور وہاں میں نے حاجی علی پاشا باشکش مابینجی اور تحسین پاشا باش کاتب اور عزت پاشا کاتبِ ثانی اور غالب[51] بے ترجمان اوّل رئیس تشریفات کے کمرے دیکھے اور ان سب سے ملاقات کی۔ یہ لوگ نہ صرف محل کے اہلکاروں میں اعلیٰ ترین رُتبے رکھتے ہیں۔ بلکہ انہیں اُمورِ سلطنت میں بھی دخل ہے۔ کیونکہ سب

---

۵۱ اب انہیں وزارت کا رتبہ اور پاشا کا خطاب مل گیا ہے۔ اُس وقت غالب بے تھے۔

ضروری امُور خود سُلطان المعظم کے ہاتھ میں ہیں اور یہ لوگ گویا اُن کی زبان اور قلم ہیں۔ جن کے ذریعے وُہ وزرائے دولت اور دُوسرے اہلکاروں کے نام عموماً احکام جاری کرتے ہیں۔

ان میں سے ہر اہلکار کے پاس متعدّد کمرے ہیں۔ جن میں سب سے بڑے کمرے، حاجی علی پاشا کے ہیں۔ ایک کمرہ نشست عام کا۔ ایک کمرہ مشورۂ خاص کا۔ ایک کمرہ کھانا کھانے کے لئے۔ ایک کمرہ نماز کے لئے اور ایک کمرہ ملازمین کے لئے۔ ان کمروں کی آرائش نہایت سادہ ہے۔ کوئی تصویریں وغیرہ ان میں نہیں۔ دیواروں کی زینت کے لئے قدِ آدم آئینے اور فرش کی زینت کے لئے بڑے بڑے قالین۔ میز کرسی اور چند زاید کرُسیاں مُلاقاتیوں کے لئے۔ ان سب کمروں میں برقی روشنی ہے۔ اور یہ اس لئے قابلِ ذکر ہے کہ محل کے باہر ایک آدھ ہوٹل کے سوا برقی روشنی استانبول میں کہیں نہیں۔

محل کے اندر جانا سوائے اُن لوگوں کے جنہیں دربان پہچانتے ہوں یا جنہیں عہدہ داروں میں سے کسی نے خود بلوایا ہو۔ آسان نہیں۔ جب کوئی اجنبی جائے تو بہت کچھ پرسش ہوتی ہے۔ دربان پہلے اُس کا کارڈ مانگتے ہیں۔ پھر اُس سے پوُچھتے ہیں کہ کس سے ملنا ہے۔ پھر اُس عہدہ دار سے جاکر دریافت کرتے ہیں اور وُہ اجازت دیتا ہے تو اندر جانا ملتا ہے۔

مابین کا دروازہ جامع حمیدیہ کے مقابل ہے اور اسی دروازہ کے ساتھ وُہ چبوترہ ہے۔ جہاں سے سلاملق کی شاندار رسم دیکھی جاتی ہے اور اسی کے اوپر وہ نشستگاہ ہے جہاں سفراء، دوَلِ خارجیہ یا اور معزز اجنبی سلاملق کے دن بیٹھائے

جاتے ہیں۔ وزرائے دولت جب سلامِ شاہانہ کے لئے آتے ہیں تو وہ بھی اِسی دروازہ سے داخل ہوتے ہیں اور پہلے باشں باہنجی کے ہاں جاتے ہیں۔ وُہ جاکر ان کی طرف سے عرض کرتا ہے اور اسی کے توسّط سے اُنہیں جواب ملتا ہے۔ جب کوئی ضروری موقعہ ہوتا ہے تو خود انہیں بار مل جاتا ہے۔ ورنہ باشں باہنجی کے ذریعے سے حکم صادر ہوجاتا ہے کہ کسی امر میں جس میں وُہ استمزاج کرنے آئے ہوں کیا کارروائی مناسب ہے۔ اِسی سلسلے سے نظم ونسقِ سلطنت کی باگیں کھینچتے کھینچتے کُلیتہً سلطان المعظّم کے ہاتھ میں آگئی ہیں اور وُزرا محض اُن کے احکام کی تعمیل کرنے والے ہیں۔ مُلک کی فلاح کے لئے اس طریقِ حکومت کے مُفید ہونے کی نسبت بہت اختلافِ آرا رہے۔ لیکن دشمن و دوست سب مُقر ہیں۔ کہ سلطان المعظّم حکمتِ علمی میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ اور یہی سبب ہے کہ قصر یلدیز نہ صرف اصطلاحی طور پر بلکہ فی الحقیقت اس وقت دولتِ عثمانیہ کا مرکز بن گیا ہے۔ اور "بابِ عالی" جو پہلے اُمورِ سیاسی سے مخصوص اور نظامِ مملکت کا زبردست مرکز تھا۔ میدان سیاسیات میں دوم درجے کی قوت رہ گیا ہے۔

بابِ عالی

صدرِ اعظم۔ وزیرِ صیغۂ خارجیہ اور وزیرِ صیغۂ داخلیہ کے دفاتر جس عمارت میں ہیں اُسے "بابِ عالی" کہتے ہیں۔ یہ نام اس عمارت کو یا تو تعظیماً دیا گیا کیونکہ وزرائے سلطنت میں یہ تینوں عہدے خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ اور یا اس لئے کہ تینوں وزیروں کا ایک مقامِ اجلاس ہونے کے سبب ضروری ہوا کہ ایک جامع نام رکھا جائے۔ ورنہ یہ عمارت نہ تو بہت بلند ہے۔ اور نہ اس کا دروازہ ایسا شاندار ہے کہ اس نام کا مستحق ہو۔ تاریخی اعتبار سے زمین کا یہ ٹکڑا جس پر یہ دفاتر بنائے گئے ہیں عجب انقلابات دیکھ چکا ہے۔ ایا صوفیہ کے بالکل قریب واقع ہے۔ اور فتحِ قسطنطنیہ کے معرکے کا سین اسی قرب میں ہونا چاہیئے۔ پرانے محلّاتِ قیصری اسی کے پڑوس میں تھے اور اُن کی جگہہ بعد کو پہلا محل سلطانی بھی اسی کے قریب بنا۔ اب اُس محل کے ایک حصّے میں پرانے تخت اور تاج اور جواہرات اور ممالکِ غیر کے بادشاہوں کے تحفے وغیرہ رکھے ہیں۔ اُس حصّے کو "خزینۂ ہمایوں" کہتے ہیں اور دوسرے حصّے میں وُہ بے بہا امانت ہی جس پر استانبول جس قدر ناز کرے بجا ہی۔ یعنی عَلَمِ نبوی و دیگر تبرکات۔ استانبول کا جدید "مُوزہ خانہ" یا عجائب گھر بھی بابِ عالی کے قریب واقع ہے۔ اور عدالت کی کچہریاں بھی کچھ دُور نہیں۔ غرض ہر اعتبار سے یہ جگہہ دلچسپ ہی۔ دولتِ عثمانیہ گو یورپ کی اور سلطنتوں کی طرح بااختیار مجالسِ شوریٰ نہیں رکھتی جن میں رعایا کے انتخاب کئے ہوئے قائم مقام اُکر معاملات ملکی کو سلجھائیں۔ تاہم مجلسِ شوریٰ کا ایک ڈھانچ اس میں موجود ہی۔

یعنی ایک وُزرا کی مجلس جسے ترکی میں "مجلسِ وکلا" کہتے ہیں اور دُوسری "مجلسِ شورٰی دَولت"
جس میں ایک کثیر تعداد اراکین کی ہے۔ جن کا کام وضعِ قوانین میں مدد دینا ہے۔ اس
مجلس کی "رُکنیت" آج کل زیادہ تر اعزازی امتیاز رہ گیا ہے۔ ورنہ اسے عملاً امورِ سلطنت
میں چنداں دخل نہیں۔ اِن دونوں مجلسوں کے اجلاس بھی بابِ عالی میں ہوتے
ہیں۔ مجلسِ وکلا کا تو ہفتے میں ایک بار ضرور جلسہ ہوتا ہے۔ اور مجلسِ شورٰی کے جلسے
بھی وقتاً فوقتاً ہوتے رہتے ہیں۔ وزیرِ اعظم مجلسِ وکلا کا صدر نشین ہوتا ہے۔ اور دیگر
اراکین حسبِ ذیل ہیں:۔ شیخ الاسلام۔ وزیرِ جنگ۔ وزیرِ بحریہ۔ وزیرِ داخلیہ۔ وزیرِ
خارجیہ۔ وزیرِ عدالت۔ وزیرِ مال۔ وزیرِ اوقاف۔ وزیرِ محکمہ تعلیم اور وزیرِ تعمیراتِ عامہ
یہ وزرا ترکی میں عموماً ناظر کے لقب سے ملقب ہیں اور استانبول کے رواج کے مطابق
اُن کے القاب یوں لکھے جانے چاہئیں:۔ خارجیہ ناظری۔ مالیہ ناظری۔ عدلیہ ناظری وغیرہ

دفاترِ استانبول میں تعطیلوں کا عجب دستور ہے۔ اکثر جگہ ہفتے میں دو دن تعطیل
ہوتی ہے۔ ایک جمعہ کو جو اسلامی تعطیل کا روز ہے اور سلطنتِ اسلامی ہونے کے
سبب تعطیل کے لئے موزون ہے اور دُوسرے یکشنبہ کو کیونکہ دفاتر میں عیسائی بہت سے
مُلازم ہیں اور اُن کے لحاظ سے اُس دن تعطیل کر دی جاتی ہے۔ اِس رواج سے گو
عثمانیوں کی بے تعصبی ثابت ہوتی ہے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ کاروبارِ سرکاری پر اِس
دو روزہ تعطیل کا اثر اچھا نہیں پڑ سکتا۔ اور انہیں کوئی تدبیر نکالنی چاہئے۔ جس سے
ہفتے میں ایک تعطیل پر سب اہلکار کفایت کریں۔ ہمارے ہاں ہندوستان میں اگرچہ
عدالتوں وغیرہ میں عملہ ہندوستانی ہے اور ہندوستانیوں کو یکشنبہ سے کوئی خصوصیت
نہیں۔ لیکن وہ سب خوشی سے یکشنبہ کی تعطیل منظور کرتے ہیں۔ کیونکہ انہیں ہفتے

ہیں ایک دن آرام کے لئے لیتا ہے وُہ بل جاتا ہے۔ اور انگریزی حکّام کو اپنا مذہبی دن تعطیل کا مل جاتا ہے۔ جس پر دوسروں کو جو پابندِ سلسلۂ ملازمت ہیں۔ کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔

بابِ عالی میں اِن دو تعطیلوں کے سوا ایک اَور دن بھی ماتحت اہلکاروں کے لئے نیم تعطیل کا ہوتا ہے۔ چہار شنبہ کے دِن عموماً مجلسِ وُکلا ہوتی ہے۔ اُس دن چونکہ افسرانِ محکمہ اُس میں مصروف ہوجاتے ہیں۔ اِس لئے سوائے اُن کی پیشی کے اہلکاروں کے دوسروں کو نسبتاً فرصت ہوتی ہے۔ اصل بات یہ ہو کہ جب سے کاروبار سلطنت کے بوجھ کا پلڑا قصر یلدیز کی طرف جُھک گیا ہے اور بہت سے کام جو پہلے بابِ عالی سے سرانجام پاتے تھے اب وہیں سے براہِ راست کر دیئے جاتے ہیں۔ تب سے بابِ عالی کا کام ہلکا ہوگیا ہے۔ اس پر بھی چونکہ از روئے قاعدہ سب عرضداشتیں اپنے اپنے مناسب محکموں کے ذریعے سے پیش ہونی چاہئیں اور اُن کے متعلق ضابطہ کی کارروائی لازم ہے۔ اِس لئے کاغذ کے گھوڑے بابِ عالی میں بھی کافی دوڑتے رہتے ہیں۔ اور اُن عُہدہ ہائے جلیلہ کی جن کا یہ صدر مقام ہے ظاہری شان پُوری طرح قائم ہے۔

بابِ عالی کی عمارت طرزِ اطالیہ پر بنی ہُوئی ہے اور گو احاطہ کے فرش کے بے مرمّت ہونے اور جس زمین پر بنی ہے اُس کے بے قاعدہ نشیب و فراز کی وجہ سے باہر سے اُس کا کچھ بہت اچھا اثر دیکھنے والے پر نہیں پڑتا۔ لیکن اندر سے وسیع اور بارونق ہے۔ وسطی دروازے سے داخل ہوتے ہی ایک بڑا مستطیل ہال ہے۔ جس میں مسلّح سپاہیوں کی ایک معقول تعداد کھڑی رہتی ہے۔ اس کمرے کی بغل میں ایک طرف وُہ کمرے ہیں جن میں صدرِ اعظم ہز ہائی نس فرید پاشا بیٹھتے

ہیں۔ اور دُوسری طرف مجلسِ وکلا اور مجلسِ شوریٰ کے اجلاس کے کمرے ہیں۔ ہال میں داخل ہوتے ہی جانبِ راست اگر مُڑجائیں تو ایک برآمدے سے ہوتے ہُوئے نظارتِ خارجیہ کے دفاتر آجاتے ہیں اور وہاں ایک وسیع اور شاندار گو نہایت سادگی سے آراستہ کمرہ ہزاکسلنسی توفیق پاشا مشہور وزیرِ خارجیہ کا ہے۔ وزیرِ داخلیہ ہزاکسلنسی ممدوح پاشا کے دفتر بھی عمارت کا ایک معقول حصّہ گھیرے ہوئے ہیں۔ گو جس کمرے میں وُہ خود بیٹھتے ہیں وُہ بہت بڑا نہیں۔ اِن بڑے دفاتر کے علاوہ کئی چھوٹے دفاتر متفرق کاموں کے لیے یہیں ہیں۔ انہی میں صیغہ مطبوعاتِ اجنبیہ ہے جہاں مختلف زبانوں کے اخبارات کے ترجمے تُرکی میں ہو کر صدرِ اعظم کی خدمت میں بھیجے جاتے ہیں اور جو حصّے ان تراجم کے وُہ ضروری سمجھتے ہیں سرائے ہُمایوں میں بھیجدیتے ہیں۔ اگرچہ سرائے میں خود بھی ایک علیحدہ محکمہ اس غرض کے لیے ہے۔ مطبُوعاتِ اجنبیہ کے دفتر کے قریب ہی مطبُوعاتِ داخلیہ کے معائنہ کا دفتر ہے۔ جس میں سنسر[۵۷] اور اس کے معاونوں کا ایک رشحۂ قلم کئی مضمون نگاروں اخبار نویسوں مؤلّفوں اور مصنّفوں کی محنت کے نتائج بیرحمی سے ردّی کر دیتا ہے۔

بابِ عالی کے دفاتر کوئی چار پانچ گھنٹے کے لیے کھُلتے ہیں۔ شاذ ہوتا ہے کہ دوپہر سے پہلے اُن میں کچھ جان نظر آئے۔ ٹھیک دوپہر کے قریب سب اہلکار اپنی اپنی جگہ موجُود ہوتے ہیں اور چار بجے کے بعد دوپہر سے دفتر برخاست

---

۵۷ سنسر انگریزی اور فرانسیسی میں اُس عہدہ دار کو کہتے ہیں جس کا کام اخباروں کی آزادی کی روک تھام ہو۔ اور جسے اُن کی ہر تحریر پر نکتہ چینی کا حق حاصل ہو۔ ۱۲

ہونے لگتے ہیں اور پانچ بجے تک برخاست ہو جاتے ہیں۔ بہ خلاف اس کے یلدیز میں آٹھ نو بجے صبح سے لیکر شام تک حاضر باشی ہے۔ اِس لئے جن اہلکاروں کی خدمات اُدھر منتقل ہو جاتی ہیں۔ انہیں غیر معمولی کام کرنا پڑتا ہے۔

ان دفتروں کے کھلتے ہی وزیرِ خارجیہ اور صدرِ اعظم کے ہاں دَوَلِ خارجیہ کی سفارتوں کے اہلکاروں کی بھیڑ ہو جاتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کے لئے سفارتوں کے سکرٹری اور ترجمان ذاتی ملاقات اور گفتگو کے طلبگار ہوتے ہیں اور خود سفراء دول بھی اکثر ملاقات کو آتے رہتے ہیں۔ اور اُن سب کی تعداد اس قدر ہے کہ بابِ عالی کے بیشتر اہلکاروں کا وقت وُہی لوگ لے جاتے ہیں۔ صیغہ خارجیہ کا وقت لینے کا تو انہیں حق بھی ہے کیونکہ وُہ اسی مطلب کے لئے موضوع ہے۔ مگر صدرِ اعظم اور ان کے عملے کا بہت سا وقت ہضم کر کے یہ لوگ مُلک کے اندرونی کاروبار پر ظلم کرتے ہیں۔ کیونکہ اسی نسبت سے اُن امُور پر توجہ کرنے کی فرصت کم رہ جاتی ہے۔

کچھ آب و ہوا کی تاثیر۔ کچھ مزاجوں پر مشرقیت کا اثر۔ بابِ عالی اور استانبول کے دیگر دفاتر میں یہ رواج عجیب دیکھا۔ کہ دفتر کے کمرے میں بیٹھے ہوئے اہلکار سگرٹ اور قہوہ پیتے اور مُلاقاتیوں کو پلاتے رہتے ہیں۔ اخلاق کے اعتبار سے جہاں مُلاقاتیوں کی تواضع قابلِ ستائش ہے۔ وہیں کام کے جلد ختم ہونے میں یہ بات حارج ہے۔

دفتروں میں اہلکاروں کی کُرسیاں عمومًا گدّے دار۔ مخمل پوش۔ اور نیچی ہیں۔ بیٹھنے کے لئے ان سے زیادہ آرام دِہ چیز مشکل سے ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا

کہ وُہ مستعدی اور بیداری کے لیے بھی ویسی ہی مفید ہیں۔

بابِ عالی میں زبان مروجہ ترکی ہے۔ اور تمام کاغذات سرکاری۔ سوائے نظارت خارجیہ کے اُن خطوط کے جو ممالکِ اجنبیہ کے جواب میں فرانسیسی میں لکھے جاتے ہیں ترکی میں ہیں۔ اہلکار ترکی نہایت خوشخط لکھتے ہیں۔ اور اکثر فرانسیسی بھی اچھی طرح لکھ اور بول سکتے ہیں۔ لیکن ترکی چونکہ کلک سے اور پرانی وضع کی روشنائی سے لکھتے ہیں۔ اِس لئے لکھے ہوئے کاغذات کو خشک کرنے کی وُہی پرانی ترکیب ان کے ہاں مروج ہے۔ کہ ریت سے سیاہی خشک کی جاتی ہے۔

مَیں نے پہلے یہ دستور ماہین ہمایوں میں حاجی علی پاشا کے ہاں دیکھا تھا۔ مجھے تعجب تو ہوا۔ لیکن پھر یہ خیال آیا کہ پاشا موصوف پرانی وضع کے آدمی ہیں۔ اِس لیے شاید جاذب استعمال کرنا پسند نہیں کرتے۔ لیکن جب بابِ عالی کے فرانسیسی دان اہلکاروں کے سامنے میں نے رنگارنگ کی ریگ دیکھی اور اُنہیں ریگ کاغذ پر ڈال کر اُسے سکھلاتے دیکھا۔ تو مَیں حیران ہُوا کہ یورپ کی سرزمین پر بیسویں صدی میں یہ رسم باقی ہے۔ مَیں اِس رسم پر اعتراض کرنے کو تھا کہ دریافت کرنے پر معلوم ہوا۔ کہ اُس روشنائی کے لیے یہی ترکیب موزوں ہے اور وُہ روشنائی ترکی لکھنے کے لئے اور کلک سے لکھنے کے لئے دوسری روشنائی سے بہتر ہے اِس لیے مجبوری ہے۔ چونکہ ہم دفاتر کی زبان بدستور ترکی رہنے کا خواہاں ہُوں اور ترکی لکھنے والوں کے نزدیک وُہ قلم۔ وُہ سیاہی اور وُہ ریگ لوازمِ ضروریہ میں سے ہیں۔ اِس لئے مجھے ریگ کی ضرورت کو بھی تسلیم کرنا پڑا۔ اب مجھے اِس سے وُہ پرخاش باقی نہیں جو پہلے دن تھی۔

زباندانی میں عثمانیوں کو خاص ملکہ معلوم ہوتا ہے - بابِ عالی میں قریب قریب ہر زبان کے جاننے والے موجود ہیں - فرانسیسی تو تعلیم یافتہ عثمانیوں میں سے اکثر کو خوب آتی ہے - اس کے سوا بابِ عالی کے کئی اہلکار جرمن بسہولت سے بولتے ہیں اور چند انگریزی بھی جانتے ہیں - انگریزی داں اصحاب میں دو صاحبوں سے مُلاقات کا مجھے موقعہ ملا - ایک تو سعد الدّین بے جو صیغۂ خارجیہ کے ترجمان اوّل ہیں - اور جن کے توسّط سے مجھ سے اور وزیرِ خارجیہ سے باتیں ہوتی رہیں - اور دُوسرے حقّی بے جو مجلسِ شوریٰ کے رُکن ہیں - دونوں نہایت خیر خواہِ دولت - ہمدردِ اسلام اور بیدار مغز نظر آئے - بابِ عالی تاریخ عُثمانیہ کے لمبے سلسلے میں کبھی اربابِ کمال سے خالی نہیں رہا - اور اس وقت بھی خالی نہیں - عثمانیوں میں اسوقت بہت سے باکمال ایسے بھی ہیں جو برسرِ کار نہیں - اور خانہ نشین ہیں لیکن جو لوگ عہدوں پر مامور ہیں اُن میں بھی اچھی تعلیم و تربیت کے آدمیوں کی کمی نہیں اور جب دولتِ عثمانیہ اپنے مامُورین کی قابلیّتوں سے پُوری طرح کام لے گی - تو بہت سے نقائص جنکا اُس کے مخالفین آئے دن اس زور سے چرچا کرتے ہیں - رفع ہو جائینگے -

استانبول کی سب سرکاری عمارتوں کی یہ صفت قابلِ تعریف ہے - کہ نماز کیلئے ایک جگہہ عمارت میں مخصوص ہے - چنانچہ بابِ عالی میں بھی ایک فراخ کمرہ نماز کے لئے رکھا گیا ہے جہاں مامُورین نماز ظہر ادا کرتے ہیں - اُدھر اَیا صُوفیہ سے اذان کا آوازہ بلند ہوا اور اِدھر مُسلمان اہلکار دُنیا کے دھندے چھوڑ کر خُدا کی طرف رجوع لائے ٭

ایا صُوفیہ

سجدہ کی آرزو ہو تو قسطنطنیہ میں ایا صُوفیہ سے زیادہ کونسی جگہہ اس کیلئے موزون ہوگی۔ زمین کا یہ قطعہ کوئی ڈیڑھ ہزار برس سے عبادت گاہِ خلائق چلا آتا ہے۔ پہلے جن کے پاس تھا وُہ اپنے عقاید کے موافق اس میں پرستش کرتے تھے۔ اب جن کے پاس ہے وُہ اپنے عقیدے کے موافق اپنے معبود کی اطاعت کرتے ہیں۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اِس قطعہ زمین کی قسمت میں قسّامِ ازل نے ہر انقلاب کے بعد عبادت گاہ بننا لکھا ہے۔ یہ تو عام طور پر معلوم ہی کہ جب مسلمانوں نے اِس پر قبضہ کیا۔ اُس سے پہلے یہ مشرقی یورپ کا سب سے بڑا اور سب سے مشہور گرجا تھا۔ مگر یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے۔ کہ اس گرجے سے پہلے جسے مسلمانوں نے موجود پایا۔ یہ بِنا کئی دفعہ خراب ہوچکی تھی۔ مگر یہ اُجڑنے کے بعد پھر آباد ہوتی رہی اور ہر صدی میں اُسی ایک مقصدِ عبادت کے لئے مخصوص رہی۔ یہاں کہا جاتا ہے کہ قسطنطین اعظم نے اس کی بُنیاد رکھی اور اور اس کے بیٹے کے عہد میں اس کی تکمیل ہُوئی سنہ ۳۶۰ء میں بڑی شان کے ساتھ اس کی رسمِ افتتاح ادا کی گئی۔ مگر ساری محنت اور سارا روپیہ جلد برباد ہوگیا کیونکہ سنہ ۴۰۴ء میں آگ نے اس کو پیوندِ زمین کردیا۔ اور چونکہ اُس عمارت میں زیادہ تر لکڑی سے کام لیا گیا تھا فقط راکھ کا ایک ڈھیر اس کا نشان رہ گیا۔ پھر طیودسیوس ثانی نے اسے از سرِ نو تعمیر کیا اور سنہ ۴۱۵ء میں اس کا افتتاح ہوا مگر ابتدائے سنہ ۵۳۲ء
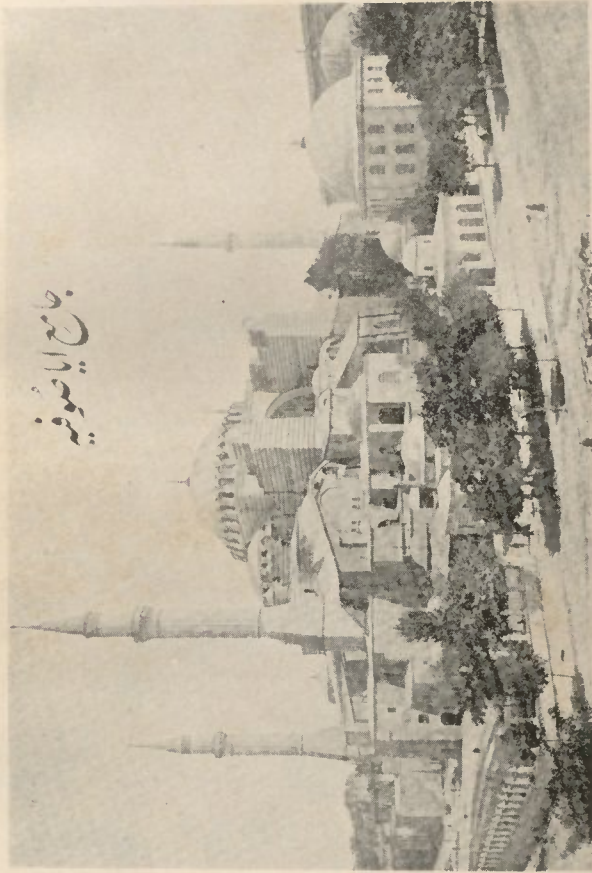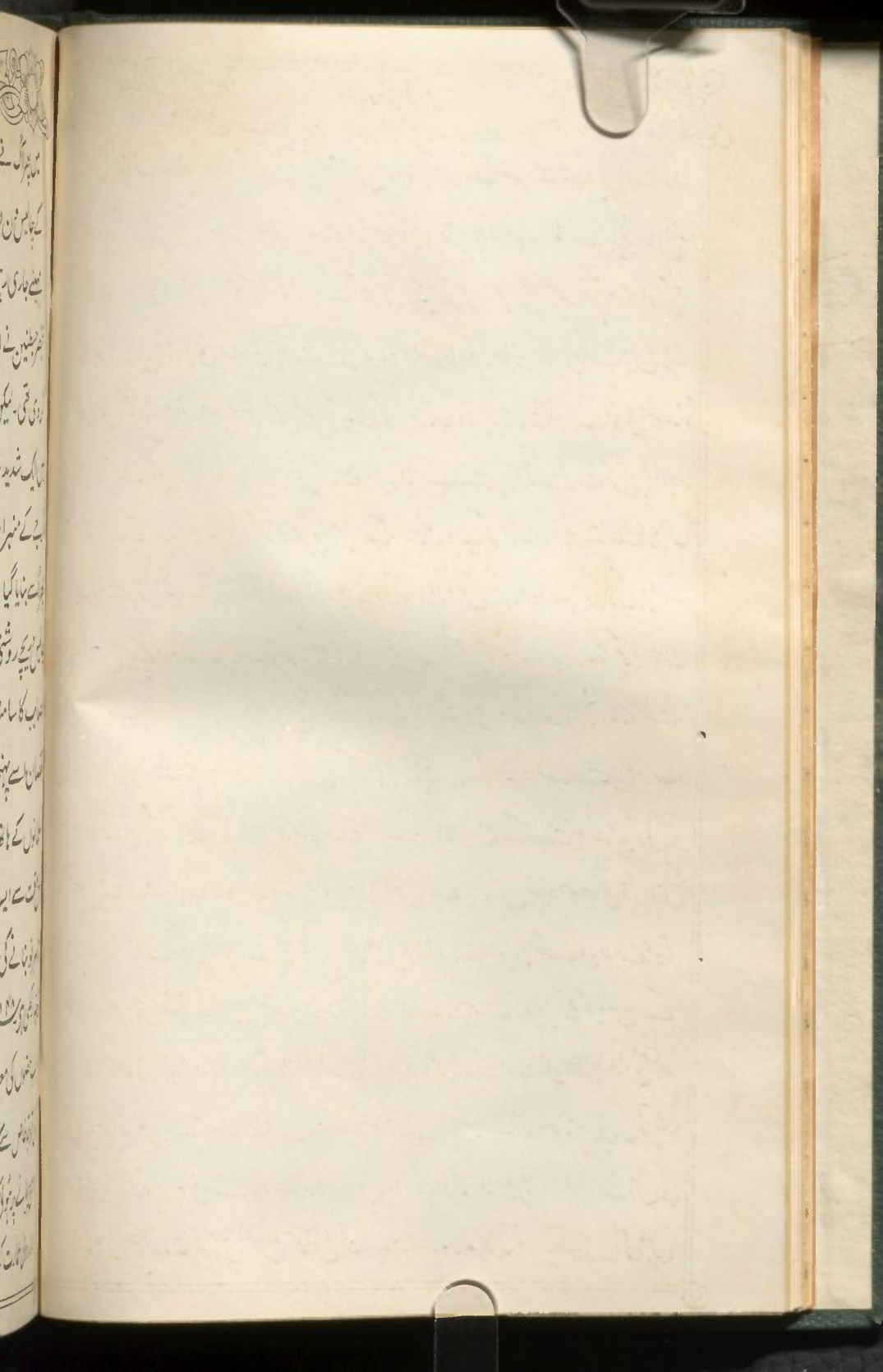
جامع ایا صوفیہ

میں پھر آگ نے اسے آلیا۔ لیکن قُقنُس وار یہ راکھ کے ڈھیر سے جی اُٹھی اور آتشزدگی کے چالیس دن بعد قیصر جسٹنین نے اسے بنوانا شروع کر دیا۔ عمارت پانچ سال دس مہینے جاری رہی۔ اور سنہ ۵۳۷ء کے آخری مہینے میں اس کی رسمِ افتتاح پھر ادا کی گئی قیصر جسٹنین نے اپنی ساری ہمت اس کے مضبوط اور عالیشان بنانے میں صرف کر دی تھی۔ لیکن اس دفعہ بھی اس گرجے کو دیر تک عافیت نہ نصیب ہوئی سنہ ۵۵۸ء میں ایک شدید زلزلہ آیا اور اُس سے اس کا سب سے بڑا گنبد ٹوٹ کر گر پڑا اور گرجے کے منبر اور قُربانگاہ وغیرہ اس کے نیچے دب کر ٹوٹ گئے۔ سنہ ۵۶۱ء میں پھر اُسے بنایا گیا۔ گنبد ۲۵ فٹ اور بلند کیا گیا اور اس میں سولہ دریچوں کی بجائے چالیس دریچے روشنی کے لئے رکھے گئے۔ عجیب اتّفاق ہے کہ اس گرجے کو بارہا ان مصایب کا سامنا ہوا اور تاریخ مذکورہ کے بعد بھی کئی دفعہ زلزلوں سے سخت نقصان اسے پہنچتا رہا۔ اور اس کے کئی حصّے گر گئے۔ مگر جب سے یہ عمارت مسلمانوں کے ہاتھ آئی ہے اور خدائے واحد کی عبادت کے لئے وقف ہوئی ہے اُس وقت سے ایسا کوئی حادثہ نہیں ہوا جس سے یہ بالکل تباہ ہو جاتی اور اس کے ازسرِ نو بنانے کی ضرورت پڑتی۔ سلاطین عظام نے اسکی مرمّت کی طرف ہمیشہ توجہ رکھی ہے سنہ ۱۸۴۸ء میں سلطان عبد المجید مرحوم نے بہت روپیہ لگا کر اس کے سب حصّوں کی معقول مرمّت کرا دی تھی اور اس کے بعد حال میں سلطان المعظّم کی توجّہ خاص سے سنہ ۱۹۱۰ء میں بڑے گنبد اور مسجد کے حصّۂ مغربی کی مرمّت وسیع پیمانے پر ہوئی ہے۔ یہ بات قابلِ داد ہے کہ سلاطینِ عثمانی نے اس کی اندرونی عمارت کو حتی الوسع بحال رکھا ہے۔ اور صرف وہ تبدیلیاں کی ہیں

جواز روئے مذہب لابُدّ تھیں۔ اس لئے کیا عیسائی کیا مُسلمان دونوں کے لئے یہ مقام آج تک دلچسپ چلا جاتا ہے۔ تاریخی مذاق رکھنے والے عیسائی سیّاح اس کے ہر پُرانے حصّے کو شوق سے دیکھتے ہیں اور اس کے نقشے کھینچتے ہیں۔ اس کی مختلف زمانوں کی مرمتوں کا پتا چلاتے ہیں اور تحقیقات کرتے ہیں کہ کونسا حصّہ بالکل اُسی طرح باقی ہے۔ جس طرح جسٹنین کے زمانے میں تھا اور کون سا اس کے جانشینوں کے وقت کی خبر دیتا ہے۔ مُسلمان جاتے ہیں اور خُدا کی قدرت دیکھ کر حیران ہوتے ہیں۔ کہ کیسے کیسے انقلاباتِ زمانہ سے یہ عالیشان بنا اُن کی عبادت گاہ بنی۔ یہ عمارت باہر سے نہ پہلے کچھ بہت خوبصُورت تھی۔ نہ اب ہے۔ گُنبد اس کے باہر سے سادہ رکھے گئے تھے اور اسلام نے جو مینار بڑھائے ہیں وُہ بھی سادہ ہیں۔ اور چُونکہ اس کے آس پاس جو عمارات اس کے بعد بنی ہیں اُن کی کُرسیاں اُونچی ہیں اور اِردگرد کی زمین کی سطح کو اُونچا کیا گیا ہے۔ اِس لئے اس کی بلندی بھی باہر سے کم نظر آتی ہی۔ پہلے دن جب ریل میں قسطنطنیہ پہنچتے وقت مجھے کسی نے کہا۔ کہ وُہ جامع ایاصوفیہ ہے۔ اور مَیں شوق سے ریل کی کھڑکی سے دیکھنے لگا۔ تو مجھ کو حیرت تھی کہ ایاصوفیہ کی اس قدر تعریف کس بات کی ہے۔ لیکن اندر جاکر وُہ حیرت رفع ہوگئی۔ اور ایک اَور قسم کی حیرت اس کی جگہہ جاگزین ہُوئی۔ یہ حیرت عمارت کی اندرونی خوبیوں کے اثر نے پیدا کی۔ عیسائی ماہرانِ تعمیر لکھتے ہیں کہ دُنیا بھر میں اور کہیں عیسائیوں نے اصُولِ فن کی رُو سے اتنا مکمّل اور ایسا خوبصُورت گرجا نہیں بنایا! اگر محض گنبد سے فیصلہ کریں تو یہ نتیجہ بدیہی ہے۔ رُوما کے مشہور پینتھیوں کے گنبد کا قُطر ایک سو تیس ۱۳۰ فٹ ہی۔ سینٹ پطرس کے شہرۂ آفاق گرجے اور فلارنس کے

بڑے گرجے کے گنبد ایک سو چھبیس فٹ کا قطر رکھتے ہیں اور لندن کا سب سے بڑا گرجا سینٹ پولوس ایک سو آٹھ فٹ کے قطر کا گنبد رکھتا ہے۔ حالانکہ ایا صوفیہ کے گنبد کا قطر ایک سو اناسی ۱۷۹ فٹ ہے۔ یہ بڑا گنبد چار بڑے محرابوں پر قائم ہے جو طول میں پچھتر ۷۵ فٹ اور عرض میں پچیس ۲۵ فٹ ہیں۔ گنبد کے نیچے کا حصہ جو ایا صوفیہ کا وسطی قطعہ ہے۔ ایک بڑا مستطیل ہال دو سو پچاس ۲۵۰ فٹ لمبا اور ایک سو ۱۰۰ فٹ چوڑا ہے۔ اس کے دائیں بائیں دو منزلہ عمارت ہے۔ جس کی ایک طرف کی گیلری کا طول عرض ۲۰۵ × ۲۶ فیٹ ہے۔ نو دروازے ایا صوفیہ میں داخل ہونے کے ہیں اور اُن میں سب سے بڑا دروازہ نہایت شاندار ہے۔ گو ان دروازوں کی شان میں اب یہ فرق آگیا ہے کہ عمارت کے نشیب میں ہونے کی وجہ سے دروازہ سے چند سیڑھیاں اُتر کر اندر جانا ہوتا ہے۔ حالانکہ پہلے جب اردگرد کی زمین اس عمارت کی کُرسی سے نیچے تھی تو دروازہ تک چند سیڑھیاں چڑھ کر آتا تھا۔

وسط مسجد میں داخل ہوتے ہی سنگ مرمر کا ایک بہت بڑا مٹکا پانی سے بھرا رکھا ہے۔ جس میں وضو کے لئے پانی ہے۔ یہ اُس موقع پر ہے۔ جہاں گرجے کے زمانے میں عیسائی پانی کا ایک بڑا برتن رکھا کرتے تھے۔ اور اُس برتن پر عبارت لکھی ہوئی تھی:۔ "صرف مُنہ دھونا کافی نہیں۔ اپنے گناہوں کو دھو"۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم زمانہ کے عیسائیوں میں عبادت سے پہلے وضو کا طریق جاری تھا اور اب وہ اس سے غافل ہو گئے ہیں اور جیسا کہ مسلمانوں میں وضو گناہوں کے دھونے کا نشان ظاہری سمجھا جاتا ہے۔ ایسا ہی عقیدہ عیسائیوں میں بھی تھا۔

سنگِ مرمر کے برتن سے ذرا آگے وسطِ عمارت کی طرف بڑھیں تو عین گنبد کے

نیچے جاتے پہنچے ہیں۔ اُوپر کو نظر اُٹھائیں تو سب سے پہلے نگاہ چھت کے خوبصُورت
کام پر جا کے جمتی ہے اور اس کے بعد اُس کے چاروں گوشوں میں ایک عجیب
ہیئت کی چار تصویریں ایک دوسرے کے مشابہ دیکھ کر حیران ہوتی ہے۔ کہ یہ
کیا تصویریں ہیں اور مسجد میں اِن کا کیا کام۔ یہ گرجا ہونے کے وقت کا بقیہ
ہیں۔ چاروں مشہور فرشتے جن کے نام نصاریٰ و یہوُد اور مسلمانوں کی کتابوں
میں مذکور ہیں۔ اس گنبد کی چھت پر دکھائے گئے تھے۔ چُونکہ اُن کا نہ مُنہ بنایا
گیا ہے نہ سر۔ اِس لئے یہ تصویریں محو کئے جانے سے بچ گئیں۔ باقی جو تصاویر
اس گرجے میں تھیں وُہ سب مٹا دی گئی ہیں اور دو تین جو مٹ نہیں سکتی تھیں۔
وُہ ترکیب سے ڈھانپ دی گئی ہیں۔ تاکہ مانع نماز نہ ہوں۔ یہ تصویریں محض رنگ
و روغن سے بنی ہُوئی نہیں بلکہ موزائیک کی بنی ہُوئی ہیں۔ یہ فن اطالیہ میں بکثرت
مروّج ہے۔ پتھر کے چھوٹے چھوٹے رنگین ریزے اس خوبی سے چُنے
جاتے ہیں۔ کہ انسانی صُورتیں۔ گُل بوٹے۔ کوہ و دریا جو چاہو در و دیوار پر نمایاں
ہو جاتا ہے اور دیوار کا جُزو بن جاتا ہے۔ دیوار ٹوٹ بھی جائے تو اس کے
رنگ میں فرق نہیں آتا ہے۔ اور اس کے ٹکڑے عجائب گھروں میں رکھے جاتے ہیں۔
دیواروں کی زینت میں اسلام نے یہ اصلاح کی ہے کہ تصویروں کی بجائے
اللہ و رسول کا نام بڑی بڑی لوحوں پر خوشخط نستعلیق حروف میں لکھوا کر لٹکا دیا ہے۔
چاروں اصحاب کے نام نامی ویسے ہی جلی حروف میں لکھے ہُوئے لٹک رہے
ہیں۔ محراب کی زینت دو بہت بڑی موم بتیوں سے ہے۔ جو محراب کے دونوں
طرف اِستادہ ہیں۔ کوئی چار گز لمبی اور اسی نسبت سے موٹی ہیں۔ یہ بتی گرجے
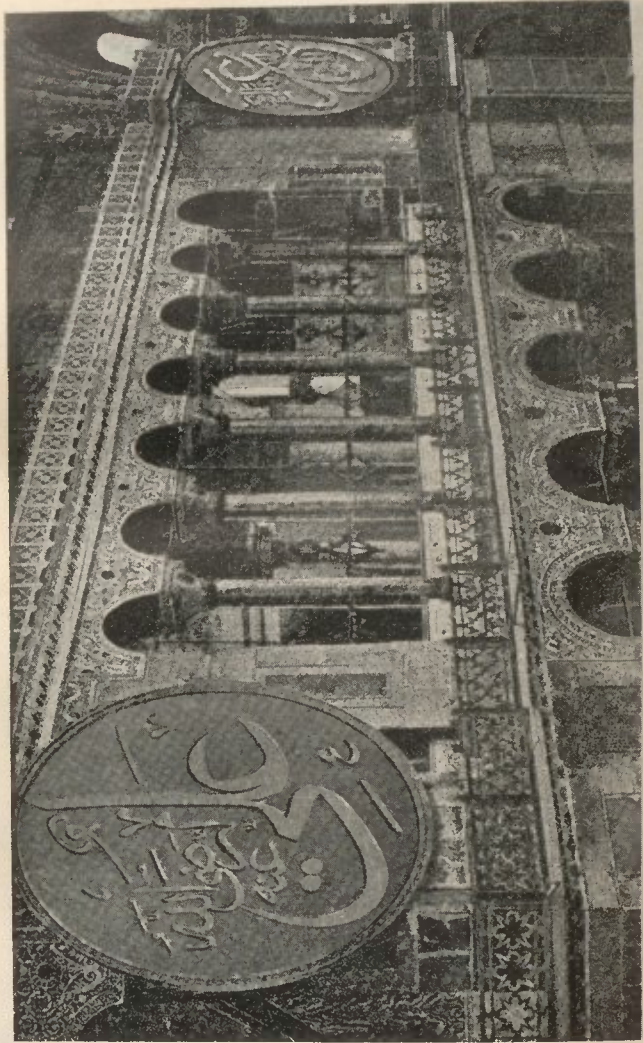
اندرونِ جامع ایاصوفیہ

کی آرائش کا بقیہ معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ عیسائیوں کے گرجاؤں میں عموماً موم کی بڑی بڑی بتیاں استعمال کی جاتی ہیں۔ لیکن چونکہ یہ محض روشنی کا ذریعہ تھا اور اس پر کوئی شرعی اعتراض نہ ہو سکتا تھا۔ اس لئے مسلمانوں نے اسے بحال رہنے دیا۔ رفتہ رفتہ ان بتیوں کا یہاں تک رواج ہو گیا۔ کہ اس کے بعد استانبول میں مسلمانوں نے جو مساجد خود بھی بنائیں اُن میں بھی محراب کے پاس ایسی بتیاں اِستادہ ہیں لیکن یہ محض زیبائش کے لئے ہیں۔ شاید کسی نہائت ہی خاص موقعہ پر جلتی ہوں۔ عام طور پر روشنی کے لئے بڑے بڑے آہنی جھاڑ چھت سے لٹک رہے ہیں جن میں سے ایک ایک کے بیسیوں چھوٹے چھوٹے بلور کے چراغ آویزاں ہیں جب کبھی یہ سب روشن کئے جاتے ہیں۔ تو عجب سماں ہوتا ہے۔

مسجد کا منبر نہایت بلند ہے اور دُوسری مساجد میں بھی اس کی تقلید کی گئی ہے۔ ہمارے ہاں منبر اس قسم کا نہیں ہوتا۔ اس کے زینوں کے اختتام پر ایک مخروطی شکل کا مینار سا ہوتا ہے جس پر ہلال نشانِ اسلامی ہے۔ امام جب خُطبہ پڑھتا ہے تو سب سے اُوپر کے زینے پر یا اس سے ایک زینہ نیچے کھڑا ہوتا ہے اور اس کے دونوں جانب دو جھنڈے آویزاں ہیں کہتے ہیں۔ اب سے چند برس پہلے ایا صُوفیہ کا امام خُطبہ کے وقت تلوار بھی ہاتھ میں لے کر کھڑا ہوتا تھا۔ لیکن اب یہ رسم نہیں رہی۔ منبر کی پہلی سیڑھی کے سامنے ایک دروازہ ہوتا ہے۔ جس پر یا سبز پردہ لٹکتا رہتا ہے۔ یا دروازہ بند رہتا ہے۔ امام کا ایک لباس مخصوص ہے۔ جو وُہ جمعہ کے دن پہنتا ہے۔ اور جس کے رنگ سے اس کے رُتبے کی تمیز ہوتی ہے۔ ان سب رسموں میں عیسائیت اور اسلام اور مشرق اور مغرب دونو کے

صدیوں تک ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو رہنے کے آثار ویسے ہی نمایاں ہیں۔ جیسے ہندوستان کے مسلمانوں کی بعض عادات میں ہندو مسلمانوں کے تمدن کے میل جول کے ورنہ اسلام جب پہلے ریگستانِ عرب سے چلا تھا تو سادگی ہی اسکی زینت تھی۔ اور اُسے عمامے کے رنگ اور قبا کی وضع کے امتیازات سے کچھ بحث نہ تھی

ایا صوفیہ کا ذکر ختم کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جسٹینین کے زمانے کی تعمیر کے متعلق چند حکایات جو عیسائیوں میں مروّج ہیں نقل کر دی جائیں اُن میں سے کئی درست ہیں اور کئی محض فسانے معلوم ہوتے ہیں۔ مگر دونوں دلچسپ ہیں۔ جنوری ۵۳۲ء کی آتشزدگی کے بعد جب جسٹینین کو یہ گرجا دوبارہ بنانے کا خیال آیا۔ تو اُس نے ارادہ کیا کہ ایسا گرجا بنے جس کی پہلے کہیں نظیر نہ ہو جس دن سے عمارت شروع ہوئی۔ اُس کی نگرانی کا کام اُس نے اپنے ذمے لیا۔ دوپہر کو بجائے محلوں میں آرام کرنے کے وہ خود جا کر تعمیرات کا معائنہ کیا کرتا تھا۔ اور ایسی عقیدت سے آتا تھا جیسے زائر کسی مقدس مقام کی زیارت کو جاتے ہیں۔ گاڑھے کا ایک سادہ سا جامہ پہنے۔ سر پر ایک رومال باندھے اور عصا ہاتھ میں لئے قیصر جسٹینین دوپہر کی دھوپ میں کام کی نگرانی کے لئے کھڑا ہوتا تھا اور معماروں مزدوروں کی ہمت اپنی مثال سے بڑھاتا تھا۔ کسی کو انعام دیکر خوش کرتا تھا۔ اور کسی کو نرمی گفتار سے گرویدہ۔ اس کوشش کے باوجود پانچ سال دس مہینے میں عمارت ختم ہوئی تھی۔ یہاں تک تو روایت تاریخی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ اس زمانے کے عقیدت مند عیسائیوں نے عجب حاشیے چڑھائے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ جب خزانے میں مصارفِ تعمیر کے لئے

روپیہ کافی نہ رہا۔ تو ایک فرشتہ سونے کی تھیلیاں خچروں پر لاد کر لایا اور بادشاہ کو دے گیا۔ کہ باقی عمارت اس سے مکمل کرو۔ عمارت کا نقشہ بھی جسطنین کو ایک فرشتے نے خواب میں بتایا تھا۔ یہاں تک تو مضائقہ نہیں۔ خواب کی حقیقت انسان کے لیے ایک رازِ سربستہ ہی۔ لیکن روپیہ تو فرشتہ خواب میں نہیں دے گیا۔ بلکہ بیان کیا جاتا ہے۔ کہ دِن کو بیداری کے عالم میں لایا اور جسطنین کے حوالے کر گیا۔ افسوس ایسے معجزات کا دروازہ اب بالکل بند ہو گیا۔ اور اب کسی کو یہ خوش قسمتی نیک سے نیک کام کے لئے بھی حاصل نہیں ہوتی کہ روپیوں کی بوریاں بندھی بندھائی آسمان سے چلی آویں۔ تاریخ کی رو سے یہ بوریاں رعایا کی محنت کی کمائی سے وصول کی گئی تھیں اور ہر ادنیٰ و اعلیٰ پر ایک خاص ٹکس اس شاہی شوق کے لئے لگایا گیا تھا جسطنین نے گو اس عمارت سے اپنے مذہب کی خدمت کی اور اس کی مستعدی اور سرگرمی اور موٹے کپڑے پہن کر اس کا درویشانہ اس خدمت کے لئے پھرنا یہ سب چیزیں گویہ ظاہر کرتی ہیں کہ مذہب کی قوت اس سے یہ کام کرا رہی تھی۔ لیکن عمارت کی تکمیل پر جو کلمات اُس کی زبان سے نکلے وُہ یہ بھی ثابت کرتے ہیں کہ مذہبی عقیدت کے ساتھ نمود کا شوق بھی اُس کے دِل میں زور سے جوش زن تھا۔ یہ دیکھ کر کہ اس عمارت کے ذریعے سے وُہ حضرت سلیمانؑ کے نام کی شان کو مات کرنا چاہتا تھا۔ اس کے مذہبی جوشش کی قدر آدھی رہ جاتی ہے۔ تکمیلِ عمارت پر جو لفظ اُس نے اِستعمال کیے وُہ یہ ہیں:۔ خُدا کا شکر ہے جس نے مجھے ایسے بڑے کام کے انجام دینے کے لائق سمجھا۔ اَے سلیمان! مَیں تجھ سے سبقت لے گیا ہُوں"۔

اِس زمانے میں اِس بات کا اندازہ کرنا مشکل ہے کہ شانِ سلیمانی سے سبقت لیجانے کی کوشش میں جسٹینین نے کتنا روپیہ خرچ کیا۔ مختلف بیانات ہیں اور مختلف رائیں۔ بعض نے لکھا ہے کہ گرجے کی عمارت ابھی زمین سے دو ہاتھ بلند نہیں ہوئی تھی کہ پینتالیس ہزار پونڈ یعنی چھ لاکھ پچھتر ہزار روپیہ صرف ہو چکا تھا اور کل خرچ تین لاکھ بیس ہزار پونڈ یعنی اڑتالیس لاکھ روپیہ ہوا۔ یہ کچھ بیجا تخمینہ نہیں اور اس وقت اشرفی کو جو قیمت تھی اس کو ذہن میں رکھ کے حساب لگائیں تو آج کل کے حساب سے اس کی لاگت اس رقم سے کئی گنا زیادہ بیٹھتی ہے۔ موجودہ صورت میں اسکا اندازہ اقلاً دس لاکھ پونڈ یعنی ڈیڑھ کروڑ روپیہ کیا جاتا ہے۔

جسٹینین کو چند دفعہ اپنی رعایا کے بعض لوگوں سے اس عمارت کے واسطے جسے وہ پہلی عمارت سے زیادہ وسیع بنا رہا تھا۔ زمین حاصل کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ اس کی تحصیل کی نسبت عجیب روائتیں ہیں۔ ایک طرف ایک خواجہ سرائے کی زمین تھی۔ دوسری طرف ایک کفش دوز کی۔ تیسری طرف لٹیوکوس نامی دربان کا مکان اور چوتھی طرف ایک بیوہ بڑھیا کا گھر تھا۔ نقشہ جو تجویز ہو چکا تھا اس کے مطابق یہ سب زمینیں درکار تھیں۔ خواجہ سرائے نے اپنی خوشی سے اپنی مِلک گرجے اور بادشاہ کی نذر کی۔ کفش دوز اَڑ بیٹھا۔ کہ میں نہیں دیتا۔ بڑی مشکل سے اس شرط پر راضی ہوا کہ بادشاہ اصلی داموں سے دُگنے دام دے اور اس کے سوا گھوڑ دوڑ کے دن اُسے یہ حق عطا کرے کہ اس کے داخلِ میدان ہونے پر اُسی طرح خوش آمدید کے نعرے بلند ہوں جیسے خود قیصر کے لیئے۔ قیصر نے یہ شرط منظور کر لی اور اس کا مکان لے لیا۔ دربان کی باری آئی تو اُس نے بھی

بیچنے سے عذر کیا۔ اُس دربان کو گھوڑ دوڑ دیکھنے کا بیحد شوق تھا۔ بادشاہ کے ایک
مشیر نے اُسے عین دَوڑ کے وقت بند کر دیا۔ وُہ منّتیں کرنے لگا کہ مجھے جانے دیجئے۔
مگر قیصر نے حکم دیا کہ جب یہ مکان کے بیع نامہ پر دستخط کر دے تو اسے جانے دیا جائے۔
یہ مرحلہ بھی اس طرح طے ہوَا۔ اب رہ گئی غریب بیوہ عورت۔ اس کے گھر کی قیمت کا اندازہ
پچاسی پونڈ کیا گیا اور بادشاہ نے اسے پیغام بھیجا۔ کہ یہ رقم لیکر گھر خالی کر دے۔ اس نے
کہکر بھیجا۔ کہ مَیں بیچنا نہیں چاہتی اور جوش میں آکر پیام بر کو کہا کہ پچاس اشرفیاں تو
کیا اگر تو پچاس قنطار سونے کے لائے۔ جب بھی میں اپنا مکان نہ دوں۔ بادشاہ
یہ پیغام سُن کر ناراض نہیں ہوا۔ بلکہ خود اس کے گھر چل کر گیا۔ اور اُس سے بہ منّت
درخواست کی کہ یہ زمین اس نیک کام کے لئے درکار ہے۔ مہربانی کرکے دیدے۔
اس پر پیرزن آبدیدہ ہوگئی اور اُس نے بادشاہ کے سامنے ادب سے دوزانو ہو کر
عرض کی۔ کہ یہ ناچیز جائداد مجھ سے مُفت قبول کی جائے۔ اور اس کے عوض میں مجھ پر
فقط یہ احسان ہو کہ میری قبر اس متقدّس مکان کے ایک گوشے میں بنے۔ تاکہ مجھے
اس کا انعام آخرت میں ملے۔ بادشاہ نے بخوشی اس شرط کو منظور کیا۔ اور کیا
عجب ہے کہ ثواب کے دفتر میں اس غریب بڑھیا کا ایثار جسطنین کی لاکھوں اشرفیوں
کے ثواب سے سبقت لے گیا ہو ؎

اگر بریاں کند بہرام گورے ۔۔۔ نہ چوں پائے ملخ باشد زمورے

جہاں عیسائیوں میں اس واجب التعظیم مقام کی نسبت طرح طرح کے قصّے مشہور ہیں
وہیں مسلمانوں کے ہاں بھی طرح طرح کی روایات اِس سے مربُوط ہو گئی ہیں۔ ایک
روایت یہ ہے کہ حضرت سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے دُنیا میں تشریف لانے

کے دن صرف عجم میں قصرِ نوشیرواں ہی نہیں ہل گیا تھا۔ بلکہ مغربی دُنیا میں اِس عالیشان گرجے کی بنا بھی کانپ گئی تھی اور اس کا ایک حصّہ زلزلے سے گر گیا تھا۔ مسجد کی ایک دیوار میں سُوراخ سا ہے۔ جس کی مٹّی اَن پڑھ مسلمان عورتیں متبرّک سمجھتی ہیں۔ مَیں نے چند فراجہ پوش عورتوں کو اُس سُوراخ میں اُنگلیاں ڈال ڈال کر اس کی مٹّی آنکھوں سے ملتے دیکھا۔ اس کے علاوہ وُہ ہاتھ جو پتّھر کے ستُون میں گڑا ہُوا ہے اور جسکی نسبت عیسائیوں کی روائتیں بیان ہو چکی ہیں۔ اس کی نسبت عوام اہلِ اسلام جو سلطان محمد فاتح کو قریب قریب ولی کامل مانتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ چُونکہ گرجا قبلہ رو نہ بنا تھا۔ اِس لئے اُسے جانبِ قبلہ کرنے کے لیئے محمد فاتح نے زور سے ایک ہاتھ مار کے اُس کا رُخ بدل دیا۔ اور یہ نشان اُس ہاتھ کا ہے۔ گویا اُس ہاتھ کو سلطان فاتح کا ہاتھ ماننے میں مُسلمان اور عیسائی دونوں کی روایات متفق ہیں۔ صرف یہ فرق ہے کہ مسلمان اسکی وجہ کچھ اَور بتاتے ہیں اور عیسائی کچھ اَور۔

محرابِ مسجد کے قریب بڑے بڑے قلمی قرآن مجید رحلوں پر دھرے ہیں۔ آنے جانے والے انکی زیارت کر سکتے ہیں اور بہت سے لوگ وہاں بیٹھے انہیں پڑھتے بھی رہتے ہیں۔ جس وقت مَیں اور میرے ہمراہی وہاں گئے۔ تو ایک غریب لڑکا حفظِ قرآن میں مشغول تھا۔ ہم نے اُس سے کہا کہ ذرا قرأت تو سُناؤ۔ اُس نے نہایت عمدگی اور صحت سے پڑھ کر سُنایا جس سے ہم بہت محظوظ ہُوئے۔

قرآن شریف کا جسے ہم سب حکمتوں کا خلاصہ مانتے ہیں۔ ایا صُوفیہ میں پڑھا جانا ہمیں بہت موزوں معلوم ہوا کیونکہ "صُوفیہ" کے معنے یونانی میں دانش و حکمت کے ہیں۔ اور یہ گرجا حکمت کے نام سے موسوم کیا گیا تھا۔ اب جامع اسلامی بنگیا تو بھی قرآن مجید کی بدولت کانِ حکمت رہا۔

خزینۂ ہمایوں کا دروازہ

خزینہ وسرائے قدیم

ایا صُوفیہ اگر مذہبی تاریخ کا خلاصہ ہے۔ تو سرائے قدیم قسطنطنیہ کی دُنیاوی ہسٹری کا لُبِ لباب ہے۔ یہ پُرانا محل قیصروں کے زمانے میں بھی بادشاہوں کی سکونت کی جگہ تھا اور سلاطین عثمانی بھی مدتوں اس میں متمکن رہے۔ اگرچہ وہ رونق وُہ گھما گھمی جو سلطان محمُو ثانی کے عہد تک اس سرائے کا حصّہ تھی۔ یہاں سے منتقل ہو کر پہلے باسفورس کے دُوسرے کنارے قصرِ چراغاں اور طولمہ باغچہ[۱] میں چلی گئی۔ اور پھر وہاں سے یلدیز کے حصّے میں آگئی۔ تو کیا ہوا۔ قدیم عظمت کے بہت سے نشان اب تک اس محل میں رکھے ہیں اور خزینۂ ہمایوں اور خرقۂ شریف کی بدولت اسے سلاطینِ عظام سے گاڑھا تعلق ہے۔ کیونکہ خلفائے عثمانی کی خلافت کی سندات گویا یہاں محفوظ ہیں۔ اور خلیفۂ وقت کے لیے ہر سال ماہِ رمضان میں ایک دفعہ یہاں آنا اور زیارات اور تبرکات کو کھولنا ایک فرضِ منصبی ہے۔

استانبول میں اس مقام کو محض سرائے یعنی محل کے نام سے یاد کرتے ہیں اور سرائے قدیم اُس محل کو کہتے ہیں جو موجودہ سرعسکرت کی عمارت کی جگہ واقع تھا۔ اور جہاں سلطان محمد فاتح رہتے تھے۔ لیکن چونکہ اب اُس محل کی جگہ سرعسکرت کی عمارت بن گئی ہے اور اُس کے بعد اس سرائے سے پُرانا محل کوئی نہیں۔ کیونکہ اس سے کبھی کبھی

---

[۱] طولمہ باغچہ۔ ایک نہایت شاندار محل ہے۔ اسے ترکی میں "ط" سے لکھتے ہیں۔ مگر تلفّظ دولمہ باغچہ کرتے ہیں۔ کیونکہ اکثر الفاظ میں "ط" کا یہی تلفظ ترکی میں ہے۔ شاہی فرمان کے ذریعہ سے قصر کو دیکھ سکتے ہیں لیکن چونکہ میرے زمانہ قیام میں یہاں مرمت جاری تھی۔ اِس لیے میں نہ دیکھ سکا ۱۲

حصے سلطان محمد فاتح کے بنائے ہوئے ہیں۔ اِس لئے اسے سرائے قدیم کہنا بیجا نہیں۔
اِس کے موقعہ اور ابتدائی تاریخ کا حال مختصراً اس بیان سے جو ایک جدید کتاب[1] سے
منقول ہے۔ واضح ہو جائیگا :۔

"جہاں باسفور کا پانی بحیرہ مرمر سے جا ملتا ہے اُس نقطہ کے قریب ایک پہاڑی
چٹان اپنے سلسلے سے آگے بڑھ کر باسفور میں آ گھسا ہے۔ جس سے ایک راس کی صورت
پیدا ہو گئی ہے۔ اس راس پر یہ محل واقع ہے۔ شاہان بازنطائن کے محلات صدہا سال
تک اسی دلفریب مقام پر رہے ہیں۔ اور یہیں اُن کے بعد جب ترکوں نے یہ شہر
لے لیا تو سلاطین کی سکونت رہی۔ اس کا بیشتر حصہ شاہان بازنطائن کے محلات
سے گھرا ہوا تھا۔ اِس کے گرد مضبوط دیواریں اور بلند برج بحر و بر دونوں طرف سے
اسے محفوظ بنانے کے لئے تھے۔ اور وہ دیواریں اور برج کسی قدر اب بھی باقی ہیں۔
قسطنطین اعظم۔ طیودوسیوس ثانی اور ہرقل ان دیواروں اور برجوں کے بنانے والے
تھے۔ مگر موجودہ دیوار پالیولوگوس نے اُس وقت بنوائی تھی جب اُس نے سنہ ۱۲۶۱ء
میں لاطینیوں سے اس پایۂ تخت کو چھین لیا تھا۔ اس چار دیواری کے اندر داخل ہونے
کے چار دروازے ہیں۔ "دمیر قپو" یعنی آہنی دروازہ جو ریل کے سٹیشن کے قریب ہے
"صوق چشمہ قپو" جو دفتر وزیر خارجیہ کے متصل ہے۔ "گل خانہ قپو" جو ساحل بحیرہ مرمر پر
واقع ہے اور "باب ہمایوں" جسے سلطان محمد فاتح نے بنوایا تھا اور جو مدت تک سلاطین کے
آنے جانے کے لئے محل کا بڑا دروازہ رہا۔ یہ سرائے آجکل دو حصوں میں منقسم ہے
خزینۂ ہمایوں جس میں جانے کے لئے ارادۂ سلطانی حاصل کرنا پڑتا ہے اور بیرونی میدان

[1] یہ کتاب مسٹر گوڈ یونس نے جو خود استانبول کے رہنے والے میسائیوں میں سے ہیں سیاحوں کی اطلاع کے لئے حال میں زبان انگریزی میں شائع کی ہے۔

جس میں مکتبِ طبیہ شاہانہ۔ مکتبِ صنائع۔ ٹکسال۔ مُوزہ[۵۱] انطیق اور سینٹ آرین کا گرجا واقع ہیں۔ جس دروازہ سے خزینہ والے حصّے میں داخل ہوتے ہیں۔ اس کے اور گرجے کے درمیان ایک کھُلا صحن ہے جسے ینی چری فوج کا صحن کہتے ہیں۔ اور اس صحن میں ایک پُرانا چنار ہے جس پر قدیم زمانے میں بغاوت کے مجرموں کو جلّاد پھانسی دیا کرتا تھا اور جس کے سائے تلے ینی چری فوج کی کئی سازشیں ہُوئی تھیں"۔

خزینہ ہمایُوں محل کے جس حصّے میں ہے اُس میں خزینے کے سوا کئی چیزیں دیکھنے کی ہیں۔ مسجد جس میں عَلمِ نبوی۔ خرقہَ شریف۔ پہلے خلفا کی تلواریں اور دیگر تبرّکات مقفّل رہتے ہیں۔ اسے باہر سے ہی دیکھنا مِلتا ہے۔ کیونکہ یہ صرف پندرہویں رمضان کو کھولا جاتا ہے۔ پُرانا شاہی کتب خانہ جس میں مشہور کتابوں کے عُمدہ عُمدہ قلمی نسخے رکھے ہیں۔ دیوانخانہ جہاں سلاطین سفرائے دوِل خارجیہ سے مُلاقات کیا کرتے تھے۔ بغداد کوشک اور مجیدیہ کوشک۔ ان سب چیزوں کے دیکھنے کے لئے مجھے اور میرے رفیقِ[۵۲] سفر کو فرمانِ سلطانی عطا ہو گیا تھا۔ اِس لئے ہم قپودان[۵۳] حسام الدین بے یاور[۵۴] مخصوص حضرت شہریاری کے ہمراہ وہاں پہنچے۔ حسام الدین بے ایک معزز خاندان

---

۵۱ انگریزی لفظ "میوزیم" (یعنی عجائب گھر) کو فرانسیسی میں "مُوزے" کہتے ہیں اور ترکی میں یہ لفظ فرانسیسی سے آکر مُوزہ بنگیا ہے۔ یہ لفظ اُردو میں بہ آسانی کھپ سکتا ہے۔ "انطیق" بھی انگریزی لفظ انٹکویٹی کی فرانسیسی صورت ہے جو ترکی اور جدید فارسی میں رواج پاگئی ہے اور جس کا ترجمہ اُردو میں ہم عمومًا اشیائے قدیمہ کرتے ہیں۔

۵۲ شیخ مشیر حسین صاحب قدوئی تعلقدار گدیہ ضلع بارہ بنکی اودیَں ہم سفر تھے۔ اور استانبول کی ساری سیر میں وُہ میرے شریکِ حال رہے۔

۵۳ لفظ کپتان کی ترکی صُورت ہے۔ ۵۴ ایڈی کانگ کو ترکی میں یاور کہتے ہیں۔

کے علیم یافتہ نوجوان ہیں۔ وُہ نہایت اخلاق سے مجھ سے فرانسیسی میں باتیں کرتے گئے۔ راستے میں جابجا پولیس کی چوکیاں آئیں۔ جن کے باہر مسلّح سپاہی پہرہ پر رہتے ہیں۔ اُنہوں نے ہر جگہ قپودان صاحب کی وردی پہچان کر فوجی آداب سے سلام کیا۔ اِسی طرح بابِ ہمایوں پر سپاہیوں نے سلام کیا اور بے روک ہمیں اندر جانے دیا۔ پہلے صحن سے گذر کر جب دُوسرے دروازہ میں داخل ہُوئے تو ایک سفید ریش بزرگ نے جن کا نام ادھم بے ہے اور جو وہاں خزینہ دار کا عُہدہ رکھتے ہیں اپنے کمرہ سے نکل کر استقبال کیا۔ یاور مخصوص نے فرمانِ شاہی اُنکو دیا۔ اُنہوں نے کھول کر پڑھا۔ ہمیں خاطر سے بٹھایا اور آدمی کو کہا قہوہ لائے۔ ہم ابھی قہوہ پی رہے تھے۔ کہ خزینۂ ہمایوں کے ماتحت ملازمین کوئی بیس کے قریب خزینہ کے دروازہ کے سامنے قطار باندھکر دست بستہ کھڑے ہوگئے۔ خزینہ دار نے ہم سے کہا کہ چلئے۔ اور خود بڑھ کر خزینہ کی چابیاں نکالیں۔ یہ چابیاں ایک ریشمی بٹوے میں رکھی ہُوئی تھیں۔ خزینہ کا دروازہ بہت پُرانی وضع کا تھا اور اُس کا قفل بھی نہایت پُرانے نمونے کا اور بہت بڑا تھا۔ جب یہ دروازہ کھل گیا تو ایک اَور قفل نظر آیا۔ خزینہ دار نے اُسے بھی کھولا۔ اس پر وُہ سب ملازمین کمرے کے اندر جاکر چاروں طرف کھڑے ہوگئے۔ اور ہم نے خزینے کو دیکھنا شروع کیا۔

پہلی چیز جس پر نگاہ بے اختیار رُک گئی۔ وُہ جواہرات سے جگمگاتا ہُوا ایک بڑا تختِ زر تھا۔ یہ تخت سُلطان سلیم اوّل کے عہد میں ایران سے آیا۔ شاہ اسمٰعیل کا تخت ہے۔ بیشمار بڑے بڑے نادر جواہرات اِس میں جڑے ہیں۔ لعل و زمرّد اور گہرہائے آبدار کا مناسب ملاپ عجب حسن افزا ہے۔ اس تخت کے پیچھے ایک دریچے کے قریب

سُلطان عبدالعزیز مرحوم کا ایک برنجی مجسّمہ ہے۔ جس میں وُہ گھوڑے پر سوار نظر آتے ہیں ترُکی زرہ بکتر کے نمونے بھی اس کمرہ میں بکثرت ہیں۔ دائیں طرف شیشے کی ایک الماری میں پالیولوگوس کی تلوار ہے۔ یہ بازنطائن خاندان کا آخری بادشاہ تھا۔ بائیں ہاتھ کی الماری میں زمرّد کے دستہ ہائے شمشیر۔ اور لولو و مرجان سے بھرے ہُوئے سونے چاندی کے طاس رکھے ہیں۔ طلائی کام کی زینتیں اور مرصع زین پوش بھی اسی کمرہ میں سجے ہیں۔ کمرہ کی اشیاء نادرہ ختم ہو چکیں تو خزینہ دار صاحب ہمیں اوپر گیلری میں لے گئے۔ وہاں ہم نے ایک اور تخت دیکھا جس کی ساخت عثمانی ہے اور ایرانی طرز سے بالکل جُدا۔ عثمانی صنعت کا یہ نمونہ اپنی جگہ کچھ کم شاندار نہیں۔ یہ تخت گو لکڑی کا ہے مگر لکڑی نہایت ہی گراں بہا صندل و آبنوس کی ہے اور قیمتی سیپ اور ہیرے موتی اس میں جڑے ہیں۔ اس کی چھت سے ایک بہت بڑا دانہ زمرّد آویزاں ہے۔ نہایت ہی خوشرنگ جس کا قطر چار انچ ہے۔ اس کے قریب ایک الماری میں سُلطان مراد رابع کا خُود اور زرہ بکتر ہے جو انہوں نے ۱۶۳۸ء میں فتح بغداد کے وقت پہنا تھا۔ زرہ بکتر کے پاس اُن کا خنجر رکھا ہے۔ جس کا دستہ معہ میان کے ایک حصّہ کے مرصّع بہ الماس ہے۔

خزینہ کے تین کمرے ہیں۔ مگر سب سے قیمتی چیزیں اسی پہلے کمرے اور اسکی گیلری میں رکھی ہیں۔ دُوسرے کمرے میں نیچے رُوما۔ یونان۔ عرب اور روم کے سکوں کا ایک بہت بڑا مجموعہ ہے۔ اور اوپر سلاطین کے لباس کے نمونے ہیں۔ سلطان محمد فاتح کے زمانے سے لیکر سلطان محمُود مصلح کے زمانے تک سب سلاطین کے لباس اور اُن کے تغیر و تبدّل یہاں نظر آسکتے ہیں۔ اگر نہیں نظر آسکتے تو اُن کے چہرے۔ کیونکہ کپڑے کے بُت بنا کر انہیں شاہانہ لباس پہنا دیا گیا ہے اور اُن کے

مُنہہ نہیں بنائے گئے۔ بلکہ بجائے اس کے بڑے بڑے عمامے اُس حصّے کو جہاں مُنہہ ہوتے چھپائے ہوئے ہیں۔ یہ لباس اصلی بتائے جاتے ہیں اور نقّادوں کا خیال ہے کہ اگر سب نہیں تو ان میں سے بعض لباس ضرور وہی ہیں جو فی الواقع اُن سلاطین نے پہنے۔ ہر عمامے پر ایک کلغی ہے جو بیش بہا جواہر سے مرصع ہے اور ہر کمر بند میں ایک خنجر بندھا ہے۔ جس کا جڑاو دستہ ایک سے ایک اعلیٰ اور صنعت کے اعتبار سے نادر ہے۔ اب یہ سب صورتیں خواب و خیال ہو گئیں۔ کبھی کبھی غربا میں کوئی پُرانی وضع کا ترک وہ لباس پہنے ہوئے نظر آتا ہے۔ جس سے اِن سلاطین کے عہد میں امیر و غریب سب ناز کرتے ہونگے۔ کہ شاہی فیشن تھا۔ اب نیا زمانہ۔ نئے فیشن۔

تیسرے کمرہ کا بیشتر حصّہ اُن تحائف سے پُر ہے جو مختلف ملکوں کے تاجداروں نے وقتاً فوقتاً سلاطین عثمانی کو بھیجے۔ یورپی تحفوں میں یہ بات شروع سے نظر آرہی ہے کہ کم خرچ بالا نشیں۔ کوئی گھڑی بھیجدی۔ کوئی بندوق بھیجدی۔ اپنی صنعت کا نمونہ دکھا دیا۔ "کُلُّ جَدِیدٍ لَذِیذٌ" کے لحاظ سے تحفے کی قدر بھی ہو گئی اور گرہ سے روپے بھی بہت نہ گئے۔ اس کمرہ میں خُلفائے بغداد کی بڑی بڑی تصویریں پُرانے وقتوں کی بنی ہوئی اور چند تصویریں سلاطین کی بھی تھیں۔ مگر افسوس کہ ہمیں پُرانی تصویروں کے نام علیحدہ علیحدہ نہ معلوم ہو سکے۔

خزینے سے نکلکر ہم دیوان خانے میں آئے۔ یہ سلیمانِ اوّل کے عہد کی یادگار ہے۔ یہاں وزیرِ اعظم بیٹھ کر مقدمات سُنا کرتے تھے اور سلطان سفرائے دُوَل سے ملاقات کرتے تھے۔ اس کمرہ میں ایک پانی کی ٹونٹی دیکھ کر ہم کسی قدر متعجب ہوئے

مگر جو حضرات ساتھ تھے ۔ اُن میں سے ایک نے بتایا ۔ کہ جب سلطان کسی سفیر سے باتیں کرتے تھے تو یہ ٹونٹی کھول دی جاتی تھی ۔ تاکہ اس کے شور سے آواز باہر نہ سُنائی دے اور کوئی شخص دروازہ پر کھڑا ہو کر کوئی سیاسی راز نہ معلوم کر لے ۔

اس کے بعد کُتب خانہ دیکھا ۔ یہ سلطان احمد ثالث کے وقت کا ہے اور اس میں کوئی تین ہزار عربی فارسی اور تُرکی کتابوں کے قلمی نسخے ہیں ۔ یہاں سلاطین کا ایک مرقع تصاویر بھی رکھا ہے اور قسطنطنیہ کی بعض دوکانوں میں جو پُرانے سلاطین کی تصاویر بکتی ہیں ۔ اُن میں سے اکثر اسی مرقع سے نقل کی گئی ہیں ۔

کُتب خانے کے بعد ہمیں بغداد کوشک دکھایا گیا ۔ بالکل مشرقی رنگ کی چیز ہے اور سامانِ آرائش تک مشرقی ہے ۔ باسفور کا نظارہ اس کوشک سے بہت لاجواب ہے ۔ اس کے دروازہ پر ایک فارسی شعر لکھا ہے جسے پڑھ کر بیساختہ دِل نے "آمین" ! کہا ۔ وہ شعر یہ ہے ؎

کشادہ باد بہ دولت ہمیشہ ایں درگاہ
بحقِ اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ

سُلطان مراد رابع نے اس کوشک کو فتح بغداد کے بعد آ کر بنایا ۔ کیونکہ وہاں اُنہوں نے اسی نمونے کا ایک شاہی مکان دیکھا تھا ۔ جو انہیں بہت پسند آیا اور انہوں نے عہد کیا کہ اپنے دارالخلافہ میں ایسا ہی تیار کرائینگے ۔

بغداد کوشک کے قریب مجیدیہ کوشک ہے ۔ یہ ایک جدید عمارت ہے ۔ اس میں عموماً اُن لوگوں کی جنہیں یہ محل دیکھنے کی اجازت دی جاتی ہے بطور مہمانِ سُلطانی خاطر تواضع کی جاتی ہے ۔ خادم پُرانے ڈھنگ سے قہوہ اور تُرکی مٹھائی

اور نفیس گلقند لاکر پیش کرتے ہیں۔ اور مہمان تھوڑی دیر آرام لیکر عنایاتِ شاہی کا شکریۂ ادا کرکے رخصت ہوتے ہیں۔ ہم نے بھی مجیدیہ کوشک مین بیٹھ کر تھوڑی دیر پانی کا نظارہ دیکھا او مٹھائی کھائی۔ آخر اظہارِ تشکّر کرکے اُٹھے اور بُوڑھے خزینہ دار اور اُن کے ملازمین نے ہم سے رخصت ہوتے وقت نہایت خلوص سے اخوّتِ اسلامی کا اظہار کیا ٭

چشمۂ سلطان احمد

چشمۂ قیصر ولیم - امپراطور جرمنی

چشمۂ سلطان احمد

چشمۂ امپراطور ولیم

سرائے قدیم کے بابِ ہمایوں کے مقابل ایک چھوٹی سی مگر نہایت خوبصورت عمارت ہی۔ جو سلطان احمد ثالث کی یادگار ہے۔ اسے چشمۂ سلطان احمد کہتے ہیں۔ چشمے اور سبیلیں اسلام کے اُن نشانات میں سے ہیں جو ہر مسافر اور رہگذر کو اس شہر میں بکثرت نظر آتے ہیں۔ اور ظاہر کرتے ہیں کہ یہ بستی ایسے لوگوں کی ہی جن کے ہاں طہارت اور وضو فرائض مذہبی کا رتبہ رکھتے ہیں اور جن کے ہاں پیاسے کو پانی پلانا داخلِ ثواب ہی۔ یہ چشمے عموماً کسی امیر نے اپنی زندگی میں بنوائے ہیں۔ کہ اُس کے بعد خیر جاری کا کام دیں۔ اکثر چشموں پر خوشخط عربی حروف میں "کُلُّ شَیْءٍ حَیٍّ مِّنَ الْمَاءِ" لکھا ہی۔ اور نیک نہاد بانیوں کے نام یا چشمے کی بنا کے تاریخی قطعے بھی دیواروں پر کندہ ہیں۔ اِن کے علاوہ ہر مسجد کے احاطے میں ایک چشمہ ہوتا ہی۔ جس کے چاروں طرف ٹونٹیاں لگی ہوتی ہیں جن سے لوگ وضو کرتے ہیں۔ لیکن جو چشمے خانقاہوں یا مشہور عمارتوں کے قریب یا بڑے بڑے رہگذروں میں بنے ہیں۔ اُن کے ساتھ پانی پلانے کی ایک سبیل بھی ہوتی ہی۔ جس کے گرد ایک پنجرہ لگا ہوتا ہے اور اس کے پیچھے پانی پلانے والا حاضر رہتا ہے اور پانی کے آبخورے بھر بھر کر آئندو روند کے لئے موجود رکھتا ہی۔ بعض سبیلیں سال بھر رواں رہتی ہیں اور

بعض ماہِ رمضان میں کُھلتی ہیں چشمہ سلطان احمد اُن چشموں میں ہی جہاں چشمہ اور سبیل دونو
ہیں۔ مگر جو سال بھر رواں نہیں رہتے۔ اُس پر ایک قطعہ تاریخ تُرکی نظم میں لکھا ہوا ہی۔ جو
اس کے بزرگ مرحوم بانی کی طبع رسا کا نتیجہ ہے۔ عمارت مستطیل ہے اور سفید سنگ مرمر
کی ہی۔ اور جو عبارتیں اس کی زینت ہیں وُہ سُنہری حروف میں سبز اور فیروزی زمین
پر لکھی گئی ہیں۔ تاریخ بنا ۱۱۴۱ھ ہی۔ جس وقت ہم نے اسے دیکھا اُس وقت سبیل جاری
نہ تھی۔ لیکن جس آدمی کا فرض تھا کہ سبیل کے رواں ہونے کے زمانے میں وہاں موجود
رہے۔ وُہ حاضر تھا اور بوجہ فرصت دو چار شاگردوں کو قرآن مجید پڑھا رہا تھا ہمیں
پہلے لڑکوں کی قرآن خوانی کی آواز نے ہی خیال دلایا۔ کہ اس عمارت کے اندر جائیں۔
ورنہ سمجھتے کہ دروازہ بند ہوگا۔ دروازہ کھٹکھٹا کر ہم اندر گئے تو دیکھا کہ ایک غریب مُلّا
بچّوں کو پڑھا رہا ہے۔ وُہ بیچارے ہمارے جانے سے کسی قدر گھبرائے۔ کیونکہ انہیں
اپنے چھوٹے سے مدرسہ میں معائنے اور امتحان کی عادت نہ تھی اور ہم نے جا کر پُوچھنا
شروع کیا کہ کیا پڑھتے ہو اور کب سے پڑھتے ہو۔ مگر خیر جلد اُستاد شاگرد ہم سے
آشنا ہو گئے اور بے تکلف بات چیت کرنے لگے۔

اور چشمے بھی کم و بیش اسی وضع کے ہیں۔ لیکن سیّاحوں کا اس رائے پر اتفاق
ہے۔ کہ چشمہ سلطان احمد سے زیادہ خوبصورت چشمہ قسطنطنیہ میں نہیں۔ اِس لئے دوسرے
مشہور چشموں کے نام ہی لکھ دینے کافی ہیں۔ چشمہ توپ خانہ۔ چشمہ زینب سلطان۔
صعوق چشمہ۔ سبیل محمود ثانی۔ سبیل عبدالحمید اوّل۔ اور سبیل بنی والدہ سلطان۔

ایک نیا چشمہ البتہ خصوصیت سے قابلِ ذکر ہے۔ یعنی چشمہ ولیم۔ امپراطور ولیم
کے سلطان المعظم کی مُلاقات کے لئے قسطنطنیہ آنے کی یادگار ہے اور اُسی کے نام

سے مشہور ہے۔ یہ چشمہ سلطان احمد سے بہت دور نہیں۔ جامع ایا صوفیہ کے قریب جو پرانا میدان ہے۔ جس میں قیصروں کے عہد میں گھوڑ دوڑ اور دیگر تماشے ہوتے تھے اور جسے اُس زمانہ میں "ہیپوڈروم" اور اب "اَت میدان" کہتے ہیں۔ اُس میں امپراطور جرمنی کی یہ نشانی گڑی ہے۔ کہتے ہیں۔ اُس نے خاص طور پر یہ خواہش ظاہر کی تھی۔ کہ اُس کا بھی ایک چشمہ اس شہر میں ہو۔ اس چشمے کی عمارت طرزِ جدید و قدیم کا مجموعہ ہے۔ گو جدید رنگ اس میں غالب ہے۔ اس کے اوپر بھی دوسرے چشموں کی طرح ترکی اشعار ترکی حروف میں لکھے ہیں۔ مگر چشمہ ایسی جگہ بنا ہے کہ سوائے اس کے کہ تماشائی اسے دیکھنے جائیں اور اس پر اپنے نام لکھ کر اس کی دیواروں کی خوبصورتی میں خلل ڈالیں۔ اس سے اور کوئی کام نہیں لیا جاتا۔ اور اس کی سبیل رواں نہیں ہے۔ کسی اور مقام پر بنتا تو شاید زیادہ مفید ہوتا۔ لیکن امپراطور نے ایا صوفیہ کے سامنے اپنا نقشِ قدم چھوڑنا چاہا۔ یہ اس کی اُن ذو معنی حکمت عملیوں میں سے ہے جن سے وہ یورپ بھر میں محسود اقران بنا ہوا ہے۔ بظاہر تو اُس نے اس خواہش کے اظہار اور اس یادگار کے ذریعے سے اپنی بے تعصبی اور سلطان المعظم سے اپنی دوستی کا ثبوت دیا۔ لیکن سوچنے والے اس میں اور معنی بھی دیکھ سکتے ہیں۔ ایا صوفیہ کے سامنے ایک عیسائی تاجدار کا اپنا نشان چھوڑنا اس کے جوشِ عیسوی پر دلالت کرتا ہے اور جو کام بوجہ ایا صوفیہ اور قسطنطنیہ پر مسلمانوں کے قابض ہونے کے کوئی اور عیسائی تاجدار نہ کر سکتا۔ وہ یہ مدبر اپنے حسنِ تدبیر سے کر گیا۔

سلطان المعظم سے امپراطور کی دوستی۔ اور اس کی مشہور موافق اسلام تقریر کے سوا اس کے بعض تازہ سیاسی افعال سے یورپ کے اکثر اخبار نویسوں نے خصوصاً فرانس اور انگلستان میں یہ نتیجہ نکالا ہے۔ کہ وہ اصل میں پکا عیسائی نہیں اور مسلمانوں کا بڑا

رفیق اور اُن کی پولٹیکل ہستی کا محافظ ہے۔ اور اس لئے اُسے ہر بہانے سے ہزاروں گالیاں دیتے ہیں اور مسلمانوں میں اگر دنیا کے کسی حصے میں کسی جوش یا حرکت کے آثار نظر آئیں تو انہیں امپراطور ولیم کی غلطیوں اور نامناسب حکمتِ عملی کا نتیجہ بتلاتے ہیں۔ اور اسی طرح بعض مسلمان بھی اسے درحقیقت حامئ اسلام سمجھتے ہیں۔ امپراطور ان دونوں طبقوں کے خیالات سُن سُن کر دل ہی دل میں ہنستا ہوگا اور کہتا ہوگا

اے کاش کسے ہر آنچہ ہستم داند

یورپ میں اسلام کی نسبت سینکڑوں برس سے ایسی بے بنیاد خبریں پھیلائی گئی ہیں اور اس قدر غلط بیانیاں دانستہ و نادانستہ کی گئیں ہیں۔ کہ اوّل تو وہاں کسی کا دلی خیر خواہِ اسلام ہونا بہت مشکل ہے۔ اور اگر کوئی ہو بھی تو اس کے لئے اپنے دلی خیالات کا اظہار آسان نہیں۔ تاجداروں کے لئے اور بھی زیادہ مشکلات ہیں۔ وہ دل میں چاہے کچھ خیالات رکھتے ہوں۔ جانتے ہیں کہ ساری رعایا عیسائیت کی نام لیوا ہے۔ اور وہ بغیر اپنے آپ کو معرضِ خطر میں ڈالنے کے اسلام کی کوئی معاونت نہیں کر سکتے۔ ہاں کبھی حکمتِ عملی کا ایسا ہی تقاضا ہو اور اپنے ملک کے لئے کسی معقول فائدہ کی اُمید ہو تو زبانی جمع خرچ کے لئے کیا خواص کیا عوام سب حاضر ہیں اور جلبِ منفعت کے لئے یورپ کا جدید ضابطۂ اخلاق ہر طرح کی نادرستی ہائے مصلحت آمیز کی اجازت دیتا ہے۔ ابھی بہت دن نہیں ہوئے کہ انگلستان میں اور دولتِ عثمانیہ میں گہری دوستی تھی۔ ہندوستان میں جب انگریزی عملداری نئی نئی تھی۔ اور رُوس و رُوم کی لڑائی میں انگریز رُوم کے مُعاون تھے۔ اُس وقت خود انگریز افسروں نے عثمانیوں کی امداد کے لئے ہندوستان

یں چندہ کرایا۔ اور اُس زمانے کے انگریز مُدبّر اور مضمون نگار سلطان المعظم کی خلافت کے
سب سے بڑے مُوید تھے۔ اب وُہ پالیسی بدل گئی اور آج جرمنی کی باری ہے۔ ایشیائی
روم میں ریل بنانے کا حق جرمنی نے نہایت ہی رعائتی شرائط پر حاصل کر لیا ہے اور
خود دارالخلافہ میں جرمنی کے لوگ طرح طرح کے فواید اُٹھا رہے ہیں۔ دولتِ عثمانیہ
ھی کیا کرے۔ یورپ میں اکیلی اسلامی سلطنت ہے۔ باقی سب قومیں عیسائی ہیں۔
یک آدھ سے بنائے رکھتی ہے اور ع زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بہ ساز۔ پر عمل
رکے دن کاٹتی ہے۔ ورنہ دوستی جو اہل یورپ اُس سے کر سکتے ہیں ہویدا ہے۔
ہی بنا پر میں چشمۂ امپراطور ولیم کو نشانِ دوستی کی بجائے نشانِ زمانہ سازی سمجھتا
وں۔ گو اس کی ایک خصوصیّت قابل داد ہے۔ تقلید رسمِ اسلامی اس میں دکھائی
ی ہے اور اس میں پانی موجود ہے مگر بے فیض۔ گویا یہ اہلِ یورپ کی طبع سیال
سے خوب مشابہت رکھتا ہے۔ کہ جہاں جائیں وہیں کے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں۔
ر وہیں کے خیالات او وضع کے مطابق ایسی باتیں کرتے ہیں۔ جن سے اہل مُلک کے
ل ہاتھ میں آ جائیں۔ اسٹانبول میں چشموں کا رواج دیکھا تو امپراطور نے بھی چشمہ ہی کو
ی بہترین یادگار قرار دیا+

ات میدان

ات میدان اب صرف زمین کا ایک بڑا قطعہ رہ گیا ہے۔ جس میں دو ایک پرانے مینار استادہ ہیں اور قریب قریب غیر آباد پڑا ہے۔ مگر عہد بازنطائن کے قسطنطنیہ کی رونق دیکھنے کے لئے چشمِ تصوّر اس سے بہتر جگہ نہیں تلاش کر سکتی۔ اس میدان میں کھڑے ہو کر ذرا آنکھ بند کیجیے۔ اور تاریخ میں جو حالات عہد بازنطائن کے پڑھے ہوں اُن کا نقشہ آنکھوں کے روبرو آنے دیجیے۔ موجودہ "ات میدان" سے بہت زیادہ وسیع ایک مستقل قطعہ زمین ہے۔ جس کے ایک طرف نصف دائرہ کی صورت بنی ہے۔ طرزِ تعمیر رُوما کے بڑے سرکس کی نقل ہے۔ تماشائی زن و مرد بکثرت جمع ہیں۔ دوسری طرف ایک چھوٹا سا گرجا ہے۔ اس کے دریچوں میں شاہی محلات کی خواتین ہیں۔ گرجے کے قریب گھوڑوں اور گاڑیوں کے کھڑے ہونے کی جگہ بنی ہے۔ اور اس جگہ کے اُوپر قیصر کے بیٹھنے کا مقام ہے۔ جس میں داخل ہونے کے لئے محل سے ایک تہ زمینی رستہ ہے۔ اس تماشاگاہ کا نام ہپوڈروم ہے۔ مستطیل کے دونوں طرف تیس چالیس قطاریں سنگ مرمر کی سیڑھیوں کی ہیں۔ جو تماشائیوں کے بیٹھنے کے لئے ہیں۔ جہاں سیڑھیاں ختم ہوتی ہیں۔ وہاں ایک چوڑا راستہ بنا ہے۔ جس پر تماشائیوں میں سے بعض ٹہل رہے ہیں اور فنِ سنگتراشی کے عمدہ عمدہ نمونے دیکھ رہے ہیں۔ غرض مجمع کیا ہے ایک میلا ہے۔ سب اپنے اپنے حلقۂ احباب میں ہنس بول رہے ہیں۔ عجب چہل پہل ہے۔ اتنے میں کچھ نگاہیں بیتابانہ میدان کے ایک گوشے کی طرف متوجہ

ہُوئیں۔ وہاں کیا ہے؟ گاڑیاں دَوڑنے کو ہیں اور قطار باندھ کر کھڑی ہو رہی ہیں مجمع میں خاموشی پھیل گئی۔ جیسے کسی کا انتظار ہو۔ معلوم ہُوا قیصر دوڑ دیکھنے کے لئے آرہے ہیں۔ اُن کا اپنے بلند دریچے میں جلوہ گر ہونا از سرِ نو شور کا متقاضی ہُوا۔ سب بُلند آواز سے اُن کا نام پکار رہے ہیں اور نعرہ ہائے خوشی بلند کر رہے ہیں۔ تھوڑی دیر میں پھر چُپ چاپ۔ پھر وُہی خموشی وُہی اِنتظار۔ اِتنے میں اشارہ ہُوا کہ دَوڑ شروع ہو۔ گاڑیاں چلیں۔ میدان کے قریب زنداں کی عمارت ہے۔ اِس کے گرد کا چکّر ان گاڑیوں کی دَوڑ کے لئے مقرر ہے۔ سات دفعہ گھومنے میں جو گاڑی بڑھ جائے وُہ بازی لے گئی۔ ہر چکّر میں پہلے سے زیادہ رفتار تیز ہوتی جاتی ہے۔ آخر گاڑیاں یہانتک تیز چلتی ہیں کہ علیحدہ علیحدہ نظر مشکل سے آتی ہیں۔ گویا ایک بڑا گول چرخ ہے جو خود بخود گھُوم رہا۔ ایلو۔ وُہ رفتار کم ہُوئی۔ ایک گاڑی کا سوار اسے خوشی سے دَوڑاتا ہُوا میدان کی طرف بڑھا آتا ہے۔ یہ جیتنے والا ہے جو بادشاہ سے اِنعام اور ہجومِ عوام سے داد لینے آیا ہے۔ اور عوام اُچھل اُچھل کر اور کُود کُود کر اسے داد دے رہے ہیں۔ ایک گاڑی اُس دیوانہ وار دوڑ میں دُوسری سے ٹکرا ہی گئی۔ اس کا پہیہ ٹوٹ گیا اور سوار لُڑک کر باہر جا گرا۔ ٹُوٹی ہُوئی گاڑی اور گرے ہُوئے سوار کو بھی کشاں کشاں اس طرف لا رہے ہیں۔ اور تماشائی اُنہیں دیکھ کر بیحد ہنس رہے ہیں اور خوشی سے پھُولے نہیں سماتے۔ کہ یہ نظارہ ساری دَوڑ میں مزے کا رہا۔ کوئی مرے کوئی جیئے۔ کوئی جیتے کوئی ہارے۔ اُنہیں اپنی دِل لگی سے کام ہے۔ آئے دو گھڑی جی بہلا گئے۔

لیجئے یہ تماشا ختم ہُوا۔ تصوّر کے جادوگر نے تماشے کا پردہ بدل دیا۔ وُہی ہجوم

ہے۔ وُہی ہنگامہ۔ مگر قیصر اپنے دریچے میں رونق افروز نہیں۔ لوگوں کا جماؤ تو زور کا ہے۔ مگر آج کسی قدر متانت کے آثار ہیں۔ یہ کیا معاملہ ہے؟ لتنے میں دو بدقسمت پابزنجیر نظر آتے ہیں۔ انہیں چار جلّاد گھسیٹے ہُوئے لا رہے ہیں۔ ساتھ تلواروں کا پہرہ ہے۔ میدان کے عین وسط میں ایک سُولی گڑی ہے۔ اور اس کے قریب لکڑیوں کا ایک بڑا انبار ہے۔ لکڑیوں کے انبار کو آگ لگائی گئی۔ دُھواں اُٹھکر آسمان کو جانے لگا۔ تماشائی دم بخود دیکھ رہے ہیں۔ کہ اب کیا ہوتا ہے۔ سُولی کے قریب ایک شامت کا مارا ہراساں کھڑا ہے اور دُوسرا آگ کے قریب لاکر کھڑا کر دیا گیا ہے۔ اُس کا چہرہ زرد ہے۔ مگر وُہ بے اعتنائی سے سر جُھکائے ہُوئے ہے۔ گویا اسے خبر ہی نہیں کہ وُہ کہاں ہے اور اس کے گرد مجمع کیسا ہے۔ اِس لئے اس کو دیکھ کر یہ پتہ چلانا مشکل ہے کہ اس کے دِل پر کیا گُذر رہی ہے۔ لو وُہ آگ کے شعلے اس کی طرف بڑھ بڑھ کر اپنی خوفناک اور مہیب زبانیں اسے دکھانے لگے۔ سب سے بڑا شعلہ اوپر کو اُٹھ رہا ہے۔ گویا ایک جلتی ہُوئی تلوار ہے۔ جو کسی کی جان لئے بغیر نہ رہیگی۔ ایک افسر گھوڑے پر سوار میدان میں نکلا۔ اُس نے خونی لباس والے جلّادوں کو اُنگلی سے اشارہ کیا کہ وقت ہے۔ دو مضبُوط کڑیل جوانوں نے تسلیم و رضا اور اِستقلال کی اُس سرنگوں تصویر کو جو آگ کے قریب کھڑی تھی۔ ڈھکیل کر آگ کے حوالے کر دیا۔ ایک آخری دلگداز آہ! اور اِردگِرد کے بے حِس گروہ کی ایک مہیب چیخ! اس بات کا اِعلان تھا کہ وُہ جیتی جاگتی ہستی راکھ کا ڈھیر ہو گئی ؎

پھر نہ دیکھا کچھ بجز اِک شعلۂ پُر پیچ و تاب
شمع تک تو ہم نے بھی دیکھا کہ پروانہ گیا

معلوم ہوا کہ یہ دُھن کا پکا شہید عقیدت تھا۔ اس کے عقائد چونکہ معتقداتِ عامّہ کے خلاف تھے۔ پادریوں نے حکم دیا کہ اسے آگ میں جلا دیا جائے۔ جب یہ زندہ ایندھن آگ میں جھونکا گیا۔ تو ایک سیاہ دُھواں اُٹھا جس سے مطلع غبار آلود ہو گیا۔ دھوئیں کے سبب یہ نظر نہ آسکا۔ کہ دُوسرے قیدی کا کیا حشر ہوا۔ ذرا ہوا صاف ہوئی تو سُولی پر ایک جسم لٹکتا ہوا نظر آیا۔ جس کا کام چند دقیقے ہوئے تمام ہو چکا تھا۔ یہ بیچارہ ایک سیاسی مجرم تھا۔

اِس سین پر بھی پردہ گرا۔ اب کیا دیکھتے ہیں کہ مجمع پہلے موقعوں سے بھی زیادہ ہے۔ لوگ ہمہ تن گوش کھڑے ہیں۔ کسی اعلانِ عام کے منتظر ہیں۔ ایک افسر سرکاری شاندار وردی پہنے محل سے نکلا۔ اِس کے آگے پیچھے اور اہلکار اپنی اپنی وردیاں ڈانٹے آرہے ہیں۔ ایک بلند چبوترے پر سب آکر کھڑے ہُوئے۔ اور سب سے بڑے افسر نے بڑھ کر ایک اعلان پڑھنا شروع کیا۔ یہ اعلان ایک نئے قیصر کی آمد کی خبر دیتا ہے۔ پہلا قیصر منزلِ ہستی طے کر کے وہیں جا پہنچا۔ جہاں اس کے کئی فریادیوں اور دادخواہوں کی روحیں اس سے پہلے موجود تھیں اور جہاں ”شریروں کی شرارت ختم ہو جاتی ہے اور سفرِ دُنیا کے تھکے ماندے آرام کرتے ہیں“۔ دُوسرا قیصر اس کی جگہ تخت نشین ہوا۔ اہلِ دربار نئے بادشاہ کی خوشامد کرنے کو ویسے ہی مستعد ہیں۔ جیسے پُرانے کے لئے تھے اور اس کے احکام کی خواہ وہ بجا ہوں خواہ بیجا ویسی ہی اطاعت کرنے کو تیار ہیں۔ گروہِ عوام گھوڑ دوڑ کے دن اس کی آمد آمد پر ایسا ہی اُچھلے کودے گا جیسا اس سے پہلے اُچھلتا تھا۔ اور یہ اپنے آپ کو اسی طرح مختارِ کل سمجھیگا۔ جس طرح وُہ سمجھتا تھا جواب بے اِختیار ہے۔ عبرت! عبرت! اگر اِنسان

کو چشمِ عبرت ہوتی تو وُہ اُن بیشمار غلطیوں سے بچ جاتا جن کے تذکروں سے اوراقِ تاریخ سیاہ ہیں۔

اِس تماشے کے سین کہانتک دیکھیں۔ کون جانتا ہی کہ اس قطعۂ زمین پر کیا کیا واقعات عہدِ بازنطائن میں گذرے۔ ہم نے اُن کے چند نمونے جو دیکھ لئے وُہ کافی ہیں۔ صدیاں اسی طرح گذر گئیں۔ آخر زمانے نے کروٹ بدلی۔ نظر آیا کہ نہ وہ ہپوڈروم ہے۔ نہ وُہ گھوڑ دوڑ۔ نہ وُہ مذہب کے نام پر لوگوں کو آگ میں ڈھکیلنا ہے نہ وُہ ایک قیصر کے بعد دوسرے قیصر کا آنا۔ بالکل کایا پلٹ ہی۔ ہپوڈروم کا نام اب "ات میدان" ہے اور اس میں تُرک سوار اپنی نیزہ بازی کے جوہر دکھارہے ہیں اور "جرید" کھیل رہے ہیں۔ کچھ مدت اس حالت میں گذری۔ مگر زمانے کو قرار کہاں۔ وُہی ترک ہیں اور وُہی اُن کی حکومت۔ لیکن "جرید" اور دیگر مردانہ ورزشوں کے وُہ چرچے نہیں۔ جو لباس پرانے "جرید" کھیلنے والوں کے تھے۔ اُن لباسوں کے پہننے والے بُت بنکر ایک عجایب خانے میں جا بیٹھے۔ جو پرانے ہیپوڈروم کے جنوب مغربی حصے میں بنا ہُوا ہے۔ ینی چری فوج کی سب سے بڑی بغاوت جو ۱۸۲۶ء میں سُلطان محمود ثانی کے زمانے میں ہُوئی تھی اور کُشت و خُون کے بعد فرو ہُوئی تھی۔ اسی "ات میدان" کا واقعہ ہے۔ اب ہپوڈروم کی کچھ زمین ایک مکتبِ صنائع اور دفترِ زراعت نے گھیر لی۔ ایک طرف کو جیلخانہ بن گیا۔ دوسری طرف کچھ اَور سرکاری عمارتیں بن گئیں۔ ایک گوشے میں امپراطور ولیم اپنا یادگاری چشمہ بنوا گئے اور عہدِ قدیم کی یادگار صرف دو پُرانے مینار رہ گئے۔ جن کی تاریخ سے "الطیق" پسند طبائع کے سوا اب کسی کو دلچسپی نہیں۔

ان میناروں میں ایک مصری مینار ہے جو ساٹھ فٹ بلند ہے۔ طیودوسیوس نے اسے یہاں رکھوایا تھا۔ اس کے اُوپر ہیوڈروم کے بعض سین کندہ ہیں۔ دُوسرا مینار "اژدہا مینار" کے نام سے مشہور ہے۔ اس کی بلندی کوئی بیس فٹ ہی۔ پیتل کے تین اژدہا ایک دُوسرے کے گرد لپٹے ہُوئے ہیں۔ جن کی دُم نیچے اور منہ اوپر کو بنے ہیں۔ یہ مینار بہت پُرانا ہے ۴۷۹ سنہ قبل مسیح میں جب یونانیوں نے ایرانیوں کے حملے سے نجات پائی تو منجملہ اَور یادگاروں کے یہ مینار بنوایا تھا اور ڈلفی کے مشہور مندر میں رکھوایا تھا۔ تینوں سانپوں کے سر کٹ چکے ہیں۔ مگر اس شکستہ حالت میں بھی یہ مینار آج سے دو ہزار چار سو برس پہلے کے واقعات یاد دلا رہا ہے +

عجایب خانہ ینی چری

اَت میدان کے جنوب مغرب میں یہ عجائب خانہ ہے۔ جہاں اَت میدان کے پُرانے شہسوار بت بنکر جا بیٹھے ہیں۔ گویا حوادثِ زمانہ سے پناہ گزین ہیں۔ یہ عجائب خانہ اصل میں پُرانے لباسوں کی نمائش ہی جس سے معلوم ہوتا ہی کہ آج سے سو برس پہلے تک تُرکوں کا لباس کیسا تھا اور اس میں گذشتہ صدی میں کس قدر انقلاب ہُوا ہی۔ یہ بُت مٹّی کے ہیں۔ جنہیں قدیم لباس پہنا دیئے گئے ہیں۔ مگر رنگ و روغن میں کاریگروں نے اپنی صنّاعی کے جوہر دکھائے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ عجائب خانہ ینی چری فوج کے اقتدار کے زمانے کی بولتی ہُوئی تصویر ہے۔ بعض صُورتیں تو ایسی زندہ نما بنی ہیں۔ کہ انہیں دیکھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابھی بولا چاہتی ہیں۔ یورپ کے سیّاح اس عجائب خانے کو بڑے شوق سے دیکھنے آتے ہیں۔ کیونکہ یہ لباس اور کہیں نظر نہیں آسکتے۔ اور تُرکوں کے پُرانے تمدّن کا اندازہ لگانے کے لئے ان بُتوں کے فوٹو لے جاتے ہیں۔ وُہ ان مٹّی کی مورتوں کی بہت تعریف نہیں کرتے۔ کیونکہ انکی نگاہوں میں لنڈن اور پیرس کے موم کے بنے ہُوئے بُت سمائے ہُوئے ہیں جن میں موجودہ زمانے کی ترقی فنون کی بدولت ہنرمندوں نے جان ڈالنے میں تھوڑی ہی کسر رکھی ہی۔ موم کے بتوں کے اندر گھڑی کے سے پُرزے لگا کر جب انکی کل کو کوک دیتے ہیں تو مجسمہ میں تنفّس کی سی حرکت پیدا ہو جاتی ہی۔ مگر انہیں یہ یاد رکھنا چاہئے۔ کہ عجائب خانہ ینی چری موم کے مجسموں کی نمائش سے پُرانا ہی اور بہ حیثیتِ مجموعی

شیخ الاسلام

بیحد غنیمت ہے۔

اس عجائب خانہ کا داخلہ بذریعہ ٹکٹ ہی جو دروازہ پر بہت تھوڑی قیمت پر ملسکتا ہی۔ اور خاص و عام کو اسے دیکھنے کی اجازت ہی۔ ایک سو کے قریب بُت اُس میں رکھے ہیں جو پندرہ "گروپ" میں منقسم ہیں۔ ہم ترتیب وار انہیں دیکھنا شروع کرتے ہیں۔

۱۔ اس میں حرم شاہی کے خواجہ سراؤں کا افسر۔ اور باشں مابینجی موجود ہیں اور ان کے علاوہ چند بونے اور دیگر خدّام ہیں۔ خدّامِ حرم میں کچھ بونے رکھنا ترکی بادشاہوں کا ایک پُرانا دستور ہے۔

۲۔ دو فوجی افسر۔ فوجی مطبخ کا باورچی۔ اور سقا۔

۳۔ امیرالبحر و ناظر صیغہ بحریہ۔ ترجمانِ وزارت۔ اور دیگر بحری افسران۔

۴۔ ینی چری فوج کا کمان افسر۔ شاہی تیغ بردار۔ میر تشریفات اور شاہی گارد کے سپاہی

۵۔ ناظر صیغہ خارجیہ اور اس کا معین۔ بابِ عالی کا مفتی۔ سفیرِ عثمانی کا اردلی۔ ہرکارہ اور سارجنٹ متعینہ بابِ عالی۔

۶۔ ناظر صیغہ داخلیہ۔ باش کاتب۔ میر جلوس وکلا۔ اردلی وغیرہ۔

۷۔ شیخ الاسلام۔ قاضی عسکر روم ایلی۔ افسر عمامہ داران سبزپوش۔ قاضی استنبول قاضی مکہ معظمہ۔ سرادیبِ مکاتب عثمانیہ۔ موذن۔ اردلی۔

۸۔ صدرِ اعظم۔ افسر متعینہ محلات۔ افسر دربانان۔ کاتبِ ثانی۔ سائیس۔ اردلی۔

۹۔ معینِ وزارت و دیگر اہلکارانِ محکمہ وزارت۔

۱۰۔ رئیس بلدہ۔ افسر محکمہ جاسوسی۔ افسرِ خفیہ پولیس وغیرہ۔

۱۱۔ نائب مہتمم توپ خانہ و دیگر اہلکاران توپ خانہ۔

۱۲- خزانچی باشی - مہتمم ٹکسال وغیرہ-

۱۳- توپچی - علم بردار - گارد - ینی چری سپاہی-

۱۴- جلّاد - مددگارِ جلّاد وغیرہ-

۱۵- عہدِ سلطان سلیم کی اصلاح شدہ فوج کے افسر اور سپاہی سلطان محمود کے وقت کے سوار اور پیادے-

اِن لوگوں میں اکثر بڑے بڑے عمامے باندھے ہوئے ہیں گو عمّاموں کی بندش میں ہر عہد میں کسی قدر تفاوت نظر آتا ہے - اِن عمّاموں میں بعض پٹھانوں کے قدیم عمّاموں سے جو پنجاب کے چند شہروں میں کہیں کہیں اب بھی نظر آتے ہیں - بہت مشابہ ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم وسط ایشیا کی یہ وضع ہوگی - ادھر کچھ مغل کچھ پٹھان اسے ہندوستان لے آئے اور اُدھر تُرک اسے سرزمین یورپ میں لے گئے - جب یہ خیال ہوتا ہے کہ انھوں نے صدہا سال تک باوجود یورپ کی ہمسائگی اور اہلِ یورپ سے معاملہ پڑنے کے اس وضع کو نہائیت وفاداری سے نباہا - تو حیرت ہوتی ہے - صرف عمّامہ اور لمبے تاتاری چوغوں پر اکتفا نہ کر کے شلوار تک کو تُرکوں نے مدت تک بحال رکھا اور جن تُرکوں کی دلیری کی یورپ میں ایک عرصہ تک دھاک بندھی رہی - وُہ اسی پُرانی وضع کے لوگ تھے - موجودہ تُرکی لباس گو چُست اور زمانہ کے رواج کے زیادہ مطابق ہے - لیکن اس میں شک نہیں کہ یہ پُرانا لباس زیادہ شاندار تھا -

اِن تصاویر سے ایک اَور بات معلوم ہوتی ہے - کہ داڑھی چٹ کرانے کا رواج تُرکوں میں مُدتوں سے چلا آیا ہے - عجب نہیں کہ وُہ وسط ایشیا سے اس رواج کو
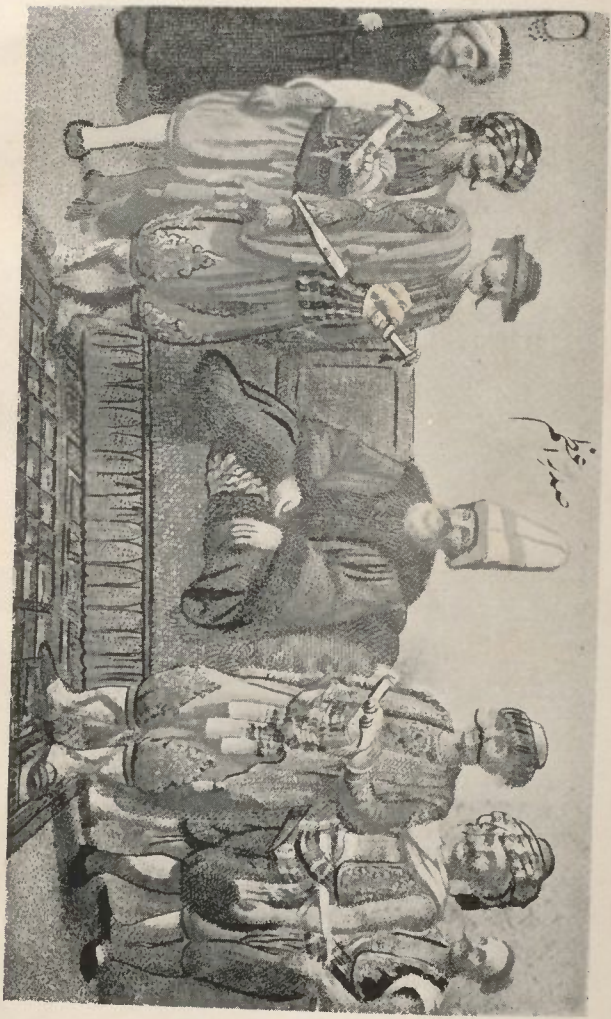
صدرِ اعظم

پنے ساتھ لائے ہوں۔ علماء اور رؤساء تو داڑھی رکھتے تھے اور باقی لوگ اکثر اسے
صاف کرا دیتے تھے۔ خصوصاً فوج کے سپاہی۔ معمولی اہلکار ملازم اور شاگرد پیشہ
ن تصاویر میں داڑھی منڈے نظر آتے ہیں۔ موچھیں بڑی بڑی اور بل کھائی ہوئی
ور داڑھی صاف۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اِن دنوں جو ترکوں میں ایک بڑی تعداد
اڑھی صاف کرانے والوں کی ہے۔ وہ محض یورپ کی تقلید کا اثر نہیں۔ بلکہ بخلاف
ارے اِن کے ہاں کا پرانا رواج بھی اس کی اجازت دیتا ہے۔ مگر معززین میں
اڑھی رکھنے والے اب بھی بکثرت ہیں۔ اور گو داڑھی نہ رکھنے پر بہت اعتراض
ہیں کیا جاتا۔ تاہم داڑھی رکھنا مستحسن سمجھا جاتا ہے۔

یہ عجائب گھر سلطان عبد المجید مرحوم نے قائم کیا تھا اور اس میں لوگوں کی آمد و
فت کا سلسلہ برابر جاری رہتا ہے۔ جب ہم اسے دیکھنے گئے تو کئی ترکی عورتیں
ھی دیکھنے آئی ہوئی تھیں۔ اور ہر گروپ کے مقابل دیر تک کھڑی ہو کر پرانے
مانے کے حالات پر غور کرتی تھیں۔ اور کہیں کہیں اظہارِ استعجاب کرتی تھیں۔
ہ حسبِ دستور فراجہ پہنے ہوئے تھیں۔ مگر تصویروں کو اچھی طرح دیکھنے کے لئے
نہوں نے اپنے سیاہ نقاب اپنے چہروں سے الٹ دیئے تھے۔ اور اُن کو
اجنبی مردوں کے وہاں موجود ہونے سے کچھ گھبراہٹ نہ تھی۔ میں نے جی میں
لہا کہ اگر گذشتہ صدیوں کی بے جان صورتوں میں جنہیں یہ بغور دیکھ رہی تھیں
جان پڑ جائے اور وہ اپنے بعد کی نسلوں کے لباس اور وضع اور رواج کی تبدیلیاں
دیکھیں تو وہ ہرگز باور نہ کریں کہ وہ اپنے وطن میں ہیں۔ استانبول اب وہ نہیں ہے جو
اُس وقت تھا جب موت کی گہری نیند سے ان بہادروں کی آنکھیں مُند گئیں +

جامعِ احمدیہ

عجائب خانہ مینی چیری کے متصل میدان سے مشرق کی طرف ایک عالیشان جامع نظر آتی ہو۔ یہ سلطان احمد اول کی یادگار ہے۔ اس کے چھ مینار ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اس کے نامدار بانی کو عجب مشکل کا سامنا تھا۔ اس نے اس کے لئے جگہ ایسی چنی جو جامع ایا صوفیہ کے قریب تھی۔ اب اس کے قرب وجوار میں کوئی عمارت بنے تو وہ ایسی تو ہو کہ اُس کے سامنے بالکل بے حیثیت نہ معلوم ہو۔ طرّہ اس پر یہ کہ جامع فاتحہ اور جامع سلیمانیہ ایسی شاندار مسجدیں اس سے پہلے شہر کے اور حصوں میں بن چکی تھیں۔ اس لئے سلطان نے میناروں کی تعداد میں اضافہ کرنے سے ایک خوبصورت اثر پیدا کیا۔ استانبول میں لوگ کہتے ہیں کہ اور کہیں چھ مینار کی مسجد اسلامی دُنیا میں اس وقت موجود نہیں۔ مکّہ معظمہ میں تھی۔ مگر سلطان احمد نے وہاں ایک ساتواں مینار بنوا دیا تھا۔ تاکہ اس مقدس مقام کی مسجد کا پاسِ ادب ملحوظ رہے اور کوئی یہ نہ کہے کہ اس کی برابری کی کوشش کی ہے۔

مسجد کے چاروں طرف وسیع احاطہ ہے۔ جس میں بہت سے درخت باعثِ زینت و آبادی ہیں۔ علومِ عربیہ کے درس کے لئے مکاتب۔ طلبہ کے لئے حجرے اور مطبخ۔ حرمِ مسجد کے چاروں طرف بنے ہیں۔ حرم میں داخل ہونے کے لئے ایک خوشنما دروازہ ہے۔ اور مسجد کا دروازہ عین اس کے مقابل ہو۔ طول اور عرض میں مسجد کا اندرونی حصّہ ۲۳۰ × ۲۱۰ فٹ ہوگا۔ مسجد
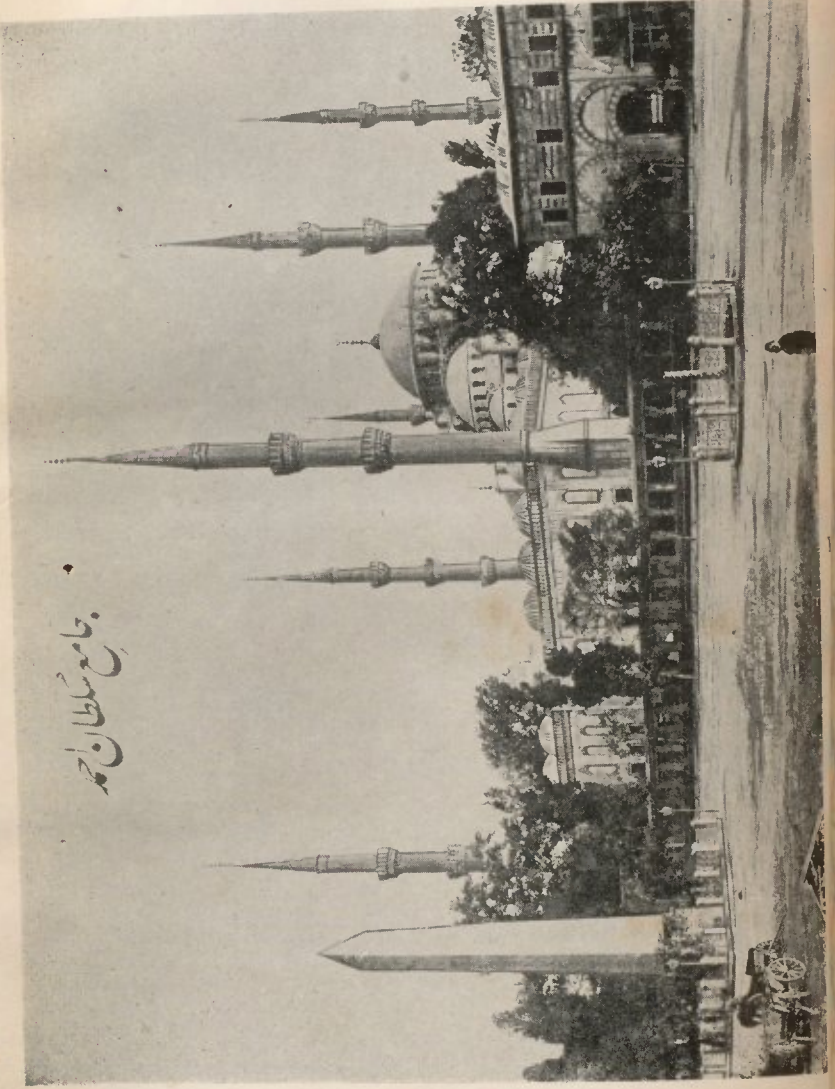
جامعِ سلطان احمد

کے اندر سادگی کے ساتھ جو شان پیدا کی گئی ہے۔ اس کی خوبی کا اندازہ کرنے کے لئے مشرقی نگاہیں جو مساجد کی تعمیر کی خوبیوں سے واقف ہیں یورپ کے سیاحوں سے زیادہ موزوں ہیں۔ یورپ کے سیّاح عموماً گرجاؤں کی ساخت کی خوبیاں مساجد میں ڈھونڈھتے ہیں اور مایوس ہوتے ہیں۔ خصوصاً قسطنطنیہ میں جہاں اتّفاق سے ایا صوفیہ کی عمارت میں وُہ دونوں خوبیاں موجود پاتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہم دو یورپین رائیں جامع احمدیہ کی نسبت نقل کرتے ہیں۔

ایک فرانسیسی سیّاح لکھتا ہے:-

چار بڑے بڑے ستون وسطی گنبد کو سنبھالے ہُوئے ہیں جس کا قُطر چھتیس گز ہے۔ نیلگوں۔ سبز اور سفید روغنی اینٹیں دیواروں کو ڈھانپے ہوئے ہیں۔ جن پر پسندیدہ نقش و نگار ہیں۔ جو قدیم ہندی کپڑوں کے بیل بوٹوں سے نقل کیے گئے۔ یہ نقش و نگار پُرانے عثمانیوں کے بیش قیمت کاموں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ہندوستان کا اثر وسطی ستونوں کی گولائی اور آرائش سے بھی مترشح ہی۔ سُنہری حروف میں آیاتِ قرآنی ان کی نصف بلندی کے قریب لکھی ہُوئی ہیں۔ محراب کے پتّھر نادر اور قیمتی ہیں۔ مشہور ہے کہ اُن میں تبرّکاً کعبہ کے سنگِ اسود کا ایک ٹکڑا بھی لگا ہُوا ہے۔ منبر سنگ مرمر کے کام کا ایک اعلیٰ نمونہ ہی۔ دونوں طرف پیتل کے جھاڑ بڑی بڑی بتّیوں والے ہیں۔ جنوب مشرقی گوشے میں داخل ہوتے ہی بائیں ہاتھ سلاطین کے نماز پڑھنے کی جگہ ہے۔ جو بہت آراستہ ہے۔ چھ فانوس مرصّع بہ زمرّد۔ زنجیر زر سے معلّق ہیں۔ یہ والئی حبش کی طرف سے تحفے کے طور پر آئے تھے۔ قرآن کے

نہایت عمدہ قلمی نسخے خوبصورت رحلوں پر دھرے ہیں۔ اور رحلوں پر سیپ کا ری
دیوار پر درِ کعبہ کا پردہ لٹک رہا ہے۔ کیونکہ ہر سال جو کاروان کعبہ جاتا ہے وُہ پچھلے
سال کا پردہ یہاں لٹکانے کے لئے لے آتا ہے اور نیا پردہ وہاں دے آتا ہے۔
ہر چند کہ یہ مسجد باہر سے بہت شاندار معلوم ہوتی ہے اور اس کے گنبد اور مینار
اسے بہت دلچسپ بناتے ہیں۔ مگر یہ شان زیادہ تر بیرونی ہو اور اس کی وسعت
و دیگر مشتملات کے سبب ہو۔ اندر سے یہ کچھ دیکھنے کے قابل نہیں جس شخص نے
ایا صوفیہ دیکھی ہو اسے اُس کے اندر جانے کی تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں ستون
بہت بھاری ہیں۔ روشنی بھدّی ہے۔ اور بجائے خدا کی عبادت کا مقام معلوم ہونے
کے اس کا بڑا ہال دعوت یا جشن کا ہال معلوم ہوتا ہے۔ تاہم یہاں کے لوگ اسے
بہت بے نظیر مسجد سمجھتے ہیں۔ یہ شاید اُس کے عمدہ موقع کی وجہ ہو۔ کیونکہ استانبول کے
ہر حصے سے یہاں بہ آسانی پہنچ سکتے ہیں"۔

دُوسری رائے مسٹر فرگسن نامی ایک انگریز کی ہو:۔ "اگر اس مسجد کو چار حصّوں میں
تقسیم کریں۔ تو چاروں حصّے بالکل یکساں معلوم ہونگے۔ اِسی لئے اس کا اثر دیکھنے والے
پر پھیکا سا پڑتا ہے۔ ہر دیوار کا نقشہ بھی ایک سا ہو۔ ایک ہی قسم کی کھڑکیاں ایک دُوسرے
سے یکساں فاصلے پر دیواروں میں لگی ہیں۔ اور قبلہ کی جانب بھی دُوسری دیواروں سے
کچھ زیادہ آراستہ نہیں۔ ہاں اتنی بات ہو کہ دو سو فٹ مربع کا ہال جس کی پتھر کی چھت
صرف چار ستونوں پر کھڑی ہے۔ اپنی جگہ ایک شاندار چیز ہے"۔

پہلے حضرت نے اندر کی خوبصورتیوں اور دلچسپیوں کا خود اعتراف کر کے
شاید ازراہِ تعصب مسجد کو گھٹا کر دکھانا ضروری سمجھا ہے۔ تو دُوسرے صاحب نے

میدانِ سرعسکرت

اپنے اعتراض میں اس اصُول سے چشم پوشی کی ہے۔ کہ مساجد کی زیادہ زینت قبلہ کی جانب بھی مسلمانوں کے ہاں مروّج نہیں۔ مساجد کو جس خوبی پر ناز رہا ہے وُہ اُن کی سادگی ہے۔ جب مسلمانوں میں بڑے بڑے بادشاہ ہوئے اور اُن کو بڑی بڑی مذہبی عمارتوں کا شوق ہُوا۔ تو اتنی ظاہری شان اور بلندی بھی مساجد میں پیدا ہوگئی۔ مگر پھر بھی وُہ دانستہ اُن کو سادہ رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ اور جو خوبی پیدا کی جاتی تھی ۔ وہ مصالحہ کی عمدگی ۔ درو دیوار کی بلندی۔ محراب کی فراخی۔ سنگ مرمر اور رنگا رنگ کے پتّھروں کے انتخاب سے ہوتی تھی۔ نہ کہ کسی اَور سامانِ آرائش سے۔ رہا جامع احمدیہ کی دیواروں اور دریچوں کے بالکل یکساں ہونے کا معاملہ۔ سو یہ اپنا اپنا مذاق ہے۔ مشرقی مذاق عموماً یکساں ہونے کو پسند کرتا رہا ہے۔ اسی لئے کئی بڑی عمارتوں میں محض اس اصُول کے نباہنے کے لئے ایک کار آمد دروازہ کے جواب میں ایک بیکار دروازہ بنا دیا جاتا ہے۔ تاکہ یکرنگی میں فرق نہ آئے۔ ہمارا تو خیال ہے کہ جامع احمدیہ کے بانی نے وُہ مشکل کام جو اُس نے اپنے ذمے لیا تھا۔ یعنی ایا صُوفیہ کے قریب اور جامع فاتح و جامع سلیمانیہ کے بعد ایک عالیشان مسجد بنانا۔ بڑی کامیابی کے ساتھ انجام دیا ہے۔ اور جامع احمدیہ حقیقت میں استانبول کی قابلِ دید چیزوں میں سے ہے اور کم از کم کسی مسلمان سیاح کے لئے اسے اندر سے جاکر دیکھنا کبھی باعثِ مایوسی نہیں ہو سکتا۔

بیان کیا جاتا ہے کہ سُلطان احمد مرحوم کو اس تعمیر کے متعلق یہاں تک شغف تھا کہ ہفتے میں ایک دن وُہ خود عمارت کے کام میں شریک ہوتے تھے اور معماروں کا ہاتھ بٹاتے تھے۔ دلی ارادت کا یہ ثبوت اُس حُسنِ عقیدت کے ثبوت سے بھی

ایک درجہ بڑھ کر ہے۔ جو جسطنین نے ایا صوفیہ کی تعمیر کے وقت دیا تھا۔ اس مسجد کو ایک قبولیت خاص حاصل ہے۔ مولودشریف کے لئے جس زور کا مجمع یہاں ہوتا ہے اور کہیں نہیں ہوتا۔ پہلے بادشاہ مولودشریف کے دن۔ اور حاجیوں کے کاروان کی روانگی کے موقعہ پر اور عیدین کے لئے یہیں آیا کرتے تھے۔

اِس مسجد کے اوقاف کی آمدنی دولاکھ غرش یعنی پچیس ہزار روپیہ سالانہ ہے۔ جس سے سینکڑوں طلبہ مستفید ہوتے اور بانی وقف کو دُعائے خیر سے یاد کرتے ہیں۔ صحنِ باغ کے ایک گوشے میں بانی مرحوم کا مزار ہے اور سلطان عثمان ثانی اور مراد رابع بھی اسی کی خوابگاہ کے قریب آرمیدہ ہیں *

مشہور مسجدیں

استانبول مساجد کی کثرت کے لئے مشہور ہے۔ دو سو سے کچھ اوپر جامع مسجدیں اور پانچ سو اور چھوٹی مسجدیں اس شہر میں بتائی جاتی ہیں۔ جامع مسجدوں میں جو بڑی بڑی اور زیادہ مشہور ہیں۔ اُنکی زیارت ہم نے کی۔ مگر اُن سب کا مفصل ذکر کرنا خالی از طوالت نہیں۔ صرف جامع ایُوب بہ وجہ اُن روایات کے جو اس کی بنا کے متعلق مشہور ہیں اور جن کے سبب سے وُہ خصوصیت سے متبرک گنی جاتی ہے علیحدہ بیان کی مستحق ہے۔ باقی جوامع کا محض تھوڑا تھوڑا بیان کافی ہوگا۔

جامع محمدؒ فاتح۔ استانبول میں مسلمانوں کی بنا کردہ مساجد میں سب سے پُرانی جامع مسجد یہ ہے۔ اسے دیکھ کر اُس عالی دماغ شخص کی عظمت دلنشین ہوتی ہے جس کے نام سے یہ مشہور ہے۔ یہ مسجد مدت سے علوم قدیمہ کی بڑی درسگاہ چلی آتی ہے۔ اور آٹھ درس مع قیام گاہ طلبہ اس کے احاطے میں موجود ہیں۔ افسوس کہ اُس کی پُرانی عمارت اپنی اصلی حالت پر قائم نہیں رہ سکی اور سلطان مصطفیٰ ثالث کے عہد میں زلزلے سے اُسے بیحد نقصان پہنچا۔ اور موجُودہ صورت اُس زمانے کی مرمت شدہ حالت ہے۔ نہ کہ اصلی حالت جو بہت زیادہ شاندار تھی۔ محراب اور منبر سفید سنگ مرمر کے ہیں۔ مسجد کے گرد جو باغ ہے۔ اس میں سلطان جنت مکان محمد ثانی کا مزار

ہے - جو لوگ اس جامع شریف کی زیارت کو آتے ہیں وُہ مرحوم فاتح کے مزار پر بھی ضرور فاتحہ پڑھتے ہیں - شہر کا وُہ حصّہ جہاں جامع فاتح ہے اور طلبہ کا مرکز ہے - اس حصّے میں یورپی تمدن کا اثر بہت کم نظر آتا ہو - مسجد کے گرد دوکانیں زیادہ تر ایشیائی نمونے کی ہیں - اور قہوہ خانے بھی پُرانی قسم کے - اُن میں سینکڑوں عمامہ پوش طلبہ بیٹھے نظر آتے ہیں - لمبے پیراہن - اور ترکی ٹوپی کے گرد سفید کپڑا لپیٹا ہوا جو عمامے کا کام دیتا ہے

جامع سلیمانیہ - خالص عثمانی تعمیرات میں یہ جامع مسجد سب سے خوبصورت سمجھی جاتی ہو - اور اس تعریف میں مغربی نقّاد بھی شریک ہیں - حرم جامع ایک مستطیل قطعہ زمین ہو - جس کے گرد حجرے بنے ہیں - چھت پر چوبیس چھوٹے گنبد ہیں - حرم کا فرش سنگ مرمر کا ہے - اور تین طرف نشست کے لئے سنگ مرمر کی نشستیں بنی ہیں - وسطِ حرم میں وضو کے لئے ایک خوشنما چشمہ ہے - مسجد کا اندرونی حصّہ طول اور عرض میں ۲۲۵ × ۲۰۰ فٹ ہو - ستونوں کے سہارے ایک گیلری بنائی گئی ہو جو عمارت کے چاروں طرف جاتی ہے اور اس کی خوبی میں اضافہ کرتی ہے گیلری کا شمالی حصّہ ہمیشہ بند رہتا ہے - کیونکہ لوگوں کی بیش قیمت چیزیں از قسم زرو جواہر بطور امانت محفوظ رکھی جاتی ہیں جو وہاں امانت رکھتا ہے - اسے باضابطہ رسید دی جاتی ہو اور بغیر ضابطہ کی رسید اور کاغذات پیش کرنے کے کوئی اپنی امانت نہیں نکلوا سکتا - مسجد کا گنبد قطر میں ۸۶ فٹ اور بلندی میں ۱۵۶ فٹ ہے - مقصورہ یعنی سلطان کے نماز پڑھنے کا حصّہ سنگ مرمر کے کام کا نہایت نادر اور نفیس نمونہ ہے - دریچوں میں رنگین شیشے لگے ہیں جو سلطان سلیمان اوّل کے عہد کے بہترین آئینہ ساز ابراہیم سرخوش کی صنعت کی یادگار ہیں - مسجد کے

اوقاف کی آمدنی معقول ہے۔ تین لاکھ غرش یعنی ساڑھے سینتیس ہزار روپیہ کے قریب ہے اور اسی سے مسجد کے مدارس کا گذارہ ہوتا ہے۔ مدارس کے ساتھ ایک مدرسۂ طبیّہ اور ایک ہسپتال بھی ہی۔ سلطان سلیمان اور اُنکی ملکہ خُرّم کے مرقد صحن باغ میں جامع کے مغربی حصّے میں ہیں۔

جامع بایزید۔ سلطان بایزید ثانی کی یادگار ہے۔ حرم مسجد میں چنار کے چند سایۂ دار درخت بہار دے رہے ہیں۔ اِن درختوں پر اور مسجد کے گنبدوں اور میناروں پر کبوتروں کے جُھنڈ کے جُھنڈ بیٹھے رہتے ہیں اور اس مسجد کی ایک خصوصیت سمجھے جاتے ہیں۔ اسی لئے اسے بعض اوقات کبوتروں والی مسجد بھی کہتے ہیں۔ اس کے اندر چند چھوٹی چھوٹی عارضی دُکانیں رہتی ہیں۔ جہاں تسبیح۔ مسواک۔ سُرمہ اور اسی قسم کی چیزیں بکتی ہیں۔ مسجد کے متعلّق مگر احاطۂ مسجد کے باہر ایک کتب خانہ ہے۔ جو دن بھر کُھلا رہتا ہے۔ اور جس میں طلبہ اور دیگر شائقین کتابیں پڑھتے آتے رہتے ہیں۔ اِستانبول کے عام کُتب خانوں میں یہی ایک کُتب خانہ ہے جسے مَیں دیکھ سکا۔ یہ مسجد استانبول کے سب سے مشہور اور قدیم بازار کے عقب میں واقع ہی اور اس لئے آباد ترین مساجد میں ہے۔

والدہ جامع۔ یعنی والدۂ سلطان کی مسجد۔ یہ مسجد سُلطان محمد رابع کی والدہ نے سنہ ۱۶۶۵ء میں تیار کرائی تھی۔ اس کے مینار دُوسری مسجدوں کے میناروں سے زیادہ خوبصورت ہیں اور ویسے بھی اس میں ایا صوفیہ کے نقشے کی عام تقلید کا اثر کم نظر آتا ہی۔

ینی والدہ جامع۔ ایک چھوٹی سی خوش وضع مسجد ہے جسے سلطان عبد العزیز مرحُوم کی والدہ نے سنہ ۱۸۷۰ء میں بنوایا تھا۔

جامع سلیمیہ - یہ بھی سلیمان اوّل کے کارناموں میں سے ہی- سلیمان اوّل کو عثمانی تعمیرات میں دُوسرے عثمانی سلاطین سے وُہ نسبت ہی جو ہندوستان میں شاہجہان کو دیگر شاہانِ مُغلیہ سے تھی - اس نے صرف اپنے نام کی ایک بڑی عالیشان مسجد بنانے پر اکتفا نہیں کی - بلکہ کئی مسجدیں بنوائیں - اُن میں ایک یہ مسجد اپنے والد بزرگوار سلیم اوّل کے نام سے نامزد کی - قسطنطنیہ کے اُس حصّے سے جسے پیرا کہتے ہیں - پہلے اسی کے بُلند مینار نظر آتے ہیں - یہ سلیمانیہ کی شان کو تو نہیں پہنچتی - مگر اپنی جگہ نہائیت خوش نما ہے - کُتب خانہ اور مدرسہ اس کے ساتھ بھی موجُود ہیں - استانبول کی مسجدوں کے ساتھ ایک معقول حمّام اور ایک "خان" یعنے مہمانسرائے بنانے کا بھی دستور ہے اور یہ دونوں چیزیں مثلِ اَور مساجد کے سلیمیہ میں بھی ہیں -

شہزادہ جامع - اگر سلیمیہ جامع سلطان سلیمان اوّل کی سعادتمندی اور محبتِ فرزندانہ کا ثبوت تھی تو شہزادہ جامع اس کی شفقتِ پدرانہ کا اظہار ہے - اس کے لختِ جگر شہزادہ محمد اور شہزادہ جہانگیر اور اُنکی ایک بہن اس مسجد کے احاطے میں مدفون ہیں - اور استانبول کی بیشمار تُربتوں میں ایسی خوبصورتی اور نزاکت سے آراستہ تربتیں شاید ہی اور کہیں ہُوں - شاہزادوں کے انتقال سے بادشاہ کے دل پر جو چوٹ لگی - اُس کے اثر سے یہ مسجد قائم ہُوئی اور بعد کو جب بیٹی کا صدمہ بھی باپ کو سہنا پڑا تو اسے بھی اُس کے مرحُوم بھائیوں کے پہلو میں لٹایا گیا - یہ مسجد سلیمان کے زمانے کی عمدہ ترین تعمیرات میں ہے اور شہر کے نہائیت آباد حصّے میں واقع ہے -

مہرماہ جامع - سلیمان اوّل نے اپنی چہیتی بیٹی مہرماہ کی یادگار کے طور پر یہ مسجد بنوائی تھی - افسوس کہ اب محض کھنڈر ہے سنہ ۱۸۹۴ء کے شدید زلزلے

کی نذر ہوئی۔

رستم پاشا جامع۔ مصری بازار کے قریب یہ مسجد بھی دیکھنے کی چیز ہے۔ سلطان سلیمان کے داماد۔ مہرماہ کے شوہر نے بنوائی تھی۔ خوبصورت عمارت ہے اور اندر سے نہایت آراستہ۔

عتیق علی پاشا جامع۔ ہر زمانے میں اُمرا اور وزرا بادشاہ کے مذاق کے مطابق اپنے مذاق ڈھال لیا کرتے ہیں۔ یہ کیونکر ہو سکتا تھا کہ سلیمان اوّل کا وزیر اعظم اپنے آقائے نامدار کے نقشِ قدم پر نہ چلے۔ چنانچہ یہ مسجد وزیر نے اپنی یادگار چھوڑی ہے۔

نوری عثمانیہ جامع۔ استانبول میں اور بھی کئی ایک مساجد ہیں۔ جن میں شاخِ زرّین کے اُس پار کی جامع بشکطاش قابلِ ذکر ہے (جامع حمیدیہ کا ذکر پہلے سرائے ہمایوں کے سلسلے میں آچکا ہے۔ گو وہاں اس کے نہایت خوبصورت نقشے کی داد نہیں دی گئی۔ جو دُوسری مساجد سے بالکل نرالا اور سلطان المعظّم کے ذاتی مذاقِ تعمیر کا عُمدہ نمونہ ہے) مگر استانبول خاص کی جس مسجد کے ذکر پر مساجد کے اس مختصر بیان کا خاتمہ ہے۔ وُہ نوری عثمانیہ ہے۔ سلطان محمود اوّل نے اُسے بنانا شروع کیا تھا مگر اختتام کا سہرا اُس کے بھائی عثمان ثالث کے سر رہا۔ ساری عمارت سنگ مرمر کی ہے۔ اِسی لئے شاید اسے نوری کہتے ہیں۔ یہ مسجد اُسی بڑے بازار سے ملحق ہے۔ جس کے عقب میں جامع بایزیدیہ ہے اور چونکہ مسجد کے دروازے سے نکل کر بازار میں بآسانی داخل ہو سکتے ہیں۔ اِس لئے بازار کو ابھی دیکھ لینا چاہیئے۔

بازارِ مُسقّف

بغداد قدیم کی جو کہانیاں الف لیلہ میں ہیں۔ اُن کا نقشہ استانبول کے مسقف بازاروں کو دیکھ کر آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔ بازار کیا ہے بیسیوں بازاروں اور گلیوں کی ایک بھول بھلیاں ہے۔ اِس کے گرد مضبوط دیوار ہے اور اوپر چھت ہے۔ اندر داخل ہونے کے لئے بہت سے دروازے ہیں۔ اور ہر دروازہ اور اس کے سامنے کا بازار ایک خاص تجارت کے لئے مخصوص ہے۔ کہیں زرگر ہیں۔ کہیں جوہری۔ کہیں بزاز ہیں۔ کہیں شال وقالین کے سوداگر۔ کہیں فرنگستان کا مال ہے کہیں ایشیا کا۔ ایک طرف بروسہ کے ریشمی کپڑے اور خوبصورت تولے رکھے ہیں۔ دُوسری طرف ایران کے ظروف مسّی اور دیگر مصنوعات۔ ہر قوم کے سوداگر اس بازار میں ہیں اور قریب قریب دُنیا کی ہر زبان یہاں بولی جاتی ہے۔ عرب عربی بولتے ہیں۔ ایرانی فارسی۔ ارمنی اور یونانی عیسائی اپنی زبانوں اور ترُکی کے علاوہ ٹوٹی پھوٹی انگریزی۔ یا فرانسیسی یا جرمن بولتے ہیں۔ بعض کئی کئی غیر زبانیں جانتے ہیں۔ رُوسی بولنے والے بھی موجود ہیں۔ لیکن سب سے زیادہ مروّج ترُکی ہی ہے۔ اور اسے اس بازار میں کام کاج کرنے والے سب جانتے ہیں۔ بازار کی چھت پتھر کی ہے اور بیشمار چھوٹے چھوٹے گنبدوں کا مجموعہ ہے۔ ان گنبدوں میں دریچے ایسی ترکیب سے لگے ہیں کہ روشنی صبح وشام بازار میں پہنچتی رہتی ہے۔ کچھ عرصہ ہُوا لوہے کی مضبوط سلاخوں سے ان گنبدوں کو سہارا دیا گیا ہے۔ کیونکہ

۱۸۹۴ء کے شدید زلزلے سے اس بازار کا ایک حصّہ گر گیا تھا اور سینکڑوں جانیں تلف ہوئی تھیں۔ اس لیے احتیاطاً مرمت کے وقت اور لوہے کی کڑیوں سے چھت کو مضبوط کیا گیا۔ اور یہ بازار پھر ویسا ہی آباد ہو گیا جیسا زلزلے سے قبل تھا۔ لیکن مزے کی بات ہے کہ بعض لوگوں کو اب تک اس کے اندر جاتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ چنانچہ ہمارے ملاقاتیوں میں ایک صاحب اس بازار سے بہت گھبراتے تھے اور گھبرانے کی وجہ یہ بتاتے تھے کہ وہ زلزلے کے وقت بازار میں موجود تھے اور اتفاق سے بچ نکلے۔ مگر اُس دن سے پھر اس کے اندر نہیں گئے۔ ہم نے انہیں بارہا لیجانا چاہا۔ لیکن وہ جانے پر راضی نہ ہوئے۔

کہتے ہیں بہ نسبتِ سابق اِس بازار کی رونق میں کمی آگئی ہے۔ آج کل کچھ تو یورپی چیزوں کے رواج سے یہاں گاہک کم آتے ہیں کیونکہ ترکی اُمرا کا رجوع زیادہ تر یورپی دوکانوں کی طرف ہو گیا ہے اور کچھ عام تموّل کی کمی کی وجہ سے بھی یہاں کی رونق پہلی سی نہیں رہی۔ جنگِ رُوس و روم کے وقت تک اس میں قیمتی اشیا کا لین دین بے انتہا تھا اور ادنیٰ و اعلیٰ اسباب یہیں آتے تھے۔ ایک انگریز سیّاح جس نے اس بازار کو اُس زمانے میں دیکھا ہے۔ اس کی تعریف میں یُوں رطب اللسان ہے:۔

"دوکانوں کی یہ مسقف قطاریں اگر سب جمع کر کے دیکھی جائیں تو میلوں لمبی ہونگی متحیّر سیّاح کی آنکھ یکے بعد دیگرے ان خوش منظر گلیوں کو دیکھتی ہے۔ جہاں دُنیا بھر کی مصنوعات کی نمائش ہے۔ گھنٹہ بھر ان گلیوں میں گھومتے رہیں۔ تو ایک جگہ دو دفعہ آنے کی ضرورت نہیں۔ اور اس سارے عرصے میں آنکھ کہیں ہیروں پر پڑتی ہے۔ کہیں سونے پر۔ کہیں کشمیر کے دوشالے ہیں اور کہیں چین کے ریشم۔ چمکتے ہوئے

اسلحہ۔ مہکتی ہُوئی خوشبوئیں۔ مجلاّ آیئنے اور مطلاّ ظروف۔ زردوزی کے عجیب عجیب نمونے۔ مزیّن پاپوش۔ عنبر کے مہنال مرصّع بجواہرات۔ سب یہاں رکھے ہیں۔ کسی چھوٹی سے چھوٹی قطار کی طرف بھی دیکھو تو دُنیا کا ہر رنگ اُن اشیا میں موجود ہے جو وہاں نظر آتی ہیں۔ غرض یہ بالکل نرالا نظّارہ۔ اس کا شور۔ اس کی حرکت اور اس کی جدّت پہلے پہل انسان کو بالکل محوِ حیرت کر دیتی ہے"۔

اس میں شک نہیں کہ آج کل گراں بہا زر و جواہر اور پشمینے اور دوشالوں کی جگہ زیادہ تر سستے اور سستے مغربی مال نے گھیر لی ہے۔ اور یہ بازار اُس تمام مال و متاع کا مالک ہونے کا فخر نہیں کر سکتا۔ جس کا بیان ایسی بے ساختہ قدردانی سے اس انگریز سیّاح نے کیا ہے۔ لیکن اب بھی اپنی قسم کے سب بازاروں سے جو بعض اَور مقامات میں ہیں رونق پر ہے۔ قیمتی جواہرات۔ سونے چاندی کے برتن۔ ریشمی کپڑے اور کشمیری شال۔ زردوزی کے اعلیٰ نمونے۔ مطلّا اشیا آج بھی اس میں مل سکتی ہیں۔ اور کئی دوکانیں جو بظاہر بہت چھوٹی اور کم حیثیت نظر آتی ہیں۔ لاکھوں روپیوں کا مال رکھتی ہیں۔ گاہک کے لئے اپنی جیب روپیوں سے بھر کر جانے اور باہر کیسہ تہی آنے کے لئے اب بھی کافی سامان ہے۔ الوانِ گوناگون کی اب بھی وُہی بہار ہے جو پہلے تھی اور آنے جانے والوں کی کثرت اور بھیڑ بھاڑ کا اب بھی یہ حال ہے کہ آدمی وہاں دن بھر بیٹھا سیر دیکھا کرے تو جی نہ بھرے۔ ہر وضع اور ہر لباس کے لوگ سامنے سے گذر ینگے۔ عورتیں بھی فراجہ پہنے سودا سُلف کرنے آتی ہیں۔ کہتے ہیں اب اُمرا کی عورتیں یہاں نہیں آتیں۔ کیونکہ اُن کے موجودہ استعمال کی چیزیں ان دوکانوں میں نہیں ملتیں۔ لیکن دُور سے آئے ہُوئے مسافر کو اس سے کیا غرض۔ کہ

اب جو عورتیں ہجوم میں اُسے نظر آتی ہیں طبقہ اُمرا میں سے ہیں یا نہیں - اس کی نگاہ تصوّر کی مدد سے اُسی منظر میں جو پیشِ نظر ہے - بغداد کی کہانیوں کی تصویر دیکھتی ہے - اور وُہ حیران ہوتا ہے - کہ مشرقی زندگی کا یہ دلچسپ نمونہ بیسوں صدی تک کس سخت جانی کے ساتھ زمانہ کی زد سے اپنے آپ کو بچائے ہُوئے ہے -

اس قسم کے بازار سب پُرانی قوموں نے اپنے اپنے ہاں بنائے تھے - روما اور یُونان قدیم میں یہ رسم تھی اور قسطنطنیہ میں شاہان بزنطائن کے عہد میں بھی یہ بازار تھا - مسلمانوں نے اُسے اَور رونق دی - اب گو مذاقِ زمانہ بدل گیا ہے - تاہم ایسے بازاروں کا شوق کسی نہ کسی صُورت میں اپنے آپ کو ظاہر کرتا ہے - لنڈن میں بھی مسقّف بازار دو ایک ہیں - جنہیں آرکیڈ کہتے ہیں - اور گو بہت لمبے نہیں - پھر بھی چھوٹے پیمانے پر اسی نمونے کی تقلید ہیں - یورپ کے بعض اَور شہروں میں مَیں نے لنڈن سے زیادہ لمبے مسقّف بازار دیکھے ہیں - اِس کے سوا یورپ کی بعض مقامی نمائشوں میں جو کئی کئی مہینے رہتی ہیں - اُسی اصُول سے کام لیا جاتا ہے - جس پر یہ پرانے بازار قایم تھے - گویا یہ بازار ایسی نمائش کا کام دیتے تھے - جو ہمیشہ جاری رہے - شمالی ہندوستان میں جو نوچندی کے میلے اور نمائشیں ہوتی ہیں - جہاں اسی طرح دوکانوں کی قطاریں حرفت وار لگتی ہیں اور ہر پیشے کے لوگ ایک علیحدہ حصّہ اپنے لئے مخصوص کرتے ہیں - اِن کے وسیع میدانوں پر اگر ایک نہایت بڑا شامیانہ تان کر عارضی سقف کا کام لیا جائے تو ایک صُورت استانبول کے اس بازار کی اُن میں پیدا ہو جائے - موجُودہ زمانہ میں جو مارکیٹ بڑے بڑے شہروں میں بنی ہیں - وُہ بھی اسی قسم

کی چیز ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ مارکیٹ میں زیادہ تر روزمرّہ کی ضروریات اور کھانے پینے کی چیزیں یکجا فروخت ہوتی ہیں اور کپڑوں وغیرہ کے لئے کہیں کہیں ایک حصّہ الگ ہوتا ہے۔ بخلاف اس کے ان بازاروں میں کپڑے اور زیور اور سامانِ آرائش سب یکجا مہیّا ہیں اور کھانے پینے کے لئے چند دوکانیں ہیں جہاں اس بازار کے مشتری تفریح کی غرض سے جاتے ہیں۔

جس کسی کو استانبول کے خاص مذاق کی چیزوں کے چکھنے کا شوق ہو جنہیں عثمانی بہت شوق سے کھاتے ہیں تو بڑے بازار کی دوکانوں میں اُن کے عُمدہ نمونے مل سکتے ہیں۔ سوتلج یعنی کھیر۔ محلّبی یعنی فیرینی کی کئی دوکانیں اس بازار میں ہیں۔ ہندوستان کے فالودہ یا فیرینی بیچنے والوں کی دوکانوں سے کسی قدر مختلف ہیں۔ دوکان کے دروازہ پر ایک پردہ لٹک رہا ہے۔ اندر جائیں۔ تو سنگ مرمر کے میز اور اُنکے ساتھ کُرسیاں یا مخملی گدے دار بنچ موجود ہیں۔ آرام سے بیٹھ کر کھائیے۔ اگر زیادہ دیر بیٹھنا ہو تو دوکاندار ایک آدھ روزانہ اخبار بھی آپ کے دل بہلانے کو پیش کر دیتا ہے۔ کئی دوکانوں میں عورتوں کی نشست کے لئے علیحدہ کمرہ بنا ہے۔ وُہ آتی ہیں اور اس کا پردہ اُٹھا کر اندر چلی جاتی ہیں۔ یہ گویا مرد خریداروں سے علیحدگی ہے۔ ورنہ اُنہیں دوکاندار سے پردہ نہیں۔ کیونکہ اندر وُہ نقاب اُلٹ کر بیٹھتی ہیں اور کھاتی پیتی ہیں اور دوکاندار برابر آتا جاتا رہتا ہے۔ جس سے اُس صورت میں پردہ نہیں ہو سکتا۔

بازار کے وسط میں ایک حصّہ ہے جہاں پُرانے اسلحہ اور دیگر الاَیق اشیا بکثرت رکھی ہیں۔ اس حصّہ کو بزستان کہتے ہیں۔ اور اسی لئے اس بازار کو بعض

اوقات تُرکی میں برستان چارشی یعنی برستان والا بازار کہتے ہیں - چارشی غالباً وُہی لفظ ہی جو فارسی میں چارسو ہے اور ہمارے "چوک" کا مترادف ہے -

شام کو یہ اور اس قسم کے سب بازار بند ہو جاتے ہیں - اس لئے ان کی سیر کا بہترین وقت دوپہر سے ذرا بعد ہے -

اس بازار کے نواح میں جو کُھلے بازار ہیں - وُہ بھی بہت آباد ہیں - اور اسکی رونق کی زیادتی کا باعث ہیں - مگر بعض چھوٹے چھوٹے مسقّف بازار اور بھی اسی قرب وجوار میں واقع ہیں - اُن میں ایک بازار ہے - جہاں پُرانے کپڑے اور اور ارزاں چیزیں فروخت ہوتی رہتی ہیں - لیکن چھوٹے بازاروں میں سب سے دلچسپ مصر چارشی ہی - جہاں مشک وعنبر وعطریات - یُونانی دوائیاں اور ہر طرح کے خشک میوے اور مصالح بکتے ہیں -

اکثر بڑے بڑے مشرقی شہروں میں دوکانداروں کی جو عادت ہی - کہ اپنی اشیا کے دام اصل سے بہت بڑھا کر مانگتے ہیں اور مسافر کو لُوٹنے میں تامّل نہیں کرتے - وُہ یہاں بھی موجُود ہے - اِس لئے ہر اجنبی کے لئے جو اِن بازاروں سے کچھ تحفے خریدنا چاہے لازم ہے کہ یا اپنے ساتھ کوئی باخبر رہبر رکھے جو تُرکی زبان بھی جانتا ہو اور یا کئی جگہ سے بھاؤ پُوچھنے اور نرخ کے مقابلہ کرنے کے بعد خریداری کرے - ان دوکانداروں میں بعض ارمنی اور یُونانی خصوصیت سے دھوکا دینے میں مشّاق ہیں یورپ اور امریکا کے اکثر سیّاح جنہیں یہ یہ وزشیبائی رہبروں کی وجہ سے زیادہ تر انہی سے سابقہ پڑتا ہی استانبول کے دوکانداروں کی نسبت اپنی رائے انہی کی عادات کے مشاہدہ سے قائم کرتے ہیں - کیونکہ وُہ انہیں اور عثمانیوں میں آسانی سے تمیز نہیں کر سکتے

خانِ والدہ

بڑے مسقّف بازار کے قریب ایرانیوں کی تجارت کا مشہور مرکز خان والدہ ہے۔
یہ پُرانی کاروانسرائے ہے۔ جس میں اب ایرانی تجار مستقل طور پر مقیم ہیں۔ اور اُن کا کاروبار
بیشتر اسی احاطے کے اندر ہوتا ہے۔ استانبول کی خصوصیتوں میں ایک یہ بھی ہے کہ اس
میں کاروانسرائیں بکثرت ہیں۔ انہیں یہاں خان کہتے ہیں اور ان کی تعداد چھوٹی
بڑی ملا کر دو سو کے قریب ہے۔ ان کے نام عموماً ان کے بانیوں کے نام سے لئے
گئے ہیں۔ اور پُرانے زمانے میں استانبول کی تجارت کی ترقی کے اسباب میں ایک
بڑا سبب یہی تھا کہ مسافر تاجروں کو جو دُنیا کے ہر گوشے سے اس بڑی منڈی کی طرف
رُخ کرتے تھے ان مکانات میں ہر طرح سے آرام ملتا تھا۔ ان کی ساخت اُسی ڈھنگ
ہے جو ہندوستان کی کئی پُرانی سراؤں کی تعمیر میں برتا گیا ہے۔ یعنی چھوٹے چھوٹے
حجروں کی قطار چاروں طرف ہے اور عمارت میں لکڑی سے کام نہیں لیا گیا۔ اینٹ اور
چونے یا پتھر اور چونے کی عمارت ہے۔ اور گنبددار چھت ہے۔ وسط میں صحن ہے۔ ان
سراؤں میں رہنے کے لئے مذہب و ملّت کی کوئی قید نہ پہلے تھی نہ اب ہے۔ اور
اس وقت بھی کئی سرائیں ایسی ہیں۔ جن میں بخارا اور سمرقند تک کے لوگ ایشیائے
اور عرب اور حبشی افریقہ سے آکر مقیم ہوتے ہیں۔ ایک کوٹھڑی کرایہ پر لی۔ وہاں اسباب
رکھا اور کھانا کھانے بازار چلے گئے۔ رُوسی مُسلمان جو حج کو جاتے وقت اُدھر سے
گزرتے ہیں۔ اُن میں بھی جو غریب طبقہ کے لوگ ہوتے ہیں وُہ انہی سراؤں میں قیام کرتے

ہیں۔ لیکن یہ عمارتیں آج کل زیادہ تر تاجروں کے گودام وغیرہ کے لئے استعمال کیجاتی ہیں
اوران میں سے بعض تجار کی کسی خاص جماعت کے لئے مخصوص ہو گئی ہیں۔ اس آخری
قسم میں کوئی عمارت خانِ والدہ سے زیادہ آباد اور پُر رونق نہیں ہے۔

استانبول سے باہر لوگوں کو عام طور پر یہ معلوم نہیں کہ اس عثمانی پایہ تخت میں ایرانی
کس قدر آباد ہیں۔ اُنکی تعداد چالیس پچاس ہزار کے قریب ہے۔ اور سب اپنی اپنی جگہ
اچھی حالت میں ہیں۔ جو بالکل غریب اور بے ہنر ہیں وُہ مزدوری پیشہ ہیں او حمّالوں
میں اور مزدوروں میں ملے جُلے کام کرتے ہیں۔ یہاں رہتے رہتے ترکی سے سب
آشنا ہو گئے ہیں اور ترکی ٹوپی پہنے رہتے ہیں۔ اس لئے آسانی سے متمیز نہیں ہو سکتے
لیکن کسی کو فارسی میں بات کرتے سُنیں تو خود بخود متوجہ ہو جاتے ہیں۔ ان سے
اوپر جو طبقہ ہے۔ وُہ خوانچے والے ہیں۔ کوئی میوہ بیچتا ہے۔ کوئی مٹھائی۔ لیکن
اکثر چاء پلانے کا کام کرتے ہیں۔ ایک بڑی سی سماوار ہر وقت گرم رہتی ہے اور ایک
طاس میں چھوٹے چھوٹے بلوری گلاس دھرے رہتے ہیں۔ اُن میں بے دُودھ
کی چاے یہ لوگ بیچتے ہیں۔ ہر ایرانی مزدور صبح کو کام پر جاتے ہُوئے ان کے پاس
بیٹھ کر پیسے دو پیسے کی چاے پی جاتا ہے اور یہ لوگ اس ذریعے سے اپنا معقول
گذارہ کر لیتے ہیں۔ ان سے اُوپر ایرانی دوکاندار ہیں۔ جن میں سے اکثر
خشک پسا ہُوا قہوہ بیچتے ہیں اور اس کے ساتھ بساطی کی دوکان کرتے ہیں۔
لیکن اس گروہ کے سوا جسے استانبول کے ایرانیوں کا طبقۂ عوام کہنا چاہتے
ایک معقول طبقۂ خواص ہے۔ جس میں کئی لکھ پتی تاجر ہیں۔ جن کی تجارت دُور
دُور تک ہے۔ وُہ ایران کا مال استانبول میں بیچتے اور استانبول کا ممالکِ غیر

میں بھیجتے ہیں اور استانبول کی بیرونی تجارت کا وہ حصہ جو عیسائی اور یہودی تجّار سے بچ رہتا ہے۔ بیشتر انہی کے ہاتھ میں ہے۔ کیونکہ عثمانیوں کو تاحال تجارت سے کچھ مناسبت نہیں۔ ایرانیوں کے لیئے یہ بات بیشک قابلِ تحسین ہے۔ کہ وہ وطن سے اتنی دُور محنت اور سعی سے معقول روزی پیدا کرتے ہیں۔ اور اپنے آپ کو اور اپنے بھائیوں کو نفع پہنچاتے ہیں۔

خانِ والدہ کے اندر جائیں۔ تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دفعتہً روم سے ایران میں جا پہنچے۔ ایرانیوں کی حبِّ وطن نے اسے ایران کا ایک چھوٹا سا خطہ بنا رکھا ہے۔ ذہین اور خوش مذاق تو یہ لوگ بالطبع ہوتے ہیں۔ اور انکا مذاق ان کی طرزِ بود و باش سے نمایاں ہے۔ ہر ایک نے اپنے کروں کے آگے درخت لگائے ہیں۔ انگور کی بیلوں سے برآمدے سجائے ہیں اور موسم گرما میں شام کے قریب چھڑکاؤ وغیرہ کرا کے ان درختوں کے سائے میں ہر ایک اپنی اپنی محفل گرم کرتا ہے۔ یہ لوگ بڑے ہی کھانے کے کیڑے نہیں اور نہ روپیہ حاصل کرنے کی دُھن میں دنیا کے اور سب شوقوں سے بے پروا ہیں۔ تاجر ہیں۔ مگر ذی علم اور علم دوست۔ شام کو جب کاروبار سے فارغ ہو کر بیٹھتے ہیں۔ تو ان کے ہاں علم و فن اور شعر و سخن کا چرچا ہوتا ہے۔

مجھے خانِ والدہ میں جانے کا کئی مرتبہ اتفاق ہوا۔ محض شوقِ سیر تو ایک دفعہ لیجاتا۔ مگر مرزا محسن اصفہانی معتمد التجار اور حاجی زین العابدین مراغہ کی دوستانہ کشش کئی بار لے گئی۔ مجھے ان بزرگوں سے ملنے کا اتفاق دولتِ عالیہ ایران کے سفیر عالیجناب پرنس ارفع الدولہ کے ہاں ہوا۔ شاہِ ایران کی سالگرہ کے جشن کے

دِن میں شریکِ جشن ہونے کو مدعو تھا اور اُس دن استانبول کے سب اکابر سفارت خانہ
میں جمع تھے۔ مینے وہاں اثنائے گفتگو میں جو اتحادِ اسلام کا ذکر کیا تو مجھے یہ دیکھ کر
بے انتہا مسرت ہوئی کہ جلسے کے بعد اکابر ایران میں سے کئی اصحاب نے بڑے
زور سے اس خیال کی تائید کی اور یہ کہا کہ موجودہ زمانے میں اسلام کی حفاظت اسی
صورت میں ممکن ہے کہ مسلمانوں کے سب فرقے اپنے جزوی اختلافات کو بھلا کر ایک
دُوسرے کی بھلائی کے لئے ساعی ہوں۔ اور بھائی بھائی ہو جائیں۔ حاجی
زین العابدین ایک مُسن بزرگ ہیں۔ جنہوں نے مدت سے اپنی تحریروں میں آزادانہ
خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اور جن کی روشن خیال تحریروں سے سینکڑوں لوگ
ایران میں روشن خیال ہو گئے ہیں۔ مرزا محسن اصفہانی نوجوان ہیں۔ اور حاجی صاحب
کے ہم خیال۔ ان دونوں صاحبوں نے مجھ سے میرا پتہ نشان دریافت کیا اور
دُوسرے دن ہوٹل میں مجھے ملنے آئے۔ اِس کے بعد مَیں بازدید کو گیا۔ پھر
ایک دِن معتمد التجار نے خان والدہ میں شام کے کھانے پر بُلایا اور اُس دن اہلِ
ایران میں سے پندرہ بیس اور سرکردہ لوگ وہاں موجود تھے۔ اُس شب کی
مجلس دیر تک نہ بھولے گی۔ اِسی طرح وُہ مجلس بھولنے کی نہیں جو پھر ایک دن حاجی حسینا
کے ہاں دعوت کے موقعہ پر ہوئی۔ لیکن وُہ خان والدہ سے باہر تھی۔ اس مجلس میں
علما بھی تھے اور رؤسا بھی۔ نئی روشنی کے لوگ بھی اور پُرانی تعلیم کے تربیت یافتہ
بھی۔ مذہبی تمدنی سیاسی سب قسم کے معاملات پر گفتگو ہوتی رہی اور مجھے یہ دیکھ کر
کہ سب مسائل پر اُن اصحاب کے خیالات معقول اور مناسب تھے۔ بہت خوشی ہوئی
اور مَیں نے دل میں کہا کہ اگر ایران میں اہلِ ایران کا کوئی معتد بہ حصہ ان خیالات

میں رنگا جا چکا ہے تو سمجھنا چاہیئے کہ ایران کے بھلے دن آنیوالے ہیں۔

ہمارے معزّز میزبان اور حاجی صاحب کے سوا جو اصحاب اس مجلس میں حاضر تھے۔ اُن میں چند کے نام نہ مجھے یاد ہیں۔ یہاں لکھے دیتا ہوں۔ مولانا سید عبدالجوّاد محدّث طہرانی مولانا سید علی اشرف امامِ سفارتِ ایران دوقتور شیخ محمد جو طہران کے نامور اطبّا میں ہیں اور جنہوں نے پیرس میں تحصیل طب کی ہے۔ وہ اپنے بھائی کو ملنے وائنا (پایۂ تختِ آسٹریا) گئے تھے اور وہاں سے واپس آتے ہُوئے استانبول ٹھہرے۔ حاجی سید احمد آغا جو طہران کے ایک بڑے جوہری ہیں۔ اور اپنے کاروبار کے لئے سفر یورپ کو آئے تھے۔ مرزا رفیع برادر مرزا محسن جو بیروت میں تعلیم پاتے ہیں اور تعطیل کی وجہ سے آئے ہُوئے تھے۔ ایرانیوں میں تجارت کرنے اور پڑھنے لکھنے کے لئے گھر سے نکلنے کا شوق اُن کی بیداری کا نشان ہے۔ مذہبی تمدّنی اور سیاسی معاملات پر اُن آراء کا خلاصہ جو میں نے اس مجلس میں سُنیں تین مختصر جملوں میں ہو سکتا ہے:۔

۱۔ سُنّی اور شیعہ کا جھگڑا اب ختم ہو جانا چاہیئے۔ ورنہ دونوں مٹ جائینگے۔ اپنے اپنے عقاید پر ہر کوئی اپنے اپنے گھر عمل کرے۔ لیکن دُنیاوی ترقّی اور باہمی حمایت اور مروّت کے راستے میں عقاید کو حائل نہ ہونے دے۔

۲۔ تمدّن میں بعض اصلاحات ضروری ہیں۔ لیکن اُن میں اعتدال اور میانہ روی سے کام لینا چاہیئے۔ مثال کے طور پر مسئلہ تعلیم نسوان لیجئے۔ اِس پر یہاں تک تو نئے پُرانے سب متفق تھے۔ کہ تعلیم نسوان لابدّ ہے۔ صرف اس بات میں اختلاف تھا کہ کس حد تک تعلیم نسوان ہونی چاہیئے۔ کثرتِ رائے یہی تھی کہ مردوں کے مساوی

تعلیم ضروری نہیں۔ کیونکہ مرد اور عورت کے فرائض جُدا گانہ ہیں۔

۳۔ سیاسی معاملات میں رعایا کے حقوق کی حفاظت اور رعایا کی انتظامِ ملک میں شرکت اس زمانے میں نہایت ضروری ہے۔ اس کے بغیر کوئی قوم دیگر اقوام متمدنہ کے مقابلے کی تاب نہیں لا سکتی۔ اس بارے میں وُہ سب ایران میں پارلیمنٹ کی بنیاد پڑنے پر خوش تھے اور اس کی کامیابی کے ساتھ اپنی ترقی کی سب اُمیدیں وابستہ سمجھتے تھے۔

سب سے ضروری اور حوصلہ بڑھانے والی بات وہاں یہ دیکھی۔ کہ عُلما ان خیالات سے موافقت کرتے تھے اور فخریہ یہ کہتے تھے کہ ایران میں جو سیاسی آزادی کی ابتدا ہوئی ہے اس کے بانی اور بڑے محرک علما ہی ہیں اور یہی لوگ رعایا کی طرف سے حقوق مانگنے کے لئے سینہ سپر ہو کر کھڑے ہوئے۔ حقیقت میں علمائے میں اور خصوصًا ایران کے علما کی حالت میں یہ انقلاب کچھ معمولی انقلاب نہیں ہے۔ اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے۔ کہ اگر یہ بااثر طبقہ کسی خیال یا رائے کے موافق ہو جائے تو اصلاح میں کس قدر آسانی ہوتی ہے۔

خان والدہ کی صُحبتوں کی یہ گرمی ماہ مبارک محرّم میں مبدّل بہ مجالس عزاداری ہو جاتی ہے۔ صحن کے وسط میں ایک مسجد ہے۔ اس کے قریب شامیانے لگا کر عزاخانہ بنایا جاتا ہے اور اس میں محرّم میں مرثیوں کی مجالس کے علاوہ پُرجوش ماتم ہوتا ہے۔ جس سے دیکھنے والوں کے دِل ہل جاتے ہیں۔

معزّز ایرانی عمومًا استانبول میں بھی اپنے ملک کا لباس پہنتے ہیں۔ یا اگر اور کچھ نہیں تو کم از کم ٹوپی ایرانی ہوتی ہے۔ یعنی اُونچی دیوار کی سیاہ بانات کی

ٹوپی - جو ہمارے ہاں ہندوستان میں بھی بعض جگہ مروّج ہے - اور خان بُالدہ میں
کئی پُرانی وضع کے ایرانی اپنے گھیرے دار چُنٹے ہُوئے کوٹ بھی پہنے نظر آتے
ہیں - شہر کے اس حصّے میں کئی ایرانی نان پز بھی رہتے ہیں جو ایرانی روٹیاں
بیچتے ہیں - غرض اس قدیم عمارت کے اندر اور اس کے قرب و جوار میں ایران کا
سماں آنکھوں میں پھر جاتا ہے - افسوس کہ پُرانی ہونے کے سبب اس کے بعض حصّے
اب خطرناک ہیں - چنانچہ ایک حصّہ ہمارے قیامِ استانبول کے زمانے میں ایک
رات کو اچانک گر گیا - رات کو چُونکہ لوگ وہاں کم رہتے ہیں - اور وُہ حصّہ اتفاق
سے خالی تھا - اِس لئے یہ خیریت رہی کہ جانوں کا نقصان نہیں ہوا - اب جب وُہ
از سرِ نو بنایا جائیگا تو نئی عمارتوں کی طرز پر بنے گا - زمانہ اِسی طرح ہر دَور میں
ہر جگہ تبدیلیاں کرتا رہتا ہے - جو پُرانی چیزیں باقی ہیں وُہ غنیمت ہیں - اُنکو
دیکھ کر عہدِ رفتہ کی کہانیاں یاد آتی ہیں اور اُس وقت کے تمدّن کی ایک
جھلک دکھائی دیتی ہے ÷

جامع ایوبؓ و ہفت برج

شہر کی بڑی بڑی عمارتوں سے فارغ ہو کر فصیلِ قدیم کے باہر نکلیں تو سب سے مقدم قابلِ دید جامع ایوب ہی۔ حضرت ایوبؓ انصاری سا مقرب صحابی جس قطعہ زمین میں مدفون ہو۔ اس سے جو ارادت مسلمانوں کو ہونی چاہیئے وُہ ظاہر ہے۔ اُنکا عربوں کے حملۂ اوّل کے ساتھ۔ شہر کے گرد محاصرہ کیئے پڑے رہنا اور آخر یہیں بیمار ہو کر رحلت فرمانا تو تاریخوں میں مذکور ہے۔ لیکن فتح قسطنطنیہ سے پہلے عثمانیوں کو اُن کے مزار مبارک کا ٹھیک نشان نہیں معلوم تھا۔ اِتنا سُنتے تھے کہ شہر کے باہر فصیل سے تھوڑے فاصلہ پر فلاں گوشے میں مدفون ہیں۔ شیخ شمس الدین (ابیض) نے جو عہدِ سُلطان فاتح میں وُلیِ کامل مانے جاتے تھے۔ سلطان کو مژدۂ فتح دیا اور کہا کہ حضرتِ ایوبؓ انصاری کے مزار کا نشان انہیں خواب میں دیا گیا ہے۔ اس نشان کے مطابق سلطان محمد فاتح نے مزار تعمیر کرایا اور اس کے ساتھ ایک شاندار مسجد بنائی۔ اور یہ مسجد باوجود شہر سے دُور ہونے کے استانبول کی آباد ترین مساجد میں ہے اور اس مزار کی وجہ سے جو فروغ اور شہرت اِسے حاصل ہے وُہ مزید برآں۔ ہر روز ایک میلا سا لگا رہتا ہے اور جمعہ کے دن تو زائرین کی جن میں ہر طبقے کے زن و مرد موجود ہوتے ہیں۔ بہت ہی کثرت ہوتی ہے۔

استانبول میں ہر کہ و مہ اس مقام کو مقدس سمجھتا ہے۔ اسی تیمن اور تبرک

کے خیال سے سلاطینِ عثمانیہ کی تاج پوشی پر ہر نیا بادشاہ یہاں آتا ہے اور بانیِ خاندان سلطان عثمان غازی کی تلوار اپنے کمر بند میں لٹکاتا ہے۔ اس احاطے میں اور اس کے قریب مدفون ہونے کی سب کو آرزو رہتی ہے۔ اور جن لوگوں کو اس قبرستان میں اپنے خاندان کی قبروں کے لئے تھوڑی سی زمین میسّر آجائے وُہ اپنے آپ کو بہت خوش قسمت سمجھتے ہیں۔ پُرانے زمانے کے وزرا اور ارکینِ دولت بیشتر اسی قبرستان میں سو رہے ہیں۔ اور اس سبب سے یہ علاقہ مسلمانوں کو اَور بھی عزیز ہو گیا ہے۔ اس کے گرد چھوٹی سی آبادی ہے جو شہر سے جُدا ہے۔ یہ آبادی ساری مُسلمانوں کی ہے۔ کیونکہ اس مزار اور جامع کی تعظیم یہاں تک کی جاتی ہے کہ غیر مذاہب کے لوگوں کو نہ مسجد میں آنے کی اجازت ہے۔ نہ اس علاقہ میں زمین یا مکان خریدنے کی۔

استانبول سے جامع ایّوب کو جانے کے کئی راستے ہیں۔ مگر سب سے آسان اور مقبول راستہ یہ ہے کہ بڑے پُل سے کشتی میں بیٹھ گئے اور عین جامع ایّوب کے سامنے جا اُترے۔ اُترتے ہی ہندوستان کے مشہور اولیا کی درگاہوں کا نظّارہ یاد آتا ہے۔ احاطہ مسجد کے باہر ایک بازار سا بن گیا ہے۔ جہاں دو رویہ کچھ عارضی کچھ مستقل دوکانیں لگی ہیں۔ نان بائی نان اور کباب بیچ رہے ہیں۔ کہیں دودھ دہی کی دوکان ہے۔ کہیں سستی مٹھائی کی۔ کہیں میوہ فروش ہے کہیں گل فروش۔ زائر آتے جاتے ان دوکانوں میں بیٹھ کر آرام کرتے اور کھاتے پیتے ہیں۔ جُمعہ کے دِن بھیڑ بہت

اور دُنبوں کے گلّے بھی اس جگہ کے قریب کھڑے رہتے ہیں - کیونکہ اکثر لوگ اُس دن کسی نہ کسی آرزو کے پُورا ہونے کی منّت بڑھاتے اور قربانی کرتے ہیں - گوشت وہیں غربا اور فقرا میں بانٹ دیا جاتا ہے - سائلوں کی بھی ویسی ہی کثرت رہتی ہے جیسے ہندوستانی خانقاہوں پر - اور چونکہ ہر شخص یہاں خیرات اور عبادت کے لئے تیّار ہو کر آتا ہے - اِس لئے سائل عموماً یہاں سے محروم نہیں پھرتے -

مَیں اس مزار مبارک اور اس جامع شریف کی زیارت کو ایک جمعہ کے دِن گیا - اس مزار پر کئی تربت دار متعین ہیں - اور اُن میں سے ہر ایک اپنے اپنے دن باری باری حاضر رہتا ہے اور اُس دن کی فتوحات اس کے حصّے میں آتی ہیں - جس دن ہم وہاں گئے اُس دن حافظ علی حلمی آفندی کی نوبت تھی - وُہ نہائت التفات سے پیش آئے - ایک کنوّاں مزار کے ایک گوشے میں ہے - جس کا پانی عورتیں آنکھوں کو لگاتی ہیں اور لوگ تبرّکاً لیجاتے ہیں - حافظ صاحب موصُوف نے اپنے ہاتھ سے وُہ پانی ہمیں پلایا - قرآن مجید کے قلمی نسخے جو وہاں رکھے ہیں دکھائے - اور ہماری التماس دُعا پر ہاتھ اُٹھا کر دیر تک دُعا کی - اس کے بعد جامع مسجد میں ہم نے دیکھا کہ اس مسجد میں تُرکی عورتیں نماز کے لئے بکثرت آتی ہیں اور بعد نماز مسجد کے ایک گوشے میں جو لوہے کی جالی کے ذریعہ باقی حصّے سے علیحدہ کیا ہُوا تھا - عورتوں کی ایک جماعت وعظ سُننے کے لئے بیٹھ گئی اور وہاں ایک مولوی صاحب دیر تک وعظ کہتے رہے -

استانبول میں جا بجا آبادی کے ہر حصّے میں نئے زمانے کے رسم و رواج کی قبولیت کے آثار نظر آتے ہیں - اور یورپ کا رنگ کم و بیش ہر طبقے پر اپنا اثر دکھا رہا ہے -

مگر یہ حصّہ اُس اثر اور اُن نشانات سے خالی ہے۔ یورپ کے اس کونے میں ایشیا کی قدامت اپنا لازوال ہونا ثابت کر رہی ہے۔ یورپ کے سیّاح جب یہاں کے ہجوم دیکھتے ہیں۔ یا اس علاقہ کے اِرد گرد کے شہرِ خموشاں کی سیر کرتے ہیں تو وُہ اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے۔

پیر لوٹی[۵۱] اپنے جدید ناول میں جابجا قبرستانِ ایّوب کا تذکرہ کرنے سے اس اثر کا اظہار کرتا ہے۔ اُس کی خیالی عورتوں میں سے ایک اپنے فرانسیسی دوست انڈرے کو جس سے وہ قبرستان میں گفتگو کر رہی ہے۔ کہتی ہے۔ "مَیں نے یہ جگہ اِس لئے منتخب کی کہ تجھے بھی اس سے اُنس ہے اور ہمیں بھی۔ کیونکہ جب ہمارا وقت آئے گا تو ہماری یہی آرزو ہوگی کہ ہم اپنی آخری نیند کے لئے یہیں کی خاک کو اپنا بستر بنائیں۔ اس فقرہ کے سُننے سے آنڈرے کے دل میں جو خیالات گذرتے ہیں اُنکی تصویر پیر لوٹی یوں کھینچتا ہے:-

"یہ فقرہ سُن کر انڈرے حیرت سے اُن تینوں پردہ دار عورتوں کو دیکھنے لگا اور دِل میں کہنے لگا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ اس جوانی میں بیسویں صدی کے ان تازہ نونہالوں کو جن کے خیالات اکثر باتوں میں انتہا درجے کی جدّت لئے ہُوئے ہیں

[۵۱] فرانس کا ایک مشہور ناولسٹ ہے۔ اس کے تازہ ترین ناول "دیزاں شانتے" میں استانبول کے کئی دلچسپ نقشے ہیں۔ ناول کا منشا یہ ہے کہ فرانسیسی وغیرہ کی کتابیں پڑھنے سے جو آزاد خیالی حرم کی عورتوں میں پیدا ہُوئی ہے۔ اس کا اظہار کیا جائے۔ اس کا فرضی ہیرو ایک فرانسیسی مصنّف ہے اور حرم زینب اور ملک تین فرانسیسی پڑھی ہُوئی لڑکیاں چوری چوری اس سے ملتی اور خط و کتابت کرتی اور اُسے کہتی ہیں کہ اپنے قلم کے ذریعے سے اُنکی اور اُنکی بہنوں کی حمایت کرے۔

جن کی گفتگو پیرس کی نوجوان لڑکیوں کی گفتگو ہے۔ آخر اس متبرک جنگل میں لیٹنے کی آرزو ہے۔ جہاں سالہائے ہجری کی گذشتہ صدیوں کے پُرانے یادگار بڑے بڑے عمامے باندھے لیٹے ہوئے ہیں؟ کیا سچ مُچ ایک دن یہیں کہیں کسی سنگ مرمر کے مزار میں یہ اپنا دھانی قبر پوش اوڑھے لیٹی ہونگی اور کبھی کبھی اُن کے عزیز شام کو آکر اُنکے سرہانے دِیا جلایا کرینگے؟ ہائے! یہ اسلام ہمارے لئے ہمیشہ ایک راز سربستہ رہیگا اور اسی کے اثر سے یہ عورتیں اپنے آپ کو سر سے پاؤں تک لپیٹے ہوئے ہیں"۔

کشتی کے راستے کے سوا ایک اور راستہ جامع ایوب کو جانے کا ہی۔ جو پانی کے راستے سے زیادہ دلچسپ ہی۔ کشتی پر جانے سے اِتنا لُطف ضرور ہے کہ سمندر کے اُس بازو کا۔ جو خشکی کی طرف پھیل کر استانبول کی رونق کا باعث ہوا ہے اور شاخ زرین کہلایا ہے۔ رخ تمام نظر آجاتا ہے۔ لیکن خشکی کے راستے جائیں تو یدی قلّہ اور شہر کی قدیم دیواریں اور کئی پُرانے دروازے بھی دیکھے جا سکتے ہیں اور اس لحاظ سے یہ راستہ قابلِ ترجیح ہی۔ یدی قلّہ خود تاریخی چیز ہے اور دیکھنے کے قابل۔ گو اب محض کھنڈر ہے۔ یہ بھی جامع ایوّب کی طرح سُلطان محمد فاتح کی نشانی ہے۔ اور پھر اس سے آگے دیوارِ شہر کے ساتھ ساتھ چلیں۔ تو دائیں ہاتھ دیوار چلی جاتی ہی اور بائیں طرف قبرستان کا سلسلہ شروع ہوتا ہے جو برابر جامع ایوّب تک چلا گیا ہے۔

اب جہاں یدی قلّہ ہے وہاں مسلمانوں کے عہد سے پہلے بھی ایک قلعہ نما عمارت تھی۔ جس کے پانچ بُرج تھے۔ فتح کے وقت وُہ مِٹنے کے قریب تھی۔ سلطان فاتح نے

از سرِ نو وہاں ایک مضبوط عمارت بنائی جس کے سات بُرج تھے۔ اس عمارت میں خزانہ سرکاری رہا کرتا تھا اور پھر ایک مُدّت تک اس سے شاہی زندان خانہ کا کام لیا گیا۔ لندن میں جو کام لندن کے مشہور ٹاور اور پیرس میں وہاں کے باستیل سے لیا گیا۔ وہ کام قسطنطنیہ میں یدی قلہ یعنی ہفت بُرج کے سپرد تھا۔ کئی مُشتبہ اُمرا وہاں مقیّد رہے اور مارے گئے۔ ایک سُلطان وہاں مقتول ہوا۔ ممالکِ غیر کے لوگ وہاں محبوس ہوتے تھے۔ ایک عرصہ تک یہ دستور رہا کہ جب تُرکوں میں اور کسی دُوسری سلطنت میں جنگ ہوجاتی تھی تو اُس دولت کا سفیر یدی قلہ میں قید کردیا جاتا تھا۔ آخری سفیر جو وہاں قید ہوا فرانسیسی سفیر تھا۔ لیکن پھر جب معاہدے کی رُو سے سُفرا ہر حالت میں ایسے سلوک سے بری قرار دیئے گئے تو یہاں سے بھی یہ دستور اُٹھ گیا۔ اس عمارت کے تین بُرج گر گئے ہیں اور اب صرف چار باقی ہیں۔ مگر پُرانا نام چلا جاتا ہے۔

ہفت بُرج پر گویا قدیم شہر کی حد ختم ہوتی ہے۔ شہر سے باہر نکل کر مزارِ ایوب کی طرف چلیں تو پُرانے دروازے بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ سب سے پہلے توپ قپو یعنی توپ والا دروازہ ہے۔ مسلمانوں سے قبل یہ رومانس دروازہ تھا کیونکہ اس کے قریب سینٹ رومانس کا گرجا واقع تھا۔ اِسی دروازہ پر محمد فاتح کی بڑی توپ نے متواتر گولہ باری کی تھی۔ توپ قپو کے بعد اَدِرنہ قپو یعنی ادریانوپل دروازہ آتا ہے۔ توپ قپو سے لیکر اَدِرنہ قپو تک کی دیوار نہایت شکستہ ہے۔ آخری شدید زلزلے نے اس مضبوط دیوار تک کی بنیاد ہلادی۔ اسی دروازہ کے اندر مہر ماہ کی مسجد ہے جس کے زلزلے سے تباہ ہوجانے کا ذکر پہلے آچکا ہے۔

لیکن ایک اور مسجد قابلِ دید اس دروازہ کے اندر ہے۔ جسے ہم دیکھ سکتے ہیں۔ اس کا نام قعریہ مسجد یعنی نشیب والی مسجد ہے۔ یہ ہے تو چھوٹی سی۔ مگر کوئی یوروپین سیاح ایسا نہ ہوگا جو اسے دیکھے بغیر جاتا ہو۔ کیونکہ پہلے یہاں گرجا تھا اور گرجے کے زمانے کی تصویریں سقف اور در و دیوار پر اب تک موجود ہیں۔ تصویریں موزائیک کے کام کا عمدہ نمونہ ہیں۔ اندرونی حصّے کی تصویریں جہاں نماز پڑھی جاتی ہے لکڑی کے تختوں سے ڈھانپ دی گئی ہیں لیکن باہر کے حصّے میں جو اب ڈیوڑھی کے طور پر مستعمل ہے تصویریں کھلی رہتی ہیں۔ حضرتِ عیسیٰ اور حضرت مریم کی تصویروں کے علاوہ کئی تصویریں انجیل کے عہدِ عتیق یعنی توریت اور دیگر صحف کے قصص سے لی گئی ہیں۔

غرض اس نواح میں یدی قلّہ سے لیکر جامع ایوب تک شہر کے در و دیوار تاریخی حکایات کا ذخیرہ ہیں۔ اور فصیلِ شہر کے باہر ایک سنّاٹا اور ہُو کا عالم ہے۔ وہاں وُہ لوگ لیٹے ہیں۔ جو ان تاریخی انقلابات کے معرکوں میں شریک تھے۔ اب وُہ مصائبِ دُنیا سے فارغ ہو کر چین کی نیند سو رہے ہیں۔ اور بلند قامت سرو انکی پاسبانی کر رہے ہیں۔ ہر راہگزر پر فرض ہے کہ مُسلمان ہے تو بہ نظرِ ثواب یہاں فاتحہ پڑھتا جائے اور کسی اور ملّت کا ہے تو ادب سے چُپ چاپ گزر جائے کیونکہ سب کو ایک دن خاک میں ملنا ہے اور اس لئے خفتگانِ خاک جو ہم سے پہلے منزل پر پہنچ گئے ہیں۔ ادب کے مستحق ہیں۔ شاید یہاں کے قبرستانوں میں جو اور درختوں کی جگہ سرو کے درخت لگانے کا رواج ہے۔ اس میں بھی یہی مصلحت ہو کہ سرو ہر وقت خاموش ادب سے کھڑا ہے اور جب ہوا زور سے چلے تو بھی اسکی پتیوں میں کھڑکھڑاہٹ

نہیں ہوتی۔ شہر خموشاں کی خموشی استانبول کے ان بڑے قبرستانوں میں اپنا درجۂ کمال حاصل کیے ہوئے ہے۔ کہیں کہیں کسی خوش نصیب کی قبر پر پس ماندگان کی محبّت نے پھول اُگا دیئے ہیں اور عالمِ خموشی میں اُس کی قبر زبانِ حال سے کہہ رہی ہے ؎

اَے صبا بر برگہائے غنچہ پا آہستہ نہ
پاسبانانِ گُلہا صائبا خوابندہ است

کاغذخانہ

غم و شادی دُنیا میں توام ہیں ۔ قریہ ایوب سے اگر زائر چشمِ عبرت پُرآب لیکر نکلا ہو تو کچھ دُور جا کر اس کے دِل بہلانے کا سامان موجُود ہے ۔ ایوب سے تھوڑے فاصلہ پر ایک سیر گاہ ہے ۔ جہاں جمعہ کے دن عثمانی زن و مرد تفریح کے لئے جاتے ہیں ۔ ایک چھوٹی سی ندی جسے ترکی میں کاغذ خانہ صو کہتے ہیں ۔ اسی وادی میں بہتی ہے ۔ اور اسے شاداب کرتی ہے ۔ درختوں کے جھنڈ یہاں نظر کو لبھاتے ہیں اور چاروں طرف لہلہاتے ہوئے کھیت آنکھوں کو طراوت بخشتے ہیں ۔ ہوا صاف اور فرحت بخش ہے ۔ اس ندی کے کنارے ایک محل شاہی بنا ہے ۔ جسے کاغذ خانہ کوشک کہتے ہیں ۔ موجُودہ فرماں روائے روم اپنے زمانہ شہزادگی میں یہاں رہتے تھے ۔ اُنکی عزلت پسند طبیعت نے اس گوشۂ تنہائی کو اپنے لئے انتخاب کر لیا تھا ۔ جہاں وہ شہر کے شور و غل سے محفوظ خوبصورت قدرتی مناظر کے درمیان زندگی بسر کرتے تھے ۔ محل سے ملا ہوا ایک بڑا جنگل اُن کے شکار کے لئے تھا ۔ اب بھی گرما اور بہار میں شاہی خاندان کے لوگ یہاں سیر و شکار کے لئے آتے ہیں ۔ اس محل کے مقابل ندی کی دُوسری جانب کھُلا میدان ہے ۔ اس میدان میں موسمِ بہار میں تفریح کے شائقین کے جمگھٹے ہوتے ہیں ۔ اس کا مزا دیکھنے کے لئے مئی یا جون کے مہینے میں وہاں ہونا چاہیئے ۔ ہم نے اسے اگست میں دیکھا ۔ اس وقت ندی سُوکھ چلی تھی ۔ کیونکہ اس کا پانی تین چار مہینے

ہی رہتا ہے۔ چند کشتیاں پانی سے نکال کر کنارے پر رکھی ہُوئی تھیں اور سامنے
کے میدان میں کہیں کہیں کچھ تماشائی نظر آتے تھے۔ لیکن سُنا ہے کہ بہار میں اتنا ہجوم
ہوتا ہے۔ کہ جو دیر سے آئے اسے بیٹھنے کی جگہ نہیں ملتی۔ شوقین لوگ کشتیوں
میں آتے ہیں۔ مقتدر اصحاب کے خیمے باہر میدان میں لگے ہوتے ہیں۔ خور
و نوش کا سامان مہیا ہوتا ہے۔ عورتیں بکثرت آتی ہیں۔ دن بھر وہاں جماؤ رہتا
ہے۔ شام کو میلا ختم ہوتا ہے۔ کچھ پانی کے راستے کشتیوں پر کچھ گاڑیوں میں
کچھ پیدل گھر کو واپس جاتی ہیں۔

یورپ کے لوگ اس سیرگاہ کے بڑے دلدادہ ہیں۔ کیونکہ اس مقام کی
خوبصورتی کے علاوہ تُرکوں کی معاشرت کا ایک ایسا پہلو انہیں یہاں نظر آتا ہے
جو وہ اور کسی طرح دیکھ نہیں سکتے۔ اس ندی کو انگریزی اور فرانسیسی "آبِ شیرینِ
یورپ" کہتے ہیں۔ کیونکہ ایشیائی ساحل پر ایک اور ندی گنوک صو نامی بہتی ہے
اور اسے یورپ والے "آبِ شیرینِ ایشیا" پکارتے ہیں۔ وہ بھی نہایت خوش منظر
مقام ہے۔ اناطولی حصار یعنی سلطان محمد فاتح کے اس قلعہ کے قریب واقع ہے
جو اُس نے ایشیائی ساحل پر بنایا تھا جس کے مقابل رُومِ ایلی حصار یورپ والے
ساحل پر بنا ہُوا ہے۔

اس مقام کی سیر کے لئے گاڑی پر جانا ہو تو پیرا سے گاڑی ملتی ہے۔ وادی تک
پہنچنے کے لئے جو سڑک ہے وُہ اب تک بہت خستہ حالت میں تھی۔ لیکن حال میں
جو نئے شہر امین[1] مقرر ہُوئے ہیں اُنہوں نے سڑک کے درست کرانے کی طرف

[1] انگریزی عہدہ لارڈ میئر کے مقابل یہ عہدہ امینِ شہر کا ہے ۱۲

توجّہ کی ہے۔ اور ہمارے سامنے نصف کے قریب سڑک بن چکی تھی۔ جب یہ سڑک مکمل ہوگئی تو سواری کے لئے قسطنطنیہ کے قریب سب سے اچھی سڑک ہوگی۔ اب بھی ہوا خوری کے لئے بہت لوگ اکثر اُس طرف نکل جاتے ہیں۔ پھر ہر شام وہاں مجمع ہوجایا کریگا۔ صرف رمضان شریف کے مہینے میں یہ مقام بالکل سُونا رہتا ہے۔ کیونکہ روزہ دار شام کو افطار کی فکر میں ہوتے ہیں اور ویسے بھی اس مہینے میں دن کا وقت تفریح کی بجائے عبادت یا قرآن خوانی یا دیگر مذہبی مشاغل میں گزارتے ہیں۔

اگر کسی کے پاس وقت وافر ہو تو وادیٔ آبِ شیریں کی سیر کے علاوہ اس نواح کے اور قابلِ سیر حصّے جو اسی طرف مگر ذرا فاصلے پر ہیں۔ دیکھ سکتا ہے۔ کاغذخانہ سے باغچہ کوئی اور بیوک درہ کو راستہ گیا ہے اور یہ دونو مقامات نہایت سیر حاصل ہیں۔ بعض سیاح قریۂ بلغراد کے جنگل تک جاتے ہیں۔ لیکن وہاں کے لئے سارا دن صَرف کرنا پڑتا ہے اور ہم وہاں نہیں جا سکے۔ باغچہ کوئی کے قریب سلطان محمود اول کا مشہور "ایکوئی ڈکٹ" یعنی راہ آب ہے۔ جو ۱۷۳۲ء میں پیرا۔ غلطہ اور بشکطاش میں پانی بہم پہنچانے کے لئے بنایا گیا تھا۔ سرما میں مینہہ کا پانی دو بڑے حوضوں میں جو باغچہ کوئی سے میل بھر کے قریب بلندی پر واقع ہیں جمع کیا جاتا ہے۔ اور وادی بیوک درہ سے ہوتے ہوئے اس "اکوئی ڈکٹ" کے ذریعے جو طول میں پانچسو ساٹھ گز ہے اور اکیس محراب رکھتا ہے۔ شہر میں تقسیم ہوتا ہے۔ جہاں پانی بٹنا شروع ہوتا ہے۔ اُس مقام کا نام تقسیم پڑ گیا ہے۔

بلغراد کا جنگل اپنی وسعت اور پانی کے حوضوں کی کثرت کی وجہ سے مشہور ہے

آس پاس کے دیہات میں اور شہر کے بعض حصّوں میں پانی وہیں سے جاتا ہے۔ اِستانبول کے عیسائی سیر و تفریح کے لئے اس گاؤں اور اس جنگل کے گھنے سایہ کو ترجیح دیتے ہیں اور گرمی میں گروہ در گروہ یہاں آتے ہیں اور اس جگہ کا نام انہوں نے "دفعِ غم" رکھا ہے۔ ان کے لئے "بلغراد" وہی دلچسپی رکھتا ہے جو ترکوں کے لئے کاغذ خانہ۔ معلوم نہیں شروع میں اس ندی کے پاس کے گاؤں کو کاغذ خانہ کس اِعتبار سے کہا گیا۔ لیکن اب کاغذ خانہ۔ ہنسی کھیل کے مقام کا مترادف ہوگیا ہے۔ ایک زمانہ میں بادشاہ کے حضور میں ایک مشہور نقال لطائف و ظرائف کے لئے رہتا تھا جسے کاغذ خانہ آمامی کہتے تھے +

بوغاز و اطہ لر

استانبول میں ایک بڑی خصوصیت یہ ہو کہ یہ بحر و بر کا جامع ہے۔ جب جنگل اور پہاڑ کی سیر سے جی اُکتا جائے تو باسفور حاضر ہے۔ ترکی میں باسفور کو بوغاز کہتے ہیں۔ باسفور یونانی زبان کا لفظ ہے۔ اس کے معنے ہیں "راہِ گاو"۔ قدیم یونانیوں میں ایک قصّہ مشہور تھا کہ جوپیٹر دیوتا نے آیو کو اپنے اعجاز سے بچھڑا بنا دیا تھا اور وہ بچھڑا اس پانی میں سے پیر کر گزرا۔ غالبًا اسی اعتبار سے یونانیوں نے اس کا نام باسفور رکھا۔ ترکی لفظ بوغاز اس سے بالکل جُدا ہے۔ اس کے معنے ہیں دو پہاڑیوں کے درمیان کا درہ۔ اور چونکہ ساحلِ ایشیا کی پہاڑیوں اور ساحل یورپ کی پہاڑیوں میں حدِّ فاصل ہو۔ اس لئے اُسے بوغاز کہتے ہیں۔ سب سیّاح متفق اللفظ ہو کر یہ کہتے ہیں کہ بوغاز سے زیادہ خوش منظر جگہ دُنیا بھر میں ملنی مشکل ہے۔ ہم نے کئی دفعہ بوغاز کی سیر کی۔ اُن میں دو موقعے خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ ایک دن جب سفیر انگلستان کی مُلاقات کے لئے ترابیہ گئے اور دُوسرے جس دِن جلوسِ ہمایُوں کی رات بوغاز کے چراغان کی سیر کی۔

سرائے قدیم کے قریب شاخِ زرّین اور بحیرۂ مرمر سے اس مشہور آبنائے کا مقامِ اتّصال ہو۔ یہ آبنائے طُول میں اُنیس میل ہو۔ اس کا عرض زیادہ سے زیادہ بیوک درہ کے قریب بقدر دو میل کے ہو اور کم سے کم رومِ ایلی حصار کے سامنے ہے۔ جہاں اس کی چوڑائی کوئی آٹھ سو گز ہوگی۔ بڑے پُل سے مخصوصہ کمپنی کے جہاز

دِن بھر بوغاز کو آتے جاتے رہتے ہیں - اِن جہازوں کے دو درجے ہوتے ہیں - اور اِن کا ایک حصہ عثمانی مستورات کے لئے مخصوص ہوتا ہے - اُس کے سامنے پردہ پڑا رہتا ہے - عورتیں فراجہ پہنے اور چارشف مُنہہ پر ڈالے آتی ہیں اور پردے کی دُوسری طرف جا بیٹھتی ہیں - چُونکہ بوغاز کے دونوں طرف کے خوبصورت مکانات عمومًا اُمرا کے ہیں - اِس لئے اِن جہازوں پر عثمانیوں کے طبقہ اعلیٰ کی مستورات بکثرت سوار ہوتی ہیں - راستے میں جابجا جہازوں کے سٹیشن آتے ہیں کچھ لوگ اُتر جاتے ہیں - کئی نئی سواریاں جو منتظر کھڑی ہوتی ہیں - سوار ہو لیتی ہیں - بوغاز کے دونو کناروں پر کُل اٹھائیس سٹیشن ہیں - پندرہ ساحل یورپ پر اور تیرہ ساحل ایشیا پر - سارے جہاز ہر سٹیشن پر ٹھہرنے والے نہیں ہوتے بعض تیز رَو صرف ضروری مقامات پر ٹھہرتے ہیں اور بعض ہر جگہ رُکتے ہُوئے جاتے ہیں -

ترابیہ تک جاتے ہُوئے ساحلِ یورپ پر کئی ضروری مقامات نظر آتے ہیں - پہلے نکلتے ہی توپ خانہ کی عالیشان عمارت ہے - جس کے ساتھ ملی ہُوئی دو مساجد نظر آتی ہیں - جامع سلطان محمُود اور جامع قلیچ علی - توپخانہ کے احاطہ میں اسلحہ کا ایک بڑا کارخانہ ہے اور اس کے پیچھے بازار کی طرف وزیرِ توپ خانہ کا دفتر اور ایک جنگی مدرسہ ہے - کچھ آگے بڑھ کر گاس کا کارخانہ ہے اور اس کے بعد قصر طولمہ باغچہ جس میں تخت والا کمرہ نہائت شاندار بیان کیا جاتا ہے - اس کے بعد بشکطاش سٹیشن ہے - یہ محلّہ خیر الدین پاشا مرحوم کے مزار کے سبب مشہور ہے -

ف ریشمی نقاب جو عمومًا سیاہ ہوتا ہے - گو کبھی کبھی کسی اَور رنگ کا بھی ہوتا ہے ۱۲

اِس کے لفظی معنے ہیں - گہوارہ والی پہاڑی - اور یہ نام اسے اس لئے دیا گیا کہ خیر الدّین پاشا کے مزار کی صورت مہد کی سی ہے - خیر الدّین وُہی نامور امیر البحر ہے جس نے سُلطان سلیمان کے عہد میں یُورپ کی اُس زمانے کی مجموعی بحری افواج کو شکستِ فاش دی تھی - جس نے الجزائر اور ٹیونس کو فتح کیا تھا اور جس کے نام سے اُس زمانے میں یورپ کے لوگ کانپتے تھے اور اُسے "خوفناک باربرسا" کہتے تھے۔

بشکطاش سے آگے بڑھیں تو قصرِ چراغاں کی خوبصُورت عمارت ہے سلطان عبدالعزیز مرحوم نے یہ محل بنوایا تھا اور سلطان مراد یہیں نظربند رہے - قصرِ چراغاں کے عقب میں ہی قصرِ یلدیز بلندی پر واقع ہے اور اس کی عمارت کے کچھ حصّے بھی جہاز پر بیٹھے ہُوئے نظر آتے ہیں - اِس کے آگے سٹیشن اورتہ کوئی ہے - یہاں اچھّے اچھّے باغات ہیں - اور استانبول میں اِن باغوں کے میوے اور پھُول بکثرت پہنچتے ہیں - یہاں کنارِ آب پنجرہ دار چوبی عمارتوں کی ایک قطار چلی گئی ہے - یہ مُسلمانوں کے موسمِ گرما کے رہنے کے گھر ہیں - اِس قسم کے گھروں کو تُرکی میں یالی کہتے ہیں - ارنود کوئی اور ببک کے سٹیشن اس کے بعد آتے ہیں - ہزہائی نس خدیو مصر اور اُن کی والدہ اور اقارب کے محلّات ان سٹیشنوں کے قریب ہیں اور اُن کے گرد کے باغات اور پانی سے ملی ہُوئی سفید سنگِ مرمر کی سیڑھیاں ساحل کے اس حصّے کی زینت کا باعث ہیں - ببک کے بعد رومِ ایلی حصار سٹیشن آتا ہے - اس مقام کی تدریخی اہمیت کا ذکر پہلے ہوچکا ہے - اِس کی ساخت میں ایک خوبی یہ ہے کہ اِس کے بُرج پہاڑی نشیب و فراز پر اس ترکیب سے بنائے گئے ہیں - کہ دیواروں کے ساتھ ملکر اُن سے لفظِ محمّدؐ پیدا ہوتا ہے اور دُور سے دیکھنے والے کو

یہ معلوم ہوتا ہے - کہ یہ مُبارک نام دیو قامت حروفِ حجر سے لکھ کر اعلان کے طور پر
ہَوا میں معلق کر دیا گیا ہے - یہ سلطان محمد فاتح کی ایجاد پسند طبیعت کی ایک ادا
تھی - قلعہ کے اوپر کچھ فاصلے پر ایک نئی عمارت انگریزی قسم کی نظر آتی ہے - جو
گرد و پیش کے منظر سے کچھ مناسبت نہیں رکھتی - یہ عیسائیوں کا ایک بڑا کالج
ہے - جسے مسٹر رابرٹ نام ایک فیاض امریکن نے قائم کیا ہے - عین پہاڑی
کی چوٹی پر کالج کی عمارت سے بھی اوپر حاجی بکتاشی وَلی کا تکیہ ہو - جہاں اس
مشہور فرقے کے درویش رہتے ہیں -

روم ایلی حصار سے گذریں تو ینی کوئی سٹیشن ہو - یہاں یونان اور آسٹریا
کے سفرا کے تابستانی مکانات ہیں اور آبادی زیادہ تر ارمنی اور یونانی لوگوں
کی ہو - اِس کے بعد ترآپیہ ہے - برطانیہ - جرمنی - فرانس اور اطالیہ کے سفرا نے
اس مقام کو گرما کی اقامت کے لئے انتخاب کیا ہے - اور شاید یہ کہنا مُبالغہ
نہیں کہ انھوں نے یہاں کے متعدد خوبصورت مقامات میں سے بہترین مقام
چھانٹ لیا ہو - لب دریا اُن کے بلند مکانات آسمان سے باتیں کرتے ہیں
مکانوں کے گرد نہایت عُمدہ باغات ہیں - اور یہ لوگ بڑی شان سے رہتے
ہیں - سر نکولس اوکانر سفیرِ برطانیہ کو ہم نے نہایت خوش خُلق پایا - اور اُن کی
مہمان نوازی سے ہم متمتّع ہوئے - کھانے پر ہمیں لیڈی اوکانر سے بھی مُلاقات
کا موقعہ ملا - وُہ اخلاق میں اپنے شوہر سے بھی بڑھی ہُوئی ہیں - باتوں باتوں میں
معلوم ہوا کہ انہیں شطرنج کا بہت شوق ہے - شیخ مشیر حسین جو میرے رفیق تھے -
شطرنج کے بہت شائق ہیں اور اس میں عمدہ مہارت رکھتے ہیں - اُنھوں نے

کہا کہ کھانے کے بعد ایک بازی رہے - لیڈی صاحبہ نے خوشی سے منظور کیا -
کھانے کے بعد ہم سب ایسے کمرے میں بیٹھے جہاں دریچے سے سمندر کا پانی لہریں
مارتا نظر آتا تھا - لیڈی اوکانر اور شیخ مشیر حسین نے شطرنج شروع کی اور مَیں
اور سر نکولس لہروں کا تماشا دیکھنے لگے - مَیں نے فرصت غنیمت سمجھ کر پولیٹکل
شطرنج کے اُس مشّاق کھیلنے والے کو سیاسیات کی گفتگو کی طرف مائل کیا -
اور چاہا کہ سلطان المعظّم کے متعلّق کچھ اس کے خیالات سُنوں - وقت اور حالات
کی تاثیر سے وُہ بھی کسی قدر کھُلے - مَیں نے اُن سے کئی سوال کئے - وُہ سوال
اور اُنکے جوابات کا خلاصہ یہاں لکھے دیتا ہُوں :-

سوال - انگلستان کے اخبارات بعض دفعہ لکھتے ہیں - کہ قصرِ شاہی میں ایک
زبردست فریق ہے - اور بادشاہ اُن کے ہاتھ میں ہے - وزرا ایک مشورہ دیتے
ہیں - اور وُہ دُوسرا - اور عموماً وُہی رائے غالب ہوتی ہے جو اس زبردست فریق کی ہے -

جواب - جو لوگ اِس طرح لکھتے ہیں - وُہ یہاں کے حالات سے بے خبر ہیں
معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے - سب کاروبار سلطان "اپنے کفِ دست میں"[۵۷] لئے
ہُوئے ہے - نظامِ سلطنت کو اگر ایک بُنا ہُوا کپڑا فرض کریں تو اس کے سارے
تار سلطان کے ہاتھ میں ہیں - میرے نزدیک یہاں کی حکومت اس وقت شخصی
حکومت کی ایسی مکمّل نظیر ہے - کہ اس سے پہلے تاریخ میں کبھی نہیں ملتی - بڑے
بڑے پاشا اور مصاحب اور وزیر سب اپنی اپنی جگہ کانپ رہے ہیں اور کسی کو مجال
نہیں کہ اپنے ارادہ سے ایک ذرا سا کام بھی کر سکے -

[۵۷] اُس انگریزی محاورہ کا جو سر نکولس نے استعمال کیا - لفظی ترجمہ ہے ۱۲

سؤال ۔ سلطان المعظم کو یورپ کے اخبار عموماً نہائت بزدل اور ڈرپوک لکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وُہ ہر وقت اپنی جان کو خطرہ میں سمجھ کر ہراساں رہتے ہیں ۔ آیا آپ کا مشاہدہ اس خیال کی تائید کرتا ہے ؟

جواب ۔ نہیں ۔ مَیں نے بارہا دیکھا ہے کہ اُن کی طبیعت میں جرأت اور استقلال غیر معمولی ہوتا ہے ۔ اور جب کسی خطرہ سے اُن کا سامنا ہوا ہے تو انہوں نے اُس کی طرف سے کامل بے پروائی دکھائی ہے اور بالکل مرعوب نہیں ہُوئے ۔ ہر واقعی خطر کے سامنے یہ شخص شیر کی طرح کھڑا ہو سکتا ہے ۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ اُن خطرات سے جو سامنے نہیں ۔ مگر جن کا امکان یہاں ہر وقت موجود ہے (مثلاً سازش ۔ یا بغاوت) بچنے کے لئے احتیاطی تدابیر کا اُنہیں بہت خیال رہتا ہے ۔ خطرہ کی حالت میں مردانگی کی دو نمایاں مثالیں جو اُنہوں نے پیش کی ہیں اپنا جواب نہیں رکھتیں ۔ اوّل بڑے زلزلے کے موقعہ پر ۔ جب اُن کے چند درباری جو اُن کے رُوبرو تھے ۔ گھبرا کر بھاگنے لگے تو اُنہوں نے ہاتھ کے اشارے سے اُنکو روک دیا ۔ خود اپنی جگہ سے نہیں ہلے اور اُن کو سمجھاتے رہے کہ گھبرانا نہیں چاہئے ۔ اور بھاگنا مفید نہیں ۔ دوم حال میں جو سلاملق کے دن جامع حمیدیہ کے باہر گولا پھینکا گیا ۔ اور ہر شخص کا خیال تھا کہ شاید کوئی اَور گولا ابھی چھپا ہو جو سُلطان المعظّم کے محل میں داخل ہوتے وقت چھُوٹے ۔ اس وقت اُنہوں نے نہایت حوصلہ سے کام لیا ۔ اور خطرہ کی بالکل پروا نہ کی ۔ معمُول کے موافق گھوڑوں کی باگیں ہاتھ میں لیں اور گاڑی دوڑاتے ہُوئے محل کو چلے گئے ۔

سوال۔ مَیں نے یہاں کئی ایسی چیزیں دیکھی ہیں جن سے سلطان المعظم کا رحمدل ہونا ثابت ہوتا ہے۔ حالانکہ یورپ میں عموماً روایات اُن کے جبر تعدی کی مشہور کیجاتی ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ طبعی طور پر ہز مجسٹی نہایت نرم دل واقع ہُوئے ہیں لیکن بعض بعض موقعوں پر جو اظہارِ سختی ہوا ہے وُہ اُس طرزِ حکومت کا لازمہ ہے جو یہاں قائم ہے۔ ورنہ اُن کا ذاتی میلان ہمیشہ مہربانی اور سلوک کی طرف ہے۔

اس گفتگو کے بعد ہم سفارت خانہ انگریزی سے رخصت ہُوئے اور پھر جہاز میں سوار ہو کر ساحل کے نظّارے دیکھتے شہر کو واپس آئے۔ مگر اس کے بعد جب جلوسِ ہمایوں کی رات انہی مقامات کو پھر دیکھا تو جلوہ ہی اَور تھا۔ سلطان المعظم کی تخت نشینی کی سالگرہ ہر برس استانبول میں بڑی دُھوم دھام سے منائی جاتی ہے اور استانبول پر جو جوبن اُس تاریخ کو رات کے وقت ہوتا ہے۔ اُس کا بیان مشکل ہر۔ آنکھ ہی کچھ اس کیفیت کو سمجھ سکتی ہے۔ یُوں تو تمام شہر میں چراغاں کی رونق اور تماشائیوں کا ہجُوم دیکھنے کے لائق ہوتا ہے۔ مگر بوغاز کی سجاوٹ آدمی کو دنگ کر دیتی ہے۔ اُمرائے دولت اور اقربائے شاہی کے مکانات ایک بُقعۂ نور نظر آتے ہیں۔ ہزاروں چراغوں اور قندیلوں کی روشنی کا عکس پانی پر پڑتا ہے اور عجب بہار دیتا ہے۔ مکانوں کے پیچھے پہاڑیوں کی بلندی پر آتش گلزار بنی ہُوئی دکھائی دیتی ہے۔ روشنی کرنے والے اپنی خوش مذاقی اور اپنی صنعت کے جوہر دکھاتے ہیں اور ہر شخص آرائش میں جدت پیدا کرنا چاہتا ہے۔ لوگ جہاز پر سوار ہو کر یہ تماشا

دیکھنے جاتے ہیں - ایک طرف آرائش اور روشنی دیکھنے کو سب جھکتے ہیں تو کثرتِ خلائق سے جہاز اس کنارے کی طرف ڈھلوان بن جاتا ہے اور گمان ہوتا ہے کہ ابھی سب پانی میں جا رہینگے - اتنے میں دُوسری طرف سے کوئی پکارتا ہے - آہا ادھر دیکھو - دُوسرے ساحل پر فلاں عمارت کیسی سجی ہے - سب اُدھر جھک پڑتے ہیں - رات کو دیر تک یہ سلسلہ جاری رہتا ہے - جہازوں اور کشتیوں پر جو روشنی ہوتی ہے - وُہ اس کے علاوہ ہوتی ہے - کئی چھوٹی کشتیاں اس خوبی سے روشن کی جاتی ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک بطِ آتشیں پانی میں تیر رہی ہے - جب چاروں طرف روشنی کا یہ عالم میلوں تک چلا جائے تو اندازہ ہو سکتا ہے کہ منظر کیسا دلفریب ہوگا - حُسنِ اتفاق دیکھئے کہ جلوس کے موقعہ پر شبِ ماہ ہمیں میسر آگئی - شبِ ماہ کو بوغاز کے پانی کا نظارہ نہایت ہی پیارا ہوتا ہے اور پانی میں بیشمار چراغوں کے عکس چاند کی دھیمی اور راحت افزا روشنی کے ساتھ مل کر عجب بہار دیتے تھے

جیسے بوغاز میں شہر کے پُل سے دس بارہ میل تک جہاز پر جانا بہت دلچسپ ہے - ویسے ہی دُوسری طرف بحیرۂ مرمر کی سیر اور چھوٹے چھوٹے جزائر کے اس مجموعہ کو دیکھنا جو اُس کے اندر دس بارہ میل جانے پر آتا ہے - نہایت پُرلطف ہے - تُرکی میں جزیرہ کو اَطہ[۱] کہتے ہیں - اور کرنتانِ جمع ہے - پس اطہ کرنتان ہُوئے - یہ جزائر تعداد میں آٹھ ہیں - لیکن آباد صرف تین چار ہیں اور دو خصوصیت سے قابلِ دید ہیں یعنی پرنکپو اور ہلکی - پرنکپو کو ترک بیوک اطہ یعنی بڑا جزیرہ کہتے ہیں کیونکہ یہ سب میں بڑا ہے - انگریزی میں ان سب کا مجموعی نام جزائرِ شاہزادگان
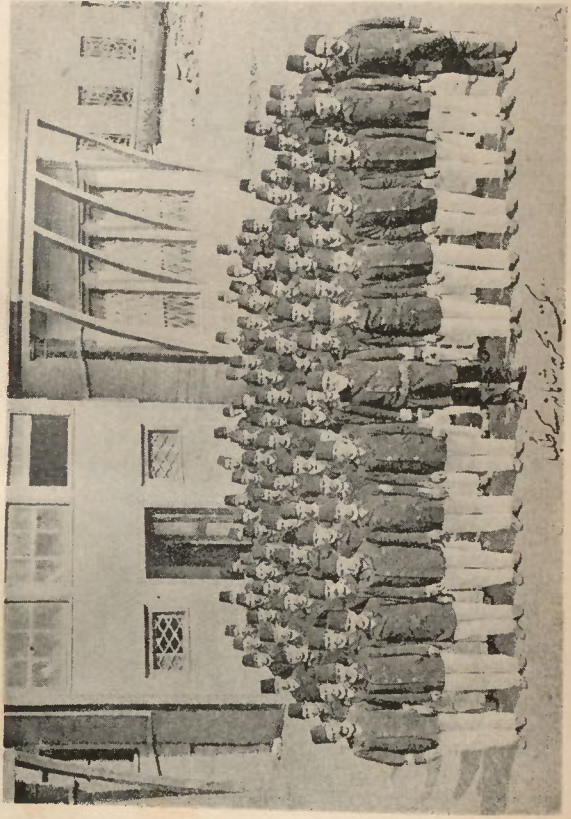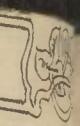
[۱] تلفظ اَدہ - کیونکہ ط کا تلفظ ترکی میں د ہے - جیسا کہ طولمہ باغچہ میں ۱۲

مکتب بحریہ شاہانہ کے طلبا

ہے۔ کہتے ہیں مُسلمانوں کے عہد سے پہلے معتوب شاہزادے یہاں محبوس رہتے تھے۔ اِس لئے یہ نام رکھا گیا۔ یہ یونانیوں کی بستیاں ہیں۔ یُونانی عیسائیوں کے پادریوں کے رہنے کا مکان اور اُن کے یتیم خانہ کی عمارت نہایت بلندی پر واقع ہو اور دُور سے نظر آنے لگتی ہے۔ پرنکپو میں ہوٹل بہت کثرت سے بنے ہیں اور جہازوں کے سٹیشن کے قریب سمندر کے کنارے کنارے چلے گئے ہیں سٹیشن کے پاس ہر وقت بہت رونق رہتی ہے۔ اور سمندر میں نہانے کی گاڑیاں بھی موجود ہیں۔ جزیرہ کا یہ حصّہ یورپ کے ساحلِ بحر کی زندگی کا قائم مقام ہے اور استانبول سے نہ صرف عیسائی لوگ بلکہ متموّل تُرک بھی گرمی کے موسم میں وقتِ فرصت یہاں سیر و تفریح کے لئے آتے رہتے ہیں۔ سٹیشن سے اُترتے ہی ہلکی ہلکی گاڑیاں سَیر کرانے کو حاضر رہتی ہیں جو گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے میں جزیرے کا چکّر لگا سکتی ہیں۔ جزیرے کے گرد سڑک بہت عُمدہ بنی ہے۔ جزیرے کے چاروں طرف پانی۔ وسط میں درختوں کے جھُنڈ۔ کنارے کنارے سڑک۔ سڑک کے اوپر چھوٹے چھوٹے خوش وضع باغات اور باغوں کے پیچھے رنگارنگ کے بنگلے۔ یہ سب مِلکر ایک ایسی تصویر بنتی ہے۔ کہ آنکھ اُس کے دیکھنے سے سیر نہیں ہو سکتی۔ یہاں گدھے کی سواری کا بھی دستور ہے۔ یورپین لوگ یہاں گدھے پر خوشی سے سوار ہوتے ہیں۔ کیونکہ ایک تو انہیں یہ انوکھی چیز معلوم ہوتی ہے۔ اور دُوسرے بعض چھوٹے راستوں میں جہاں گاڑی کی سڑک نہیں ہے۔ وُہ اس سواری پر بہ آسانی پہنچ سکتے ہیں۔ یُورپ میں بھی بعض جگہ سمندر کے کنارے بچوں کے لئے گدھے کی سواری کا دستور ہے۔ لیکن یہاں معمّر فرنگیوں اور بانکی فرنگنوں کو گدھے پر بیٹھے دیکھ کر ہنسی آتی تھی

پرنکپو سے قریب ترین جزیرہ ہلکی ہے - اور اس میں بحریہ کالج قابلِ دید ہے
افسوس کہ ہم اسے اُتر کر نہ دیکھ سکے - جہاز پر ہی سے اس کی عمارت کو دیکھا اور جہاز پر ہی
مدرسے کے چند طلبہ سے مُلاقات کا اتفاق ہوا - اس کے دیکھنے کے لئے ہمارا ارادہ
پھر ایک روز آنے کا تھا - مگر وُہ بہت سے ارادوں کی طرح ارادہ ہی رہا۔ ع

بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے
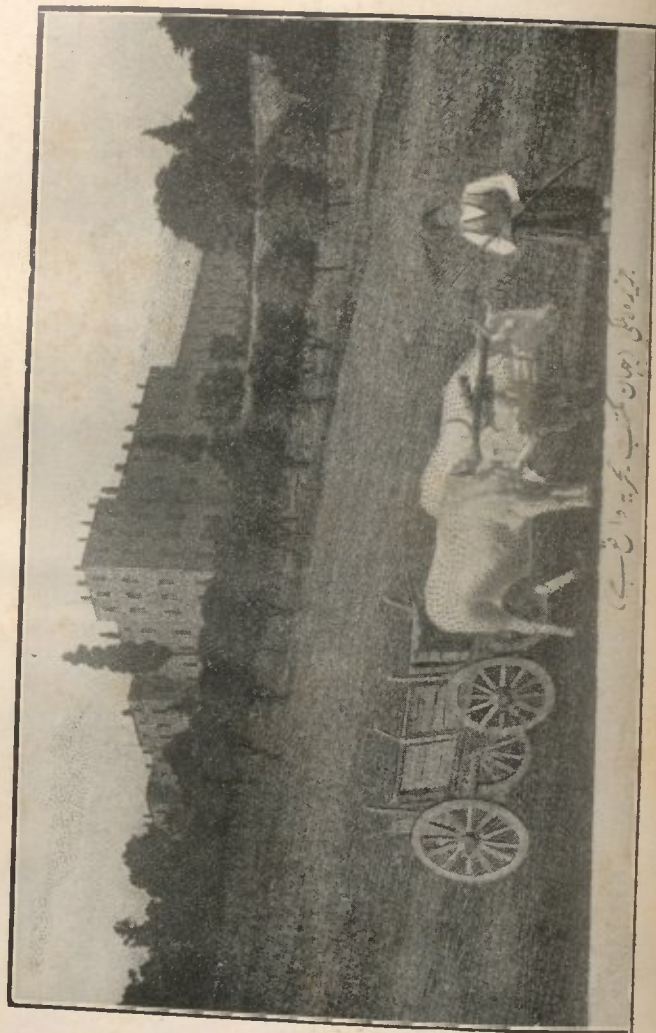
جزیره‌لکی (جهان مکتب بحریه واقعدر)

ہریکہ

جہاز پر مختصر سی سیر کرنے کے لئے جیسے جزیرۂ پرنکپو اور اس کے قریب کے دوسرے جزائر اہل استانبول کے واسطے نہایت عمدہ موقعہ پر واقع ہوئے ہیں۔ ویسے ہی ریل پر سیر کرنے کے لئے ہریکہ ہے۔ کہ آدمی صبح کو استانبول سے چلکر اور دن کا ایک معقول حصّہ نہائت دلچسپ طور پر اس خوبصورت مقام میں صرف کر کے شام کو بآسانی واپس آسکتا ہے۔ مقام حیدر پاشا سے جو ایشیائی ساحل پر واقع ہے۔ اناطولی ریل شروع ہوتی ہے جو قونیہ تک جاتی ہے اور اسی کے سلسلے میں آگے بغداد تک ریل کی سڑک بن رہی ہے۔ ہر شخص کو جو استانبول آتا ہو قدرتی طور سے اس ریل پر تھوڑی دُور تک جانے کا شوق ہوتا ہے۔ تاکہ معلوم ہو کہ ایشیا میں ایک ایشیائی دولت کی ریل کیسے چلتی ہے۔ اور اس مطلب کے لئے ہریکہ موزون ہے۔ ایک سرسبز پہاڑ پر یہ چھوٹا سا گاؤں ہے۔ جو بہ سبب "فبریکہ" ہمایوں یعنی شاہی کارخانہ شال و ابریشم کے مشہور ہوگیا ہے۔ کارخانہ کے لئے جو موقع چُنا گیا ہے۔ اُسے قدرت نے اس قدر دل لگا کر سجایا ہے۔ کہ بہشت کا ایک چھوٹا سا قطعہ معلوم ہوتا ہے۔ ایک طرف سبز پوش پہاڑ اور اُن کے شفاف پانی کے قدرتی چشمے۔ دوسری طرف سمندر۔ جسکی لہریں مدام پہاڑوں کے قدم چوم رہی ہیں۔ دونوں کے درمیان دامن کوہ میں یہ خوبصورت آبادی۔ اور کارخانے کی عمارتیں۔ جن کے قریب مختلف چشموں کا پانی ملکر ایک نہر بن گیا ہے۔ اس نہر کا پانی ایسا صاف ہے کہ اس کی تہ میں جتنے سنگریزے ہیں۔

ہر ایک کا رنگ متمیز نظر آتا ہے - فبریکہ کے قریب سایہ دار درختوں کے جھنڈ ہیں
جہاں اس کارخانے میں کام کرنے والی لڑکیاں تعطیل کے وقت غزالوں کی طرح
دوڑتی پھرتی ہیں۔ کھیلتی ہیں - جھولے جھولتی ہیں - گاتی ہیں اور سہیلیوں کے
ساتھ دل بہلاتی ہیں - اُن کے چہروں سے سادگی اور معصومیت برستی ہے
کیونکہ اُن کے چال چلن کی یہاں ایسی نگہداشت کی جاتی ہے - جیسی ان کے
والدین کرتے - یورپ میں باوجود سخت کوششوں کے ایسے کارخانوں میں کام
کرنے والی عورتوں کی زندگی نہایت مصیبت کی زندگی ہے - اُن کے زرد
چہرے اور اُنکی کمزور اور خستہ حالت زبانِ حال سے ہر دیکھنے والے کو اپنی داستان
سناتی ہے - لیکن یہاں اس پُرفضا جگہ کے انتخاب - سکونت کے معقول انتظام
اور شرح مزدوری کی خاص رعایت کے ذریعے غریب لاوارث لڑکیوں کی ق[illegible]
میں زندگی اس طرح بسر ہوتی ہے - کہ اُس پر بہت سی گھر بار والی لڑکیاں رشک
کر سکتی ہیں -

کارخانہ کا مختصر حال بیان کرنے سے پہلے ریل کا تھوڑا سا تذکرہ ضروری
معلوم ہوتا ہے - ہر یکہ جانے کے لئے ہمیں سویرے ہی اُٹھنا پڑا - اور صبح
ساڑھے پانچ بجے گھر سے نکل کر چھ بجے حیدر پاشا کی طرف عبور کرنے کے
جہاز پر سوار ہوئے - جہاز کوئی بیس پچیس منٹ میں حیدر پاشا پہنچا دیتا ہے
جہاں جرمن کمپنی نے جس کے پاس بغداد ریلوے کا ٹھیکہ ہے بڑا عالیشان
سٹیشن بنایا ہے - لیکن ریل ہریکہ تک جانے میں چار ساڑھے چار گھنٹے لیتی ہے
حالانکہ اگر معمولی رفتار سے چلے جس سے ہمارے ہاں مسافر گاڑیاں چلتی ہیں تو

گھنٹے سے زیادہ کا راستہ نہیں اور ہندوستان کی ڈاک گاڑی تو کوئی گھنٹے بھر میں اتنی مسافت طے کرلے۔ ریل کی گاڑیاں آرام دِہ بنی ہیں۔ بالکل جرمنی کی گاڑیوں کا نمونہ ہیں۔ اور سٹیشن بھی اچھے ہیں۔ ریل کے اہلکاروں کا مسافروں سے سلوک بھی اچھا ہے۔ اور تیسرے درجے والے غریب مسافر کی وُہ ذلّت یہاں نہیں جو بیچارے ہندوستان کے مسافروں کے حصّے میں آتی ہے۔ لیکن رفتار کی سُستی بہت تکلیف دِہ ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ وُہی لوگ جو یورپ میں اتنے چُست اور مستعد ہیں اور جو مشرق میں بھی جہاں کام بالکل اپنا ہو نہایت چالاکی دکھاتے ہیں۔ یہاں آکر اتنا سُست ہونا کیونکر گوارا کرتے ہیں۔ یہ لوگ حکومتِ عثمانیہ کو اپنی معمولی حکمتوں سے خوش کر دیتے ہیں سٹیشن پر کئی عمارتیں گنبد دار بنائی ہیں۔ جن میں مشرقی طرزِ تعمیر کی تقلید کی گئی ہے۔ ریل کے سب افسر خواہ وُہ جرمن ہوں۔ خواہ کسی اور مُلک کے رہنے والے۔ ترکی ٹوپی اوڑھتے ہیں۔ اور ان باتوں سے وُہ حکّام کا دِل لُبھا لیتے ہیں۔ مگر اُن کی گہری چال بے ڈھب ہے۔ اس ریل کی آمدنی کی ترقی کے لئے جو جو وسائل درکار ہیں اور جو ترغیبیں مسافروں کو کھینچنے کی ایسی اَور کمپنیاں یورپ میں کرتی رہتی ہیں۔ اُن سے وہ کام نہیں لیتے۔ اِس لئے کہ اس سہل انگاری میں ان کا سرِ دست کچھ نقصان نہیں۔ ٹھیکہ کی شرائط ایسی ہیں کہ حکومت کی طرف سے اُنہیں فی میل ایک مقررہ سالانہ آمد کی ضمانت دی گئی ہے۔ اس طرح اگر آمدنی میں کمی رہے تو اسے پُورا کرنے کا بار حکومت کے ذمّے ہے اور اس ناقص شرط کے باعث کئی نقص اس ریل میں پیدا ہو گئے ہیں۔ گاڑیاں دِن بھر میں بہت کم چلتی ہیں۔ حالانکہ

مُسافروں کی تعداد خاصی ہے ۔ عجیب بات ہے ۔ کہ اِس سڑک پر گاڑیاں رات کو بالکل نہیں چلتیں ۔ دن میں جتنا فاصلہ طے ہو گیا ہو گیا ۔ شام کے بعد حرکت موقوف ۔ مسافر سٹیشن پر اُتر پڑیں اور وہیں رات کاٹنے کا بندوبست کریں ۔ باقی سفر کے لئے صبح پھر سوار ہولیں ۔ میرا قصد تھا کہ مَیں قونیہ تک اس سڑک پر ہو آتا ۔ مگر اس سبب سے کہ دو دن سے زیادہ کا سفر پڑتا تھا میں نے وُہ ارادہ ترک کر دیا ۔ رات کو حرکت نہ کرنے کا حکم دولت کی طرف سے ہی اور اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ رات کا سفر محفوظ نہیں سمجھا جاتا ۔ اگر کسی کے پاس وقت وافر ہو اور مجبوراً بار بار اُترنے چڑھنے کی تکلیف سے نہ گھبرائے تو راہ قابلِ سیر ضرور ہے ۔ جتنا ٹکڑا ہم نے ہرکیہ جاتے تک دیکھا ۔ اُس کے دونوں طرف کا منظر نہایت خوشنما تھا ۔ دونو طرف پہاڑ ۔ درمیان میں سرسبز وادیاں ۔ باغات اور کھیت ۔ پہلے چند سٹیشن قریب قریب پڑتے ہیں ۔ یہ چھوٹے چھوٹے گاؤں ہیں ۔ جب گرمی میں اُمرا شہر سے نکل آتے ہیں تو عموماً ان مقامات میں رہتے ہیں ۔ یہاں آبادی کی صُورت جدید مذاق کے مطابق ہے ۔ ہر شخص کا ایک خوبصورت بنگلہ ہے اور اس کے گرد آراستہ باغ ۔ اور یہ سلسلہ میلوں تک چلا جاتا ہے ۔ اس ریل سے سفر کرنے میں ایک مزا یہ بھی ہے کہ بہت دُور تک بغداد کی پُرانی سڑک جس سے کاروان بغداد جایا کرتے تھے ۔ اس کے ساتھ ساتھ چلی گئی ہے اور اس کے چھوٹے چھوٹے ایک ہی وضع کے خوبصورت پُل پُرانے زمانے کے بنے ہُوئے جا بجا نظر آتے ہیں ۔

صبح سے دوپہر تک راستے کی دلچسپیوں سے محظوظ ہوتے ہُوئے ہم ہرکیہ پہنچے ۔ اتفاق سے اُس دن عیسائیوں کا ایک تیوہار تھا ۔ جتنی عیسائی لڑکیاں

کارخانے میں کام کرتی تھیں۔ وُہ رخصت پر تھیں۔ اور درختوں کے نیچے بیٹھی آرام کر رہی تھیں۔ اِن میں سے بعض کے لباس تو مغربی عیسائیوں کی طرح تھے۔ لیکن بعض بالکل ایشیائی لباس پہنے تھیں۔ چھینٹ کے شلوار کی طرز کے پاجامے اور رنگین کُرتیاں پنجاب کے اضلاع سرحد کے رہنے والی عورتوں سے انکی وضع بہت ملتی تھی۔ صحت و تندرستی میں بھی اُنہی کی طرح تھیں۔ اُن کی مُسلمان بہنیں کارخانے میں کام کر رہی تھیں۔ دونوں کے لباس میں زیادہ تمیز دوپٹے کی تھی۔ عیسائی لڑکیاں اکثر کھُلے سر پھرتی تھیں۔ اور مُسلمان لڑکیاں سب دوپٹے اوڑھے ہُوئے تھیں۔ مگر دوپٹے کچھ بہت بڑے نہ تھے۔ محض سر کو ڈھانپے تھے

حاجی عاکف بے جو فبریکہ کے "مُدیر" یعنی مہتمم ہیں۔ اُس دن "تشریف" نہیں رکھتے تھے۔ اُن کی جگہ اُن کے معاون حاجی فیضی آفندی اور محمد علی آفندی کاتبِ محصولات نے ہمیں کارخانے کی سیر کرائی۔ یہ کارخانہ سُلطان عبدالمجید مرحوم کے عہد سے قائم ہے۔ لیکن اس کی موجُودہ رونق اور ترقی سلطانِ حال کے زمانے میں ہُوئی ہے۔ پہلے سب کام ہاتھ سے ہوتا تھا اور اب تک ایک حصّہ میں بعض نہایت نفیس نمونے ریشم کے ہاتھ سے ہی بُنے جاتے ہیں لیکن سلطان عبد العزیز کے عہد میں چند کلیں بھی یورپ سے منگوائی گئیں اور رفتہ رفتہ کلوں کی توسیع ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ اب زیادہ تر کام کل ہی سے ہوتا ہے اور ریشم اور قالین کے سوا اور بھی ہر قسم کا کپڑا یہاں بننے لگا ہے۔ ایک بڑا احاطہ بانات اور کشمیرے کی ساخت کے لئے ہے اور اس کے پاس ایک دُوسری عمارت اس وقت بن رہی ہے جو ترکی ٹوپیوں

کے کارخانے کے لئے ہے۔ ترکی ٹوپیوں کا ایک بہت بڑا سرکاری کارخانہ
پہلے بھی موجود ہے جو جامع ایوب کے قریب واقع ہے۔ لیکن چونکہ وہ
کافی نہیں۔ اِس لئے اس فبریکہ کے متعلق ایک حصّہ ٹوپیوں کے لئے
تیّار ہونا قرار پایا۔ یہ بہت مغتنم ہے۔ کیونکہ ترکی ٹوپیوں کی مانگ ممالک
اسلامی میں روز بروز بڑھتی جاتی ہے اور استانبول میں بہت سے
کارخانوں کی ضرورت ہے۔ تاکہ اسلامی ممالک ان ٹوپیوں کے لئے آسٹریا
فرانس کے محتاج نہ رہیں۔ اب تک تو خود استانبول میں باہر کی آئی ہوئی ٹو
بہت بکتی ہیں۔ اصل یہ ہے کہ جب تک خود عثمانیوں کی توجّہ تجارت کی ط
نہ ہوگی اور اُن کے ذی استطاعت لوگ فرداً فرداً یا مشترکہ سرمایہ کے ص
پر تجارتی کارخانے نہ کھولینگے۔ اُس وقت تک یہ کمی پوری نہ ہوگی
کہانتک ایسی چیزوں کا اہتمام کرسکتی ہے۔ اور اگر کرے بھی تو یہ مشکل پڑ
کہ شاہی کارخانوں کے شاہانہ اخراجات ہوتے ہیں اور اس لئے مال دو
ملکوں کے تجارتی کارخانوں کی اشیا سے قیمت میں مقابلہ نہیں کرسکتا۔
فبریکہ کی بھی یہی کیفیت ہے۔ اس کا مال خوبی میں دُنیا کے ہر حصّے
مال سے لگّا کھاتا ہے۔ مگر ارزاں نہیں۔ کیونکر ہو۔ اس کا ایک بڑا مقصد
یتیموں اور بیواؤں کی پرورش ہے۔ اور یتیموں کی حفاظت کے لئے
عہدہ داروں کی ایک معقول جماعت یہاں مُلازم ہے۔ یہاں کے عہدہ
سب پیرمرد ہیں اور متدیّن۔ کیونکہ باوجود کارندوں کے ساتھ غیر معمولی
کے اس کارخانے سے نفع ہوتا ہے۔ حکومت کو کچھ گرہ سے نہیں دیتا

اور اس کا مال دُور دُور تک جاتا ہے۔ خصوصًا امریکا والے یہاں کے قالین اور بعض ریشمیں کپڑے بہت شوق سے خریدتے ہیں۔

کوئی دو ہزار آدمی اس کارخانے میں کام کرتے ہیں۔ اِن میں بارہ سو نوعمر یتیم ہیں۔ کچھ لڑکے کچھ لڑکیاں۔ مذہب و ملّت کی کوئی قید نہیں۔ رعایائے سُلطانی کے سب مذاہب اس میں داخل ہونے کا حق رکھتے ہیں اور داخل کئے جاتے ہیں۔ یہاں قالین کا کام زیادہ تر عیسائیوں کے ہاتھ میں ہے۔ قالینوں کے صیغے میں جو عورتیں اور لڑکیاں کام کرتی ہیں۔ اُن میں اس وقت اسّی فیصدی عیسائی اور بیس فیصدی مسلمان ہیں۔ لیکن کپڑا بُننے کے صیغے میں مسلمان زیادہ ہیں۔ اور عیسائی شاذ۔ لڑکیاں جو یہاں کام کرتی ہیں عمومًا گرد و نواح کے دیہات اور پہاڑی علاقے سے آئی ہوئی ہیں اور یہیں رہتی ہیں۔ اُن کے رہنے کے لئے عُمدہ مکان بنے ہیں۔ اور اُن کی سکونت کا سارا خرچ کارخانے کے ذمّے ہے۔ لڑکوں کے لئے مکان علیحدہ بنا ہے جو لڑکیوں کے مکان سے فاصلے پر ہے۔ اور لڑکیوں کے مکان میں کوئی مرد یا لڑکا نہیں جانے پاتا۔ یہ لڑکے لڑکیاں جو مزدوری کرتے ہیں۔ وُہ اِن کے حساب میں جمع ہوتی رہتی ہے اور جب وُہ جوان ہو کر کارخانے سے نکلتے ہیں۔ یا اُن کی شادی ہوتی ہے تو جمع شدہ رقم اُنہیں مل جاتی ہے۔ بارہ گھنٹے کا دن شمار ہوتا ہے۔ اور اس میں دوپہر کو ایک گھنٹہ کھانے اور آرام کے لئے ملتا ہے۔ ریشم کے محکمے میں جو عورتیں کام کرتی ہیں اُنکی مزدوری بالاوسط دو چُرک[1] روزانہ ہے۔ جو کاریگر شال بُنتے ہیں۔ اُنکی مزدوری چار چُرک روز

[1] چُرک لفظی معنی چوتھائی حصہ۔ ایک چاندی کا سکّہ ہے جو یورپ کے فرانک اور ہندوستان کے دس آنے کے برابر ہوتا ہے

کے قریب ہی اور جو لڑکیاں قالین بُنتی ہیں۔ انہیں ایک چرک روانہ ملتا ہے۔ اُن
میں اکثر بہت چھوٹی چھوٹی لڑکیاں ہیں۔ اور اُن کے لئے یہ بہت معقول مزدوری
لڑکوں اور لڑکیوں دونو کے لکھانے پڑھانے کا انتظام بھی یہاں کیا گیا
اور کام سیکھنے کے زمانے میں وُہ مدرسے بھی جاتے ہیں۔ ایک رُشدیہ مکتب
لڑکوں کے لئے جہاں کوئی اڑہائی سو لڑکے پڑھتے ہیں اور ایک مکتب ایک
دُوسرے مکان میں لڑکیوں کے لئے ہے۔ جہاں سو کے قریب لڑکیاں پڑھتی
ہیں۔ ریل کے سٹیشن کے پاس ایک چھوٹی سی مگر خوبصورت عمارت ہے۔ و
لڑکوں کا مدرسہ ہے۔ جب ہم گئے تو مدرسہ کا وقت نہ تھا۔ مگر وہاں کے مُعلّم
فارسی ہمیں مل گئے۔ اُن سے حالات سب معلوم ہُوئے۔ نقشۂ تقسیم اوقات اُنہوں
نے ہمیں دکھایا۔ مَیں نے نمونتہً ایک جماعت کی پڑھائی کے مضمون نقل کر لئے
معلوم ہو سکے۔ کہ کیا کیا چیزیں وہاں پڑھاتے ہیں۔ اور تعلیم کس درجے کی ہے۔ مضا
حسب ذیل ہیں:۔

(جماعت سوم) جُمعہ قرآن کریم۔ شنبہ کتابت۔ دوشنبہ منطق سہ شنبہ
فرانسہ[51] جہ۔ چہار شنبہ عقاید۔ پنجشنبہ موالید ثلاثہ۔

یہ ہوا ایک گھنٹے کا کام۔ دُوسرے گھنٹے کا کام دنوں کی مندرجہ بالا تر
کے ساتھ یہ ہے۔

نحو عربی۔ فارسی۔ موالید ثلاثہ۔ نحو عربی۔ تاریخ عثمانی۔ رسم[52]۔

فارسی کے مدرس راشد آفندی نے اثنائے گفتگو میں ایک فارسی رُباعی

[51] یعنی زبان فرانسیسی ۱۲ [52] نقاشی اور تصویر ۱۲

پڑھی جس کا مجھ پر بڑا اثر ہوا - وطن کی قدر غربت میں آتی ہے - اور وُہ رُباعی یادِ وطن سے بیتاب کرنے کو کافی تھی - وُہ معمر آدمی تھے - علاقہ قفقاس میں ایک مقام ہے قُبہّ - وہاں کے رہنے والے تھے - مگر مُدّت ہُوئی آب و دانہ یہاں لے آیا - اور پھر گھر جانا نہیں ہوسکا - ہمارے ساتھ بابِ عالی کے ایک عہدہ دار[۱] تھے - وُہ بھی قفقاسی تھے - اِنہیں دیکھ کر بوڑھے کے دِل میں یادِ وطن نے گدگدی کی - اور وُہ یہ رُباعی پڑھ کر آنکھوں میں آنسو بھر لایا - خود بھی تڑپا اور ہمیں بھی تڑپا گیا - واپسی پر راستہ بھر میں یہی دو شعر پڑھتا آیا ؎

در غُربت اگر مرگ بگیرد بدنِ من | آیا کہ کند قبر - کہ دوزد کفنِ من؟
تابُوتِ مرا جائے بلندے بگزارید | تا باد برد بُوئے مرا بر وطنِ من

[۱] جلال السنی بے مترجم بابِ عالی - صیغہ مطبوعات اجنبیہ جو بابِ عالی سے ہماری معیت کے لئے مامُور تھے - اور جن کا ذکر اِن اوراق میں کئی جگہ آئے گا ۱۲

مکاتب و مدارس

ہرکیہ کے چھوٹے سے مدرسے اور اُس کی ایک جماعت کے نصاب کی جو حالت بیان ہو چکی ہے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ استانبول کے بڑے بڑے مدرسے کیسے آباد ہوں گے اور اُن کی تعلیم کیسی ہوگی۔ لیکن افسوس مجھے مدارس کی سَیر کی حسرت ہی رہ گئی۔ جن دنوں مَیں وہاں تھا۔ وُہ تعطیل کا زمانہ تھا۔ سب مکاتب بند تھے۔ ہاں کہیں کہیں چند غریب طلبہ جو تعطیل میں کہیں نہیں جا سکتے تھے۔ مکاتب میں باقی تھے۔ تعلیم سے جو دِل بستگی مجھے ہے اُس نے تقاضا کیا کہ اس حالت میں بھی کچھ تو دیکھنا چاہیئے۔ مکتبوں کی عمارات میں نے دیکھیں اور وہاں کے اِنتظام کا حال دریافت کیا۔ بعض معلّمین اور بعض متعلّمین سے باتیں کیں۔ مکتبِ سلطانی۔ دارالشفقہ اور دارالخیر تینوں مکاتب نمونۃً دیکھے اور باقی کالجوں کو مجبورًا چھوڑنا پڑا۔ اِن تینوں کا تھوڑا سا حال لکھنے سے پہلے استانبول کی عام تعلیمی حالت کا ذِکر نامناسب نہ ہوگا۔

ٹرکی کی تعلیم کو دو مختلف پہلوؤں سے دیکھ سکتے ہیں۔ اوّل یورپ کے اور پایہ تختوں کے مقابلے میں۔ دوئم دیگر اسلامی ممالک یا ایشیائی دُوَل کی نسبت سے۔ پہلی صورت میں یہ کہنا پڑیگا کہ استانبول یورپ کے اور پایہ تختوں سے تعلیم کے لحاظ سے بہت پیچھے ہے۔ اوّل درجے کے مقامات مثل لندن و برلن و پیرس کا تو کیا کہنا۔ یورپ کے بعض چھوٹے چھوٹے پایہ تخت اپنی

علیحدہ یونیورسٹیاں اور ان کے متعلق کئی کئی کالج رکھتے ہیں۔ مگر استانبول میں ابھی تک کوئی یونیورسٹی نہیں۔ ہاں مختلف فنون کے متعدد عمدہ کالج ہیں۔ اور وہ بھی بیشتر جدید ہیں پہلے اتنا بھی سامان نہ تھا۔ دوسری صورت میں دیگر اسلامی ممالک سے مقابلہ کرتے ہوئے یہ ماننا پڑتا ہے کہ اور کسی اسلامی مُلک نے ابھی تعلیم میں اتنی بھی ترقی نہیں کی جتنی ٹرکی نے۔ اور ایشیائی دوَل میں عروج یافتہ جاپان کو چھوڑ کر باقی کوئی اس کے مقابل موجود نہیں۔ اس لحاظ سے دولتِ عثمانیہ کی سعی قابلِ داد ہے۔ یہاں نہ صرف معمولی تعلیم نے گذشتہ تیس سال میں نمایاں ترقی کی ہے۔ بلکہ ہر فن کے لئے ایک مستقل کالج قائم ہو گیا ہے۔ اور کامیابی کے ساتھ چل رہا ہے۔ اور اِن کالجوں کے مجموعے کی ترتیب سے ایک معقول یونیورسٹی بآسانی پیدا ہو سکتی ہے۔

زبانِ ٹرکی میں مکتب اور مدرسہ کے مفہوم میں فرق کیا جاتا ہے تعلیمِ جدید کے کسی شعبے کی جہاں پڑھائی ہو اُسے مکتب اور علومِ عربیہ اور دینیات کی جہاں تعلیم ہو اُسے مدرسہ کہتے ہیں۔ مدرسوں کا ذکر مساجد کے متعلق آچکا ہے۔ ہر بڑی مسجد سے ملا ہوا ایک مدرسہ ہے۔ طلبار کا گزارہ بیشتر مساجد کے اوقاف پر ہے۔ لیکن کئی جگہ یہ مدّ ان کے لئے مکتفی نہیں۔ اِس لئے وہ تعطیل کے زمانے میں اور خصوصاً ماہ رمضان میں دیہات سے جا کر کچھ زکوٰۃ وغیرہ حاصل کرتے ہیں اور اس پر گذارہ کر کے اپنی تعلیم مکمل کرتے ہیں۔ علومِ دینی کے طلبہ کی یہ حالت ایک بڑی اسلامی سلطنت کے زیر سایہ اور صیغہ دینیات کی قدر کے باوجود حیرت ناک ہے۔ کیونکہ انہی طلبہ میں سے بہت سے بعد میں ضروری امتحانات دیکر قاضی اور مفتی بن جاتے ہیں۔ اور ترقی کر کے حاکم کا رتبہ پاتے ہیں۔ شرعی عدالتوں میں وکیل بن سکتے ہیں۔ اور بعض اوقات بہت بڑے

مناصب پر پہنچ جاتے ہیں۔ اگر اس طبقہ کے اکابر علما کے اقتدار کی حفاظت کے خیر
سے ان غریب طلبہ کی مدد کے لئے مدرسوں میں روپیہ دیں اور انہیں مانگنے اور زکوٰ
بننے کی ذلت سے بچائیں تو بہت اچھا کام ہو۔

مدرسہ کی تعلیم ہمارے ہاں کے دینی مدرسوں سے بہت ملتی جلتی ہے۔ نق
اُسی قسم کا ہے۔ عربی۔ فارسی پڑھائی جاتی ہے۔ مگر شاذ ہے کہ ان طلبہ میں سے کو
عربی یا فارسی میں گفتگو کر سکے۔ مَیں نے جامع محمد فاتح کے دالانوں میں درس
بھی دیکھا۔ ایک جماعت حدیث اور ایک جماعت فقہ پڑھ رہی تھی۔ اُستاد پڑھ
جاتا تھا اور کہیں کہیں تشریح کرتا جاتا تھا۔ طالب علم کتابوں پر کہیں کہیں معنی یا تشر
لکھتے جاتے تھے۔ طلبہ لباس کے اعتبار سے ہمارے ہاں کے دینی مدارس
بہتر حالت میں تھے۔ سب کے لمبے مولویانہ چوغے اور عمامے بھلے معلوم
اب نئی تعلیم کے مکاتب کو لیجیے یہ تین درجوں پر منقسم ہیں۔ ابتدائی رُشدیہ
اعدادی۔ یہ قریب قریب ہندوستان کے پرائمری۔ مڈل اور ہائی سکول کا جواب ہیں
اعدادی مدارس میں مکتبِ سلطانی واقعہ غلطہ سب سے بڑا ہے۔ یہ مدرسہ سلطان عبدا
کے زمانے میں قائم ہوا۔ اکثر یورپی زبانیں یہاں پڑھائی جاتی ہیں اور ہر طالب علم
اختیار ہے کہ جو زبان چاہے انتخاب کرے۔ زیادہ میلان فرانسیسی کی طرف ہے
اس کے بعد جرمن۔ کوئی کوئی انگریزی بھی سیکھتا ہے۔ علوم مروجہ سے معمولی
واقفیت یہاں ہو جاتی ہے۔ اور یہاں سے نکل کر طالب علم اپنے اپنے مذاق کے
موافق کسی نہ کسی کالج میں جاتا ہے۔ بعض جو دفاتر کی ملازمت کے شائق ہیں وہ یہیں
فراغت پاتے ہی دفتروں میں نوکر ہو جاتے ہیں اور جو اعلیٰ درجوں کی ملازمت

چاہتے ہیں وُہ مکتب ملکیہ شاہانہ (سول سروس کالج) میں جا داخل ہوتے ہیں۔ جو وکیل بننا چاہتے ہیں۔ وُہ مکتب حقوق میں پڑھتے ہیں اور جو ڈاکٹر بننا چاہتے ہیں وُہ مکتب طبیّہ میں چاہتے ہیں۔ ڈاکٹری کے فن میں عثمانیوں نے نہائت قابلِ تعریف ترقی کی ہے۔ اور استنبول کے مکتب طبیّہ کے پڑھے ہوئے ڈاکٹر یورپ کے کسی "مڈیکل کالج" کے فارغ التحصیل طلبہ سے اپنے فن میں کم نہیں ہوتے۔ طب کی اعلیٰ درجے کی کتابیں ترکی میں ترجمہ ہو چکی ہیں۔ اور مکتب طبیّہ کے طالب علم فرانسیسی اور جرمن زبانوں کی واقفیت کے باعث اور بہت سی کتابیں جن کا ترجمہ نہیں ہوا پڑھ سکتے ہیں۔ آلات و اسباب سب جدید سے جدید مہیّا ہیں اور عثمانی کم از کم اس ایک صیغے میں اپنے معاصرینِ یورپ کے جلد برابر ہو جائینگے۔ یہ صیغہ کئی وجہ سے مقبول بھی ہے۔ اوّل تو فوج کی کثرت کے سبب فوجی ڈاکٹروں کی ایک بڑی تعداد ہر وقت مطلوب رہتی ہے۔ دُوسرے سرکاری شفاخانوں کی ملازمت کے سوا خاص شہر میں اپنے طور پر لوگوں کا علاج معالجہ کرنے والوں کی معقول کھپت ہے۔

مکتب سُلطانی کو جس وقت ہم نے دیکھا۔ اس وقت تعطیل کے سبب بیشتر طلبہ باہر جا چُکے تھے۔ مگر پھر بھی کوئی دو سو طالب علم موجُود تھے۔ اور انتظام کا ڈھنگ دیکھا جا سکتا تھا۔ اس مدرسہ میں طلبہ کی تعداد ایک ہزار کے قریب ہے۔ جن میں سے آٹھ سو بیرونجات کے ہیں اور وہیں رہتے ہیں۔ اُن کے سونے کے لئے مکتب کے کمروں کے اوپر بڑے بڑے کمرے ہیں۔ جن میں میز پر کھانا چُنا جاتا ہے اور وُہ بنچوں پر بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں۔ کھانے کے کمروں کی شستگی اور صفائی کا کماحقّہ خیال رکھا جاتا ہے۔ فیس مع خرچ سکونت پچاس روپیہ ماہوار کے

قریب ہی۔ لیکن دو سو غریب طلبہ مفت تعلیم پاتے ہیں۔ اس مکتب میں ہر ملت و مذ
کے طلبہ موجود ہیں اور سلطان کی عیسائی یہودی اور مسلمان رعایا سب اس سے یک
مستفید ہوتے ہیں۔ مکتب کی ایک خاص وردی ہی۔ جسے سب طالب علم پہنتے
خواہ مکتب میں ہوں۔ خواہ سیر کے لئے نکلیں۔ سیاہ بانات کا سوٹ اور ترکی
ٹوپی۔ کوٹ کے کالر پر مکتب کا نام۔ یہ دستور یہاں تمام بڑے بڑے مکاتب میں مو

مکتب سلطانی کے بعد ہم نے دار الشفقۃ دیکھا۔ یہ مکتب تعلیم کے درجے کے
اعتبار سے مکتب سلطانی کے برابر ہے۔ مگر فرق یہ ہے کہ یہ یتامیٰ کے لئے
مخصوص ہے۔ اور اس میں معمولی تعلیم کے علاوہ تار برقی کا کام سکھایا جاتا ہی
اور عثمانی ڈاکخانوں اور پولیس کے ملازم اس مکتب سے بھرتی کئے جاتے ہیں۔
اس میں آٹھ سو کے قریب طلبہ ہیں۔ جن کے سب مصارف مکتب سے ادا کئے
جاتے ہیں۔ دو بڑی بڑی دو منزلہ عمارتیں اس احاطے میں ہیں اور اُن کے گرد
ایک باغ ہی اور کچھ سادہ زمین ابھی خالی پڑی ہی۔ اس مکتب کی تاریخ دلچسپ ہے
استانبول بھر میں یہ ایک ہی مکتب ہی۔ جس کی بنیاد کوئی چالیس سال ہوئے
عام چندے سے ڈالی گئی تھی۔ یہ جوشِ اصلاح کا زمانہ تھا۔ جدید تعلیم کا چرچا پا
شروع ہوا تھا۔ ایک طرف انتظامِ سلطنت فرانسیسی سانچے میں ڈھل رہا تھا۔ دوسری
طرف قومی تعلیم اسی سانچے میں ڈھلنے لگی۔ یورپ کے یتیم خانوں میں اکثر لڑکے
اور لڑکیوں کے لئے ایک ہی احاطے میں جگہ ہوتی ہے۔ اس کی بھی یہاں
تقلید کی گئی۔ فرانس میں۔ یتیم لڑکوں میں سے اکثر کی تربیتِ ملکی
خدمات یا اشاعتِ مذہب کے لئے کی جاتی ہے۔ وہ

خیال یہاں بھی پیشِ نظر رکھا گیا۔ ایک عمارت لڑکوں کے لئے بنی اور ایک لڑکیوں کے لئے۔ یتیم لڑکوں کو مختلف زبانیں سکھا کر اور علومِ مروّجہ پڑھا کر دیگر ممالک میں اسلامی مشنری کے طور پر بھیجنے کا ارادہ تھا۔ لیکن اتفاقاتِ زمانہ سے وہ ارادہ پُورا نہ ہوا۔ وہ مدبّر بدل گئے۔ مدرسے کے بانی جہان سے اُٹھ گئے۔ اب یہ اُن کے جوشیلے ارادے کی یادگار باقی ہے اور اپنی جگہ پر مفید کام ہے۔ لڑکیوں کے لئے آخر مکان علیحدہ تجویز ہوا اور اس مکان کے دونوں حصّے لڑکوں کے لئے استعمال ہونے لگے۔ کچھ عرصہ تک مدرسے کا انتظام بگڑا رہا۔ طلبہ کی بغاوتیں ہوئیں۔ اُستاد بدلے گئے۔ اب چند سال سے عمدگی کے ساتھ چل رہا ہے۔ موجودہ مدیرِ مکتب علی رضا بک ہیں۔ جو بہت قابل اور منتظم آدمی ہیں۔ ہم ایک دن وہاں گئے تو بسببِ تعطیل وہاں کوئی نہ تھا۔ اتفاق سے ڈاکٹر عبد الاحد داؤد جو پہلے کیتھولک مذہب کے پادری تھے اور اب مشرف بہ اسلام ہو کر اس مکتب میں معلّم ہیں۔ آ نکلے۔ وہ انگریزی جانتے ہیں۔ اُن سے بات چیت ہوئی۔ اُنہوں نے کہا کہ کمرے تو میں بھی آپ کو دکھا سکتا ہوں۔ لیکن اگر آپ پھر کسی دن آسکیں تو میں پرنسپل صاحب (مدیر) کو اطلاع کر دوں اور وہ تشریف لے آئیں تو آپ اُن سے مل کر بہت خوش ہونگے۔ ہم نے کہا بہت اچھا۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے انتظام کر کے ہمیں اطلاع دی۔ جب ہم گئے تو پرنسپل صاحب معہ اپنے نائب اور چند معلّمین کے ہمارے منتظر تھے۔ اُنہوں نے مکتب کے نصاب کے متعلق کچھ چھپے ہوئے کاغذات ہمیں دیئے۔ ہمارے مکاتب اور یتیم خانوں کا حال بہت تجسّس سے پُوچھا۔

اور یہ کہا کہ اگر ہندوستان کے کوئی عربی فارسی پڑھے ہوئے طالب علم یورپی زبانیں سیکھنے یا ترکی کے ذریعے علوم جدیدہ پڑھنے کے لئے اِستانبول آئیں تو ہم بہت خوش ہونگے اور اُن کے لئے ترکی جلد سیکھنے کا ہم عمدہ اِنتظام کر دینگے۔ اوسط درجے کا خرچ اُنہوں نے پانچ پونڈ یعنی پچھتر روپیہ ماہوار بتایا اور کہا کہ ایسے طلبہ کو وظیفہ دیکر بھیجنا چاہیئے۔ تعلیمی معاملات پر اس قسم کی اور گفتگو کے بعد اُنہوں نے ہمیں سارے مکتب کی سیر کرائی۔ بعض طلبہ چھوٹی جماعتوں کے موجود تھے۔ اُن کا سبق سُنوایا۔ اس مکتب میں سبق الاشیاء کے لئے ایک معقول "میوزیم" نظر آیا۔ یورپ کے ہر مدرسے کے ساتھ ایسے میوزیم کا ہونا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ مَیں نے اُن سے کہا کہ ہندوستان کے اکثر مدارس سے آپ اس بارے میں اچھے ہیں۔ کیونکہ وہاں یہ رسم ابھی عام نہیں ہوئی۔ گو ہوتی جاتی ہے۔ ایک کمرہ علم طبعیات اور کیمیا کے تجربوں کے لئے تھا۔ ایک نقّاشی کے لئے جس میں نقّاشی کے کام کے اچھے اچھے نمونے طلبہ کے ہاتھ کے بنائے ہوئے رکھے تھے۔ علم نباتات اور علم معدنیات کی بھی ابتدائی تعلیم کا سامان اِس مکتب میں ہے اور اس حصّے کے بڑھانے کی تدبیر ہو رہی ہے۔ اوپر کی منزل میں لڑکوں کے رہنے کے کمرے ہیں اور تین کمرے شفاخانہ کے ہیں۔ جن میں ایک میں دوائیاں رکھی ہیں۔ اور دُوسرے میں ڈاکٹر صاحب بیٹھتے اور مریضوں کو دیکھتے ہیں تیسرے کمرہ میں مریضوں کے پلنگ تھے۔ یہاں یہ دستور عام ہے کہ ہر مدرسے کے بورڈنگ کے ساتھ ایک مکمّل شفاخانہ موجود ہے اور ایک قابل ڈاکٹر کے سپرد ہے۔

دار الخیر ایک بات میں دار الشفقہ سے ملتا ہے اور وہ یہ کہ یہ بھی یتامیٰ کے لئے

کھولا گیا ہے۔ سُلطان المعظم کو جو توجہ اپنی رعایا کے غریب حصے پر ہے اور جو کوشش اُن کے وقت میں یتیم اور لاوارث بچوں کو قابل اور ہوشیار بنانے کے لیئے کی گئی ہے۔ یہ مکتب اس کی بہترین نظیر ہے۔ جس مکان میں یہ مکتب واقع ہے۔ وُہ پہلے ایوانِ شاہی تھا۔ لیکن سُلطان المعظم نے نہایت فیاضی سے اسے یتامیٰ کو دیدیا۔ اب یہ اُنکا مکتب صنایع ہے۔ یہاں وُہ پڑھتے بھی ہیں اور صنعت بھی سیکھتے ہیں۔ اور اسی ایوانِ شاہی میں اُن کے رہنے کے کمرے بھی ہیں۔ اُن کی خوش قسمتی دیکھئے۔ جھونپڑوں سے نکل کر محلوں میں جگہ پائی۔ ماباپ چھین گئے تھے۔ تو شفقتِ شاہانہ اُن کے سر پر سایہ فگن ہوئی۔ اُستادوں کو خاص ہدایت ہے کہ وُہ اِن بچوں کو کسی طرح یہ محسوس نہ ہونے دیں۔ کہ وُہ یتیم ہیں۔ جب وُہ کسی نہ کسی ہنر میں مشّاق ہو جائیں تو بعض کو سرکاری کارخانوں میں جگہ مل جاتی ہے اور بعض اپنے طور پر علیحدہ دوکانیں کھولتے ہیں۔ اُس وقت اُنہیں اُن کی مزدوری کا اندوختہ آغازِ کار کے لیئے مِل جاتا ہے۔ ساڑھے تین سال ہُوئے ہزہائی نس فرید پاشا موجودہ صدرِ اعظم نے اپنے آقائے نامدار کے حکم سے اس مکتب کی رسمِ افتتاح ادا کی۔ اس وقت اس میں تین سو طلبہ تعلیم پاتے ہیں۔ جو صنایع یہاں سکھائی جاتی ہیں۔ اُن میں موسیقی بھی شامل ہے۔ اور موسیقی سیکھنے والے فوجی باجے کے لیئے تیّار کیئے جاتے ہیں۔

اور بہت سے مکاتب ہیں جن کے دیکھنے سے تعطیل نے ہمیں محروم رکھا۔ وُہ سب نہایت مفید کام کر رہے ہیں۔ مکتب صنایع۔ مکتبِ ہندسہ (انجنیرنگ کالج) مکتب اللسان۔ اور مکتبِ فنونِ لطیفہ۔ یہ آخری مکتب ہز اکسلنسی حمدی بے جہتم

موزۂ الطبق کی سعی سے جاری ہوا ہے اور عثمانیوں کے لئے بالکل نئی چیز ہے۔ لیکن طلبہ کے کام سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ عثمانی فنونِ لطیفہ سے بھی بآسانی مناسبت پیدا کر سکتے ہیں۔ اور اہلِ یورپ کا یہ خیال کہ وُہ فقط جنگجو قوم ہیں اور سوائے فنونِ حرب کے اَور کسی کام کے لئے موزوں نہیں غلط ثابت ہوتا جاتا ہے۔

یہ سب مکاتب فنونِ صلح سے متعلق ہیں۔ مگر فنونِ صلح کے لئے کسی مُلک اور قوم کو فرصت میسّر نہیں ہو سکتی تا وقتیکہ وُہ فنونِ جنگ سے ماہر نہ ہو اور جنگ کے لئے پُوری طرح تیار نہ رہے۔ لڑائی زمانہ حال میں دو قسم کی ہے۔ بحری اور بّری جیسا کہ عام طَور پر معلوم ہے اسوقت عثمانی صیغہ بحریہ میں نہایت کمزور ہیں۔ مگر خیر بحریہ تعلیم ان کے ہاں مروّج ہے اور صرف یہی ایک جگہ دُنیا بھر میں ہے جہاں مسلمان بحری تعلیم مکمّل یا نامکمل جو کچھ بھی ہے۔ پا رہے ہیں۔ یہاں کی بّری فوج کسی دوسری دولت سے پیچھے نہیں اور اس کی وجہ کچھ تو تُرکوں کی سپاہگری اور فداکاری ہے اور کچھ مکاتبِ حربیہ کی برکت۔ سلطنت عثمانیہ ولایتوں پر منقسم ہے۔ اور ہر ولایت کے صدر مقام میں ایک مکتبِ حربیہ موجُود ہے۔ اِن مکاتب سے تعلیم پا کر اعلیٰ حربی تعلیم کے لئے لڑکے استانبول آتے ہیں اور مکتبِ حربیہ شاہانہ میں داخل ہوتے ہیں۔ خود استانبول میں بھی کئی ابتدائی مکاتبِ حربیہ ہیں۔ جو بڑے مکتب کی شاخیں ہیں۔ مکتب کی عمارت شاندار ہے اور اس کے قریب ایک وسیع میدان قواعد اور چاندماری وغیرہ کے لئے ہے۔ اِس میں جنگی تعلیم کے ساتھ ساتھ السنہ کی تعلیم ہوتی ہے اور طب اور طب حیوانات کی جماعتیں بھی ہیں۔ چُونکہ مَیں نے اس مشہور مکتب کی جماعتوں کو تعلیم پاتے نہیں دیکھا۔ اِس لئے اُن کی تعلیم کی تفصیل لکھنے سے

قاصر ہوں۔ ہاں اس کالج کے پڑھے ہوئے کئی اصحاب سے ملا ہوں۔ اُن کی تعلیم و تربیت ہر اعتبار سے معقول نظر آئی۔ ہمارے قومی خطیب مولانا نذیر احمد نے ایک جگہ لکھا ہے کہ مسلمان طلبہ کے لئے مناسب ہے کہ مدارس سے تیغ دو دم یعنی "سپاہی اور اہل قلم بن کے نکلیں"۔ مَیں نے مکاتبِ حربیہ کے پڑھے ہوئے بزرگوں کو عین اس قول کے مصداق پایا اور وُہ اپنے عہدوں کے کام بخوبی سرانجام دے رہے ہیں۔ علومِ جدیدہ میں طبیعیات اور کیمیا کی تعلیم اس مکتب میں جاری ہے اور ان کے پڑھانے کے لئے بڑے بڑے ذی رُتبہ فوجی ڈاکٹر متعیّن ہیں۔ دیگر مکاتب کی طرح یہاں کے طلبہ بھی بورڈنگ میں رہتے ہیں پنجشنبہ کے دن انہیں گھر جانے اور عزیزوں سے ملنے کی اجازت ہوتی ہے اور اُس دن وردی پوشش سجیلے نوجوان جوق جوق نکلتے ہیں۔ بعض دفعہ یورپ کے طلبہ کے گروہوں میں جو شور و غل ہوتا ہے۔ اس سے یہ قطعی پرہیز کرتے ہیں۔ نہایت سلیقے اور متانت سے چلتے پھرتے ہیں اور اُن کے وقار سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں آگہی ہے کہ مُلک اور قوم کے ناموس کی حفاظت کا بوجھ اُن کے ذمّے ہے ✣

حمیدیہ خستہ خانہ اطفال

طبِ جدید میں عثمانیوں کی جس ترقّی کا ذکر مکاتب کے ضمن میں کیا گیا ہے
اُس کا نمونہ قسطنطنیہ کے ہسپتال ہیں۔ انہیں یہاں خستہ خانہ کہتے ہیں۔ ہم نے
متعدد عثمانی ہسپتال دیکھے۔ ہر ایک کو مصفا آرام دہ اور تازہ ترین سامان سے
آراستہ پایا۔ اُن کا اہتمام بالکل عثمانیوں کے ہاتھ میں ہے۔ مکتبِ طبیہ کے فارغ التحصیل
ڈاکٹر ان میں کام کرتے ہیں۔ سلطان المعظم کے عہد میں سب صُوبوں میں حمیدیہ خستہ
قائم ہوئے ہیں لیکن جس خستہ خانہ پر توجہ شاہی سب سے زیادہ ہے وُہ اطفال
خستہ خانہ حمیدیہ ہے۔ جو قسطنطنیہ کی قابلِ دید چیزوں میں ہے۔ پیرا سے مکتب ح
کی طرف جو سڑک جاتی ہے۔ اُس پر چلیں تو مکتب حربیہ سے تھوڑے فاصلے پر اس خستہ
کا عالیشان دروازہ آتا ہے۔ یہ عمارت بُلندی پہ واقع ہے۔ اور اس کے عقب
میں ایک خوشنما وادی ہے۔ اور کوئی اَور عمارات اس کی طرف ہوا کی آمد و رفت ر
کے لئے موجُود نہیں۔ اِس کا موقعہ بہ لحاظ صحت کے بہت عمدہ چُنا گیا ہے۔
اور اس کے وسیع احاطے میں کئی عمارتیں ہیں جو مختلف مطالب کے لئے مخصُو
ہیں۔ ایک عمارت جراثیم امراض کی تحقیقات کے آلات سے پُر ہے۔ اور وہاں
ایک لائق ماہرِ فن اس کے متعلق تجربات کرتا رہتا ہے۔ رانجن کی شعاع سے بھی
امراضِ اندرونی کی تحقیقات کا کام یہاں لیا جاتا ہے۔ ایک عمارت حال میں مکمل
ہوئی ہے۔ جو دِق اور سل کے مریضوں کے لئے مخصوص ہے۔ اور اس میں نہایت
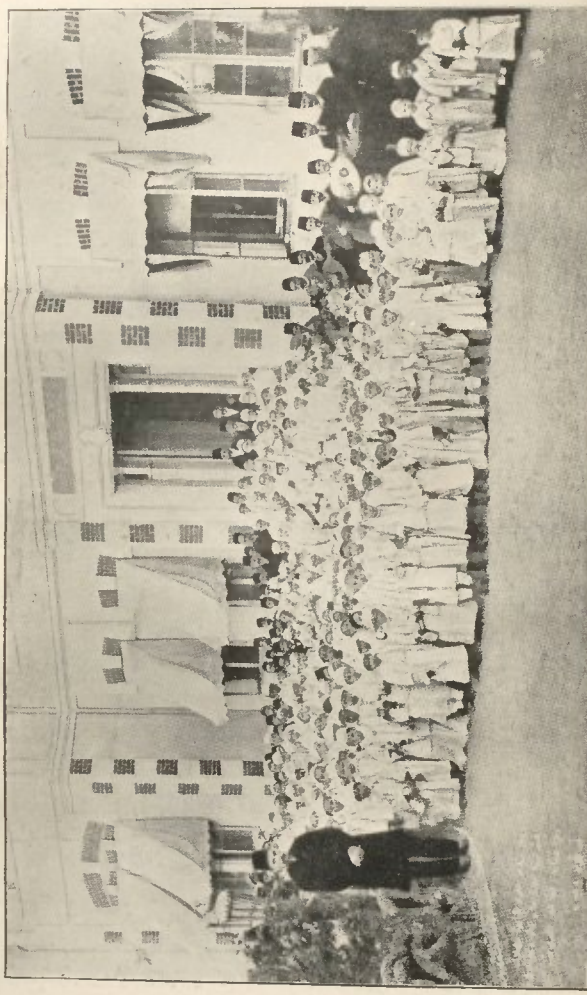
جلوس همایون میمنت مقرون حضرت خلافتپناهیلرینك اوتوزنجی سنهٔ دوریه‌سنه مصادف یوم مسعوده « حمیدیه » اطفال خسته‌خانهٔ عالیسنده ختانلری اجرا قلنان اطفالك ولیلری ایله برلکده خسته‌خانهٔ عالی باغچه‌سنده آلنان فطوغرافلری

کی تحقیق کے مطابق علاج کا پورا تہیہ کیا گیا ہے۔ کئی وارڈ معمولی امراض کے لئے
ہیں۔ اور اُن میں ننّھے ننّھے مریضوں کی آسائش کے لئے ہر طرح کا اہتمام ہے۔
اُن کی خبرگیری کے لئے عورتیں مقرر ہیں۔ یہ گو یورپ کے ہسپتال کی طرح نرسنگ
(یعنی بیمارداری) کا امتحان پاس کئے ہُوئے تو نہیں ہیں۔ لیکن امتحان پاس
کی ہُوئی عورتوں سے اُنھوں نے کام سیکھا ہے۔ چُونکہ یہاں مریض اکثر مُسلمان
ہیں۔ اس لئے یہ عورتیں بھی مسلمان ہیں۔ اور ہمارے ہاں کے غریب مسلمانوں کی
طرح پردہ سے بالکل بری ہیں۔ یہ چہرہ پر کچھ نقاب وغیرہ نہیں رکھتیں۔ سفید دوپٹے
اوڑھے رہتی ہیں اور جب ڈاکٹر صاحب یا کوئی اور مرد اُن کے وارڈ میں معاینہ
کو آتے ہیں تو دوپٹے سے اپنی پیشانی کسی قدر ڈھانپ لیتی ہیں اور ادب سے
ایک طرف کھڑی ہو جاتی ہیں۔ بچّوں کی نگہداشت بڑی محنت سے کرتی ہیں اور
اپنے فرائض کے ادا کرنے میں کامیاب ثابت ہُوئی ہیں۔ بچّوں کے وارڈ
کے سامنے ایک باغیچہ اُن کی ہَواخوری اور تفریح کے لئے ہے۔ مریض بچّے
کُرسیوں پر بیٹھے وہاں کی تازہ ہَوا لیتے ہیں اور جو قریب بہ صحت ہوں وُہ
اس میں ہنستے کھیلتے پھرتے ہیں۔ وسط صحن میں ایک خوبصُورت عمارت
ڈاکٹروں کے بیٹھنے اور عملیات جرّاحی وغیرہ کرنے کے لئے ہے۔ اسی عمارت
میں سرطبیب ہزاکسلنسی ابراہیم پاشا کا دفتر ہے اور ایک چھوٹا سا مگر نہایت آراستہ
کمرہ بادشاہ کی تشریف آوری کے لئے مخصوص ہے۔ کہ اگر وُہ آئیں تو اس میں
بیٹھیں۔ یہ خستہ خانہ چند سال ہُوئے سلطان المعظّم نے ایک شاہزادی کی یادگار
میں جو اُنہیں ہمیشہ کے لئے داغ مفارقت دے گئی۔ قائم کیا ہے اور اسی لحاظ

یہ بچوں کے علاج کے لئے مخصوص ہے۔ اب ایک عمارت اس میں اَور بن رہی ہے
یہ ولادت خانہ ہے۔ جس کا مقصد یہ ہے کہ غریب عورتیں جنکو گھر میں زچگی کے
اخراجات میسّر نہ ہوں۔ وُہ جننے سے پہلے یہاں آجائیں۔ اور بہترین ڈاکٹری
علاج اور ہوشیار قابلہ اُن کے لئے یہاں مہیّا ہوں۔

ہم نے دو مرتبہ اِس خستہ خانہ کو دیکھا۔ پہلی مرتبہ ڈاکٹر سلیمان نوری نے جو
بافتر یو لوغ یعنی ماہر جراثیم ہیں۔ اور خستہ خانہ کے طبیبِ دوم ہیں ہمیں سب چیزیں
نہائیت توجّہ سے دکھاتے رہے۔ وُہ انگریزی بولتے ہیں۔ اِس لئے ہم اُن سے
بآسانی سب باتیں ترجمان کی مدد کے بغیر پوچھ سکتے تھے۔ ہم نے خستہ خانہ کے
متعلّق چند بڑے بڑے آدمیوں کی رائیں بھی پڑھیں۔ جو ایک کتاب میں درج
تھیں۔ یہ دیکھ کر مسرت ہوئی کہ سر نکلولس او کانر سفیر انگلستان اور بعض دیگر سفرائے یورپ
کی رائیں بھی درج تھیں۔ جنہوں نے بعد معائنہ اس ہسپتال کو یورپ کے عمدہ ہسپتالوں
کا ہم پلّہ قرار دیا ہے اور اُسے اس کے بانی کے رحمدل ہونے کا نمایاں ثبوت سمجھا ہے۔

جب ہم فارغ ہو کر ڈاکٹر صاحب سے رخصت ہونے کو تھے تو معلوم ہُوا کہ ابراہیم
پاشا طبیبِ اوّل جو خاص معالجِ شاہی بھی ہیں۔ دفتر میں تشریف لے آئے ہیں۔
اُن سے مُلاقات ہُوئی۔ پچاس سے اوپر سِن ہوگا۔ مگر طبیعت جوانوں کی طرح بیتاب
پائی ہے۔ ہر بات سے چُستی اور چالاکی ٹپکتی تھی۔ اُنہوں نے ہمیں سال گذشتہ کی
رپورٹ دی۔ جو مفصّل اور باتصویر ہے اور نہایت خوُبی سے چھپی ہُوئی ہے۔ اور
یہ بھی کہا کہ سال حال کی رپورٹ بھی ہمیں بھیجی جائیگی۔ اُس رپورٹ کی ورق گردانی کرتے
ہُوئے مجھے ایک عجیب تصویر نظر آئی۔ صحن خستہ خانہ میں ایک فوّارہ ہے۔ اس کے

گرد ایک گروہ چھوٹے چھوٹے لڑکوں کا ایک ہی قسم کا لباس پہنے کھڑا تھا۔ سب کے لمبے لمبے کُرتے اور سر پر اُلٹی پھندنے والی ٹوپیاں۔ مَیں نے پُوچھا یہ کس موقعہ کی تصویر ہے تو اُنہوں نے کہا کہ یہ رسمِ ختنہ ہے۔ جو ہر سال جلوسِ ہمایوں کے دن یہاں اور بعض دیگر ہسپتالوں میں ادا ہوتی ہے۔ لیکن سب سے زیادہ تعداد لڑکوں کی یہیں ہوتی ہے جب وُہ ختنہ کے بعد گھر جانے لگتے ہیں تو سب کی مجموعی تصویر بطور یادگار کے لے لی جاتی ہے اور اس رپورٹ میں شامل کی جاتی ہے۔ مَیں نے کہا یہ نظارہ بھی عجیب ہوتا ہوگا۔ اُنہوں نے کہا۔ ہاں بہت دلچسپ ہوتا ہے۔ اگر آپ جلوس کے دن تک قسطنطنیہ میں رہے تو ہم آپ کو دعوت دیتے ہیں کہ آپ ضرور آئیں اور اس مبارک جشن میں شریک ہوں۔

روزِ جلوس آیا تو ہم یہ رونق دیکھنے گئے۔ جو دنیا بھر میں نرالی ہے۔ کیونکہ اور کہیں سرکاری طور پر اس مذہبی رسم کے لئے اہتمام نہیں ہوتا۔ استانبول میں سب ختنے روزِ جلوس کے منتظر رہتے ہیں اور اس دن کے عام جشن کی شادی میں یہ گھر گھر کی شادی ایک اضافہ ہوتی ہے۔ اور لُطف یہ کہ لڑکوں کے والدین اس تقریب کے خرچ سے بچ جاتے ہیں۔ اور سب خرچ بادشاہ کی طرف سے ہوتا ہے۔ ہسپتالوں میں اس دن کی آمد آمد کے لئے کئی دن سے تیاریاں ہوتی ہیں۔ چند بڑے بڑے کمرے اس تقریب کے لئے خالی کئے جاتے ہیں اِن میں پلنگ قطار در قطار بچھ جاتے ہیں۔ ہر پلنگ پر صاف سُتھرا بستر اور ایک نئی رضائی اور تکئے ہوتے ہیں۔ ہر لڑکے کے لئے لباسِ ختنہ ہسپتال کی طرف سے تیار ہوتا ہے یعنی کھُلا اور لمبا چھینٹ کا کرتا اور پھُندنے دار ٹوپی۔ لڑکوں

کے والدین اور رشتہ دار اُنہیں ساتھ لیکر آتے ہیں۔ دروازہ کے قریب ایک کھڑکی سے ہر بچے کو ٹکٹ ملتا ہے۔ ٹکٹ لیکر اندر آتے ہیں تو پہلے وُہ ختنے کا لباس دیا جاتا ہے۔ وُہ اپنے کپڑے اُتار کر یہ لباس پہن لیتے ہیں۔ پھر ختنے کے کمروں میں جاتے ہیں وہاں بڑے بڑے نامور ڈاکٹر جو جرّاحی میں خاص مشق رکھتے ہیں اپنے ہاتھ سے ختنہ کرتے ہیں اور ختنے کے بعد زخم پر فوراً ایک مرہم لگا دیتے ہیں۔ اگر کوئی لڑکا ختنے کے وقت یا بعد رو پڑتا ہے تو دروازہ سے نکلتے ہی ہنسنے لگتا ہے۔ کیونکہ باہر نقّال ہنسانے والے لباس پہنے کھڑے رہتے ہیں اور دف وغیرہ بجا کر بچوں کا دِل بہلاتے اور انہیں ہنساتے ہیں۔ ہر بچّے کو جو فارغ ہوتا جاتا ہے لا کر پلنگ پر لٹا دیتے ہیں۔ اُس وقت بعض عزیز اُن کے پلنگ کے قریب آ بیٹھتے ہیں۔ اُن کے پلنگ پر لیٹتے ہی پہلے ایک شربت آتا ہے۔ اس کے بعد نہایت مکلّف کھانا اُن کے لئے تیار رہتا ہے۔ چند کھلونے ہر ایک کو کھیلنے کے لئے ملتے ہیں اور ختنے کے ایک گھنٹے بعد ان بچّوں کو قطار در قطار چپ چاپ بیٹھے یا ہنستے بولتے اور کھلونوں سے دِل بہلاتے دیکھ کر عجب مسرت ہوتی ہے۔ کچھ عمل جرّاحی کی خوبی اور کچھ عمدہ علاج اور مرہم کی بدولت یہ حیرت خیز ہے۔ کہ ختنے کے دُوسرے روز یہ لڑکے اُٹھ کر بآسانی چلنے پھرنے لگتے ہیں اور ہمارے مُلک والوں کی طرح دنوں لیٹے نہیں رہتے۔ چلتے وقت اُنکی تصویر لی جاتی ہے۔ اور ہر ایک کو چند روز کے لئے پینے کو دوا اور لگانے کو مرہم اور کچھ دیکر رخصت کیا جاتا ہے۔ ایک دن اور ایک رات وُہ ختنہ خانہ میں مہمان رہتے ہیں اور اُس ایک دن رات میں اُنکی خاطر تواضع میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا جاتا

روزِ جلوس کو جب ہم وہاں پہنچے تو باہر دُور تک ہجومِ خلائق تھا۔ لوگوں کو باترتیب اندر لیجانے اور ٹکٹ دلانے کے لئے پولیس بھی حاضر تھی۔ صحن خانہ میں ترکی باجا بج رہا تھا مگر باجے کے سب ساز یورپی تھے۔ بجانے والے وردی پوش طالب علم تھے۔ اور اُن کے سامنے موسیقی کی کتابیں اسی طرح کھُلی ہوئی تھیں جیسے انگریزی باجے والوں کے آگے ہوتی ہیں۔ استانبول کے بڑے بڑے اخبارات کے نامہ نگار بھی اِس جشن کی کیفیت دیکھنے آئے تھے۔ ڈاکٹر سلیمان نوری بے اُس روز بہت مصروف تھے۔ مگر اُنہوں نے اپنے اجزاجی باشی (ہیڈ کیمسٹ) کو کہا کہ ہمیں سب کمروں کا انتظام دکھاوے اور پھر کھانے پر لیجائے۔ تاکہ ہم دیکھ لیں کہ بچوں کے لئے کیسا کھانا پکایا گیا ہے۔ جب ہم کھانے کے کمرے میں گئے تو وہاں اخبارات کے نامہ نگار بھی مدعو تھے اور ہم سب نے ایک میز پر بیٹھ کر کھانا کھایا۔ اور ہم سب اس دن کے انتظام کے عمدہ اور مکمل ہونے پر متفق الرائے تھے۔

ہمیں کوئی دو گھنٹے ختنہ خانہ میں لگے۔ پھر ہم تو چلے آئے۔ لیکن وہاں لوگوں کی آمدورفت۔ ساز و سرود۔ خورد و نوش کا سلسلہ شام تک جاری رہا اور دُوسرے روز اخبارات سے معلوم ہؤا کہ تین سو کے قریب بچوں کا ختنہ ختنہ خانۂ اطفال میں ہؤا۔ اسی طرح اور ختنہ خانوں میں کہیں سو کہیں ڈیڑھ سو۔ کچھ نہیں تو ہزار ڈیڑھ ہزار بچوں کا ختنہ جلوس کے دن استانبول میں ہؤا ہوگا۔ ایک ضروری اسلامی رسم کو رعایا کے لئے اِس قدر آسان کر دینے میں سُلطان المعظم کی فیاضی کی جس قدر داد دیں بجا ہے۔ ہمارے ہاں کئی لوگ بچوں کے ختنے کی تقریب پر بیحد خرچ کر دیتے ہیں اور کبھی کبھی روپیہ پاس نہ ہو تو قرض کی زیر باری اُٹھا کر گھر پھونک تماشا دیکھتے ہیں۔ اُن کے مقابل میں ہمارے عثمانی بھائیوں

کی حالت قابلِ رشک نظر آتی ہے۔ کہ اُن کی گرہ سے کچھ نہیں کُھلتا اور یہ بوجھ اُن کے سر سے اُتر جاتا ہے۔ لیکن ایک بات میں وُہ ہم پر رشک کر سکتے ہیں۔ ہمیں یہ آزادانہ حق حاصل ہے کہ جب چاہیں کسی بچّے کے ختنے کرا لیں۔ استانبول میں یہ ممکن نہیں۔ کسی اَور موقعہ پر اپنے گھر ڈاکٹر بُلانے کے لئے خاص اجازتِ شاہی حاصل کرنی پڑتی ہے جو سوائے بڑے آدمیوں کے ہر ایک کو نہیں مل سکتی اور متوسط طبقے کے بعض لوگ اس قید سے سخت گھبرا رہے ہیں۔ لیکن غُربا کے لئے اس سے بڑھ کر سہولت خیال میں نہیں آ سکتی۔ جو اس شفقتِ شاہانہ کی بدولت اُنہیں میسّر ہے +

دار العجزہ

عہدِ حمیدی کے احداثات میں دار العجزہ نہایت قابلِ تحسین بُنیاد ہے۔ کوئی دس گیارہ سال ہُوئے اس کی بُنیاد رکھی گئی اور روز بروز اس کے اندر پناہ لینے والوں کی تعداد میں ترقّی ہے تھکے ماندے ضعیف اپنی زندگی کے آخری دن طوفانِ حوادث کی زد سے بچکر اس مقامِ امن و عافیت میں گذارتے اور سلطان المعظّم کی جان و مال کو دعا دیتے ہیں۔ خستہ خانۂ اطفال اگر بچّوں کے لئے خزینۂ صحت تھا تو دار العجزہ بوڑھوں کے لئے سرمایۂ راحت ہے۔ گو یہ گھر بھی بچّوں سے خالی نہیں۔ بہت سے ننھے ننھے یتیم اور لاوارث بچّے یہاں پرورش پاتے ہیں اور یہاں کے پژمُردہ باشندوں کی مُندی ہُوئی آنکھوں کا نُور اور اُن کے مایوس دلوں کا سرور ہیں۔ شہر سے دُور ایک نہایت وسیع احاطے میں دار العجزہ کے مکانات ہیں۔ چاروں طرف کھُلا میدان ہے۔ ہَوا تازہ اور صحت بخش ہے اور مکان سُتھرے اور پُر آسائش ہیں۔ یہاں ایک ہزار کے قریب بیکس غریبوں کو کھانا اور کپڑا دیا جاتا ہے۔ اور اُن میں جو بیمار ہوں اُن کا علاج کیا جاتا ہے۔ جو اپاہج ہیں اُن کو سوائے آرام کے کچھ کام نہیں۔ لیکن جن کے ہاتھ پاؤں چلتے ہیں وُہ کسی نہ کسی کام میں لگے رہتے ہیں۔ اُن کا دل بھی بہلا رہتا ہے۔ اور دار العجزہ کے کارخانے بھی چلتے رہتے ہیں۔

دار العجزہ کے مُدیر اور اُن کے معاون اور ڈاکٹر صاحب جن کے سپُرد وہاں کا

شفاخانہ ہے ۔ سب حاضر رہتے ہیں اور اُن کی نشست کے لئے کمرے بڑے
دروازہ کے پاس ہی بنے ہُوئے ہیں ۔ ہم گئے تو محمد فخر الدین بے مدیر اور وقتو
زُہدی بے طبیبِ اوّل نہایت اخلاق سے پیش آئے ۔ اور اُنہوں نے دار العجزہ
کا ہر حصّہ ہمیں بہ تفصیل دکھایا ۔ سب سے پہلے ڈاکٹر صاحب نے شفاخانہ دکھایا ۔ جو
اپنی ضروریات کے مُطابق اُن سب اوصاف سے متّصف تھا جو خستہ خانہ کے متعلق
بیان ہو چکے ہیں ۔ علاوہ اس کے ڈاکٹر صاحب کے مریضوں کو اُن سے ایک
خاص اُنس یہاں نظر آیا ۔ جو اُن کی مروّت اور خلق کا نتیجہ تھا ۔ ان کے کمرہ میں داخل
ہوتے ہی بیماروں کے مُنہہ پر ایک رونق آجاتی تھی اور بعض بوڑھی بوڑھی عورتیں
اُنکو بیحد دُعائیں دیتی تھیں ۔ وُہ معائنہ کرتے ہُوئے ہر ایک سے حال پُوچھتے
اور انہیں تسلّی دیتے جاتے تھے ۔ اس شفاخانے میں بھی چند کمرے ولادت
کا کام دیتے ہیں اور غریب عورتیں جننے کیوقت یہاں آتی ہیں ۔ ایک کمرہ ہم نے دیکھا
اُسوقت خالی تھا ۔ اس میں ایک کونے میں ایک بڑا سا شیشہ رنگین شربت کا د
تھا ۔ ہم نے پُوچھا یہ کس کام آتا ہے ۔ ڈاکٹر صاحب نے ہمیں بتایا ۔ کہ عثمانیوں میں
دستور ہے کہ زچہ کے کمرے میں یہ شربت رکھتے ہیں اور جب بچّہ پیدا ہوتا ہے تو
رشتہ دار موجود ہوتے ہیں اُن میں شربت تقسیم کیا جاتا ہے ۔ پس شفاخانہ میں بھی
شاہی یہی ہے کہ غریبوں کو ایسا معلوم ہو کہ وُہ اپنے گھر میں ہیں ۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی غ
عورت یہ محسوس کرے ۔ کہ اگر اُسے اپنے گھر جننے کی توفیق ہوتی تو اُس کے عزیز
میں شربت بٹتا ۔ یہاں یہ شربت مہیّا رہتا ہے اور وقت پر ہر عورت اپنے ہاتھ سے
تقسیم کرتی ہے ۔ خیرات کے کام میں غریبوں کے احساسات کا اس نزاکت سے پاس کر

ہر ایک کا کام نہیں ہے اور اس پاسداری کے لئے اس شفاخانہ کے بانی اور کارکن
دونو کے دل و دماغ قابلِ آفرین ہیں۔ یہ پاسداری دار العجزہ میں انتہا درجے کی ہے
اس میں داخل ہونے کے لئے مذہب کی قید نہیں ضعیف ہو نادار یا بیمار ہو۔
خواہ کسی ملّت کا ہو۔ یہاں قبول کیا جاتا ہے۔ اور سب کے ساتھ یہاں کے مامورین
یکساں سلوک کرتے ہیں۔ "مومن و ارمنی و گبر و نصاریٰ و یہود" سب موجود ہیں۔ لیکن اُن
کی جسمانی آسائش کے انتظام پر یہاں اکتفا نہیں کیا گیا۔ بلکہ اُن کی راحتِ روحانی
کی بھی فکر کی گئی ہے۔ مسلمانوں کے لئے مسجد ہے۔ تو نصاریٰ کے لئے گرجا۔ نصاریٰ
کے دو بڑے فریق روم میں ہیں ایک ارمنی۔ دُوسرے یُونانی۔ دونو ایک دُوسرے
کے گرجے میں عبادت نہیں کرتے۔ اِس لئے ارمنی گرجا جُدا ہے اور یُونانی گرجا جُدا
ہم نے دونوں گرجے کھُلوا کے دیکھے۔ جو کچھ سامان گرجوں کے لئے ضروری ہے
وہاں موجود تھا۔ اور ہر ایک کے لئے علیحدہ پادری مقرر ہے۔ جسے سرکار سے
تنخواہ ملتی ہے۔ گرجے کی عبادت کے وقت مُسلمان اہلکار ضعیف عیسائیوں کو
جو آسانی سے چل پھر نہیں سکتے۔ اپنے ہاتھوں کا سہارا دیکر گرجے میں پہنچا آتے
ہیں۔ بے تعصبی اور دلداری اس سے بڑھ کر کیا ہوسکتی ہے۔ جو عیسائی پرانے
مذہبی عناد اور اغیار کے بہکانے سے آئے دِن حکومت کے برخلاف سازشیں
کیا کرتے ہیں اور یورپ میں اُن کے مددگار جو کتب و اخبارات کے ذریعہ سے
عثمانیوں کو گالیاں دیا کرتے ہیں۔ انہیں چاہیئے کہ اس دار العجزہ کی زندگی
کو دیکھیں اور اِن ضعیف عیسائیوں سے پُوچھیں کہ اِن کے ساتھ کیسا سلوک ہوتا ہے
وسطِ صحن میں ایک عمارت ہے۔ جس کے گرد پردے کے لئے ترکی رواج کے

مطابق لکڑی کے پنجرے لگے ہوئے ہیں - یہ بیوہ عورتوں کے رہنے کی جگہ ہے
اس کے اندر مرد نہیں جاتے - اِس کے پیچھے دو عمارتیں بچّوں کے لئے ہیں
بچّے ہر عمر کے ہیں - دو چار دن کی ننھّی سی جان سے لیکر دس بارہ برس کے بچّوں
تک - جو لاوارث بچہ ہے - وُہ یہاں بھیجا جاتا ہے - چھوٹے بچّوں کی پرورش
بڑا نازک کام ہے - لیکن جدید طب کی ساری کوشش اس مشکل کے حل کرنے پر
صرف کی جاتی ہے - بچّے نہایت ستھرے کپڑوں میں لپٹے ہُوئے ہلکے ہلکے
گہواروں میں لیٹے ہیں - جالی کے دوپٹّے اُن کے مُنہہ پر پڑے ہیں - خالص
دُودھ کی بوتل اُن کے لئے تیار رہتی ہے - جُوں جُوں اُور غذا ہضم کرنے کے
لائق ہوتے جاتے ہیں - دایہ ڈاکٹر کے مشورہ اور تجویز کے مطابق اوقاتِ معیّنہ
پر مناسب مقدار میں غذا اُنہیں دیتی ہے - چار چار پانچ سال کے کئی لڑکے اپنے
مکان کے دروازے کے باہر ایک سایہ دار درخت کے نیچے کھیل رہے تھے -
ہم وہاں پہنچے تو وُہ سب ڈاکٹر صاحب کی طرف بابا بابا کہتے ہُوئے دَوڑے
آئے - جس سے معلوم ہُوا کہ اُن کے سلوک نے بچّے سے لیکر بوڑھے تک کو
گرویدہ کر رکھا ہے -

چھوٹے بچّوں کے کمروں سے ملا ہُوا ایک مدرسہ ہے - جہاں پانچ برس سے
اوپر کے بچّے ابتدائی تعلیم پاتے ہیں - اور کوئی نہ کوئی دستکاری بھی اُنہیں سکھائی جاتی
ہے - کہیں چھوٹی چھوٹی لڑکیاں قالین بافی کا کام سیکھ رہی ہیں - کہیں سینا پرونا
اور کشیدہ کا کام ہو رہا ہے - اِسی کے آگے کپڑے دھونے کی ایک بڑی کل ہے -
جس میں ذرا العجزہ کے لڑکوں میں ذرا سیانے لڑکے کام سیکھتے ہیں - اس کل سے

ساکنین دار العجزہ کے کپڑوں کے دُھلنے کے علاوہ باہر کے کچھ کپڑے اُجرت پر بھی دھوئے جاتے ہیں۔ اور آگے چل کر آٹھ دس برس کی عمر کے بچّوں کی ایک جماعت بیٹھی تھی۔ اور ایک عیسائی مُعلّمہ انہیں پڑھا رہی تھی اور وُہی اُن کی خوابگاہ کی نگران تھی۔ خوابگاہ کے کمرے نہایت مصفّا تھے اور خوابگاہ کے نیچے کھانے کا کمرہ تھا۔ جہاں میز پر ہر ایک کے لئے علیحدہ دستمال رکھا تھا۔ اُن لڑکوں نے ایک تُرکی گیت سُنایا۔ اور اس کے بعد "پادشاہم چوق یشا" یعنی ہمارا بادشاہ دیر تک زندہ رہے کے نعرے بلند کئے۔ اس کے بعد ہم نے دار العجزہ کے مختلف کارخانے دیکھے۔ جہاں لڑکوں کو دستکاری سکھائی جاتی ہے۔ ایک کارخانہ بوٹ بنانے کا تھا۔ ایک درزیوں کا۔ اس کے سوا لکڑی کے کام کا ایک بہت بڑا کارخانہ تھا۔ جس میں لکڑی پر بیل بوٹے اور طرح طرح کے باریک کام کے نمونے بچّوں کے ہاتھ کے بنائے ہُوئے موجُود تھے۔

وزیر صیغۂ داخلیہ ممدوح پاشا کو اس کارِ خیر کی طرف بہت توجہ ہے اور یہ کام اُن کی نگرانی میں چل رہا ہے۔ اور اُمرائے دولت بھی کسی نہ کسی طرح کارکنوں کی حوصلہ افزائی کرتے رہتے ہیں۔ دیکھنے آتے ہیں تو بچّوں کو مٹھائی وغیرہ بانٹ جاتے ہیں۔ یہاں کی ساخت کی چیزیں خریدتے ہیں۔ جس دن ہم وہاں تھے اُس دن چند امیر خاتونیں معائنہ کے لئے آئی تھیں اور بچّوں کے کمروں کو نہایت شوق سے دیکھتی تھیں۔ موجودہ مدیر صاحب کو اس احاطے کے اندر عُمدہ باغ لگانے کا شوق ہُوا ہے اور اُمید ہے کہ ایک دو سال کے اندر باغ اچھی حالت میں ہو جائیگا۔ اس وقت اس کی عمارتیں بہت خوشنما معلوم ہونگی اور اس کے غریب ساکنوں کے لئے یہ جگہ ایک بہشت بنجائیگی۔

دار العجزہ کو جاتے ہُوئے عیسائیوں کی دو خوبصورت عمارتیں ملتی ہیں۔ اُن میں

ایک تو آرمینیوں کا قبرستان ہو اور دُوسری اہل بلغار کا یتیم خانہ - ارمینیوں کے قبرستان اوراس کے اندر کے گرجے کو تو ہم نے اُتر کر دیکھا - بڑی شاندار جگہ ہے اور ارمینیوں کے تموّل پر دلالت کرتی ہے - اُن کے بڑے بڑے سرکردہ گزشتگان کے بُت سنگ مرمر کے بنے ہُوئے قبرستان کے باغیچے کی زینت ہیں - قبرستان میں داخل ہونے کی کسی کو مُمانعت نہیں - مگر ہر ایک سے توقع کی جاتی ہے - کہ خیراتی صندوق میں جو نکلتے وقت دروازہ پر پیش کیا جاتا ہو کچھ ڈالتا آئے - دُوسری عمارت یعنی بلغاریوں کے یتیم خانہ کو ہم نہ دیکھ سکے - عمارت بڑی خوبصورت تھی اور دروازہ نہایت عالیشان - مَیں نے اپنے رفیق جلال اُنسی بے سے کہا کہ چلو اسے بھی دیکھیں - اُنہوں نے کہا کہ بلغاریوں کے متعلق یہاں ایسے خیالات ہیں کہ میرا اور آپ کا وہاں جانا شُبہ کی نظر سے دیکھا جائیگا اور شاید بلغاری بھی بلا اجازت اندر نہ جانے دیں - میں خاموش ہو رہا - مگر مجھے بار بار ان بلغاریوں کی ہمت پر رشک آتا تھا - کہ محض چندے سے کیسی شاہانہ عمارت بنا کھڑی کردی ہو - یہ قوم بڑی سرعت کے ساتھ ترقی کر رہی ہے - علم میں - ہنر میں - فنِ جنگ میں اور فداکاری میں - جاننے والے کہتے ہیں - کہ شرقِ یورپ میں بلغار کا خطہّ ایک دُوسرا جاپان بننے کو ہے اور اِن کا نمو محض ٹرکی کے لئے نہیں - بلکہ یورپ کی دیگر ہمسایہ سلطنتوں کے لئے خطرناک ہو - بلکہ ان کی بدولت ایک دن یورپ کے امنِ عامہ میں خلل پیدا ہونے کا اندیشہ ہو +

مطبعِ عثمانی

شفاخانوں کی طرح مطابع میں بھی عثمانیوں نے اچھی ترقی کی ہے۔ استانبول میں دو بڑے شاہی چھاپے خانے ہیں۔ اور اِن کے علاوہ لوگوں کے ذاتی مطابع بکثرت ہیں۔ ہم نے شاہی چھاپہ خانوں میں مطبعِ عثمانی کو دیکھا اور اخبارات کے مطابع میں ثروت الفنون اور صباح کے چھاپے خانے دیکھے۔ اور اُن کے عمدہ انتظام اور اُن کے کام کی خوبی سے طبیعت بہت خوش ہوئی۔ شاہی مطبع کی عمارت اس کے شان کے لائق ہے۔ اور اُس میں ٹائپ اور لیتھو دونوں قسم کی چھپائی اس نفاست سے ہوتی ہے کہ اُس سے بہتر کم دیکھنے میں آئی ہے۔ اِس مطبع میں سرکاری رپورٹیں اور کاغذات نہایت تکلّف سے چھپتے ہیں۔ یورپ میں اکثر رپورٹیں دیکھنے میں خوبصورت نہیں ہوتیں۔ انگریزی میں تو اُن کے نام ہی ان کی حالت کا پتہ دے رہے ہیں۔ "نیلی کتاب"۔ "پیلی کتاب"۔ "سفید کتاب" کا نام رپورٹوں کی مختلف اقسام کے لئے باعتبار اُن کے سرورقوں کے مخصوص ہوگیا ہے۔ لیکن ترکی میں جو رپورٹیں چھپتی ہیں۔ اُن کے سرورق کی آرایش میں مشرقی مذاق موجود ہوتا ہے اور ٹائپ اور لیتھو دونوں سے اُن کی آراستگی میں کام لیا جاتا ہے۔ مُلک اور صوبجات اور اضلاع کے نقشے اور اٹلس سرکاری مکاتب کے لئے یہیں چھپتے ہیں اور صفائی اور خوبی میں یورپ کے نقشوں سے کسی طرح کم نہیں ہوتے۔ اِسی طرح اکثر درسی کتابیں بھی یہاں شائع ہوتی ہیں۔ اِس عمارت کی دو منزلیں ہیں۔ نیچے پریس ہے اور لیتھو کا

سامان اور ٹائپ کا کام ہوتا ہے۔ مدیرِ مطبع اور اس کے معاونوں اور مطبع کے مُصحح کا دفتر بھی اُوپر کی منزل میں ہے۔ چھپائی کی نئی ایجادات سب اس مطبع میں مستعمل ہیں۔ ٹائپ جوڑ کر اُس سے براہِ راست ورق چھاپنے کی بجائے سکّہ کے پلیٹ تیار کرتے ہیں اور اُن پلیٹوں سے کتاب چھاپتے ہیں۔ یہی ترکیب انگلستان کے اخبارات کے مطابع میں عام طور پر مستعمل ہے۔ حروف جوڑ کر جب ایک صفحہ تیار ہو جائے تو اس پر ایک نرم سا مقوّہ رکھ کر پریس میں دباتے ہیں۔ سکّے کے حروف اس مقوّے میں گڑ جاتے ہیں۔ پھر پگھلا ہوا سکّہ اس مقوّے کے اوپر ڈال کر پلیٹ بنا لیتے ہیں۔ اس ترکیب سے ٹائپ بھی برسوں نہیں گھستا۔ چھپائی بھی اچھی ہوتی ہے۔ اور اگر ضرورت ہو تو پلیٹ محفوظ رہ سکتے ہیں۔ لیکن اگر ان سے مزید کام نہ لینا ہو تو فوراً بھٹی میں ڈال کر پگھلا لئے جاتے ہیں اور پھر اس طرح نئے پلیٹ اُن سے بن جاتے ہیں۔

اس مطبع میں وقتِ فرصت قرآن مجید چھپتے رہتے ہیں اور اس کے ذخیرہ میں ایک بڑی تعداد قرآن شریف کی جلدوں کی تیار رہتی ہے۔ یہ جلدیں سلطان المعظم کی طرف سے ایسے غریب مسلمانوں کو وقتاً فوقتاً تقسیم کیجاتی ہیں۔ جو پڑھنے کا شوق رکھتے ہوں۔ مگر جن کے پاس ہدیہ کے لئے روپیہ نہ ہو۔ اور بہت سی جلدیں ہر سال حج بیت اللہ کے کاروان کے ہمراہ مدینہ منوّرہ اور مکّہ معظّمہ کو بھیجی جاتی ہیں۔

ٹائپ جو مطبع عثمانی میں مستعمل ہے وُہ بھی ایک سرکاری کارخانے میں استانبول میں ہی ڈھالا جاتا ہے اور یہ ٹائپ گو مصر کے عربی ٹائپ سے ملتا ہوا ہے۔ تاہم اس سے زیادہ خوشنما ہے۔ ہمارے مُلک میں اُردو ٹائپ کی ضرورت مدّت سے محسوس ہو رہی ہے۔ اور ہمارے اخبارات اور رسالوں اور ہمارے علم ادب کی ترقّی بہت کچھ اس

ضرورت کے پُورا ہونے پر موقوف ہی۔ لیکن خطِ نستعلیق کا ٹائپ ابھی میسّر نہیں اور ہماری آنکھیں اُس سے مانوس ہیں۔ اِس لئے لوگ معمُولی عربی ٹائپ کی چھپائی پسند نہیں کرتے۔ اس کی بجائے اگر استانبول کا ٹائپ جو مطبع عثمانی اور دیگر مطابع میں مستعمل ہی لگایا جائے تو یقیناً زیادہ مقبول ہو۔ گو اصل قبولیت تو خطِ نستعلیق کے ٹائپ کو ہی حاصل ہو سکتی ہی۔ مَیں نے دریافت کیا کہ آیا ہم اس سرکاری کارخانے سے ٹائپ خرید سکتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ بغیر اذنِ شاہی کے کسی کو وہاں سے ٹائپ نہیں ملتا۔ اس کی یا تو یہ وجہ ہوگی کہ وُہ کارخانہ محض مقامی ضروریات سے زیادہ مہیا نہیں کر سکتا۔ اور یا وہی فہمِ تجارتی کی کمی جو عثمانیوں میں پائی جاتی ہی اور جو رفع نہیں ہو سکتی جب تک سرکاری کارخانوں کے سوا دُوسرے کارخانے ان چیزوں کی ساخت کے لئے نہ ہوں اور وُہ تجارت کی غرض سے تجارتی اصُول پر نہ چلائے جائیں۔

تانبے یا جست کے پلیٹ تصویروں کے چھاپنے کے لئے بھی استانبول میں خوب بنتے ہیں اور سرکاری رپورٹوں میں سے بعض جنہیں تصاویر کی ضرورت ہوتی ہے جیسے خستہ خانہ یا دار العجزہ کی ضخیم رپورٹیں، بکثرت تصاویر سے آراستہ ہوتی ہیں۔ درسی کتابوں میں بھی اکثر یورپ کی تقلید سے باتصویر چھپتی ہیں اور عام طور پر کتابوں اور رسالوں کے باتصویر چھاپنے کا شوق رُو بہ ترقی ہے۔ ثروت الفنون استانبول کے باتصویر پرچوں میں اس وقت بہترین پرچہ ہے اور اس کے اڈیٹر احمد احسان بے نہایت روشن خیال محبّ وطن ہیں۔ یہ پرچہ ہفتہ وار شائع ہوتا ہی اور چھپائی اور رنگ و روغن میں یورپ کے عمدہ باتصویر پرچوں کے قریب قریب ہے اس میں بعض اوقات رنگین تصویریں بھی شائع ہوتی ہیں اور مُلک کی عام معلومات

بڑھانے میں یہ معقول خدمت کر رہا ہے۔ علاوہ اس کے عام پسند تازہ تالیفات بھی اس مطبع میں چھپتی رہتی ہیں۔

استانبول کے مطابع میں اخبار معلومات کا مطبع ایک خاص اہمیت رکھتا تھا۔ لیکن افسوس بوجہ مالک کے محبوس ہونے کے وُہ مطبع بند پڑا ہوا ہے۔ دیگر اخبارات کے اور بڑے بڑے کتب فروشوں کے اپنے اپنے مطبع ہیں۔ اور عمومًا بارونق ہیں۔ بڑے پُل سے بابِ عالی کو جائیں تو ایک بازار کتب فروشوں کا آتا ہے۔ جس میں زیادہ تر جدید مذاق کی کتابیں بکتی ہیں اور روزانہ اخبارات مثل اقدام۔ صباح اور سعادت کے مطابع اسی بازار میں ہیں۔ مَیں نے اِن سب کے دفاتر دیکھے۔ یہ مطابع اور اخبارات بعض باتوں میں اپنے ہندوستانی ہمعصروں سے خوش قسمت ہیں اور بعض باتوں میں ہندوستان والے اِن سے اچھی حالت میں ہیں۔ لیکن اس اجمال کی تفصیل آگے آئیگی۔

کتابیں جو استانبول کے مطابع میں چھپتی ہیں۔ ٹائپ اور چھپائی میں عمومًا اچھی ہیں۔ لیکن علمِ ادب کی ترقی کی راہ میں ایک عرصے سے سرکاری نکتہ چینی کا روڑ ایسا اٹکا ہے۔ کہ بیشتر کتابیں بیجان جسم کا حکم رکھتی ہیں۔ اور کوئی کتاب نئی بارِ دل جس کے پڑھنے سے کسی طبیعت میں کوئی جوش یا ولولہ پیدا ہو۔ اندنوں نہ چھپ سکتی ہے نہ بِک سکتی ہے۔ اِس لئے ترکی زبان کا علمِ ادب ایک خاصی بلندی پر پہنچ رہ گیا ہے۔ اور اُس کا فیض بجائے نہرِ رواں کے فیض کے ایک تالاب سے مشا ہے۔ جس کے پانی میں حرکت نہ ہو۔ اور جس کے رنگ و بُو میں فرق آنے لگے۔ تا ترکی زبان اس لحاظ سے قابلِ رشک ہے۔ کہ مختلف علومِ جدیدہ کی اچھی اچھی کتابیں ترکی میں ترجمہ ہو گئی ہیں اور لوگ اُن سے مستفید ہو سکتے ہیں۔ اس کے سا

اب بھی یورپ کی ایسی کتابوں کے جو آزاد خیالات سے پُر نہ ہوں ترجمے شائع ہوتے رہتے ہیں۔ مگر آزادی بھی "نکورویوں" کی طرح "تابِ مستوری" نہیں رکھتی۔ اور بمصداق "چو دربندی سر از روزن برآرد" کسی نہ کسی طرح اپنا جلوہ دکھاتی ہے۔ چنانچہ استانبول میں فرانسیسی زبان کے رواج نے اس ساری روک تھام کو بے سُود کر رکھا ہے اور ہزاروں عثمانی زن و مرد فرانسیسی زبان اور فرانسیسی علم ادب سے وُہ سبق حاصل کرتے ہیں جو انہیں اپنی زبان میں میسّر نہیں +

اخباری دُنیا

بہ حیثیتِ اخبار نویس میرے لئے استانبول کی اخباری دُنیا کو دیکھنا ضروری تھا لیکن اگر مجھے خود کوئی تعلق اخبارات سے نہ ہوتا تو بھی میں استانبول کی زندگی کے اس پہلو سے غافل نہ رہتا۔ کیونکہ ملک کی ترقی کا ایک معیار اس کے اخبارات کی حالت ہے۔ استانبول میں جیسے بولنے میں کئی زبانیں مستعمل ہیں۔ اسی طرح اخبارات بھی مختلف زبانوں کے اس دارالخلافہ میں موجود ہیں۔ مُسلمانوں کے ہاتھ میں جو اخبارات ہیں وُہ ترکی زبان میں ہیں۔ اور عیسائیوں کے اخبارات عموماً دیگر زبانوں میں لیونٹ ہیرلڈ روزانہ دو زبانوں میں چھپتا ہے۔ ایک حصّہ انگریزی ہوتا ہے اور ایک فرانسیسی سٹامبول نام ایک اور فرانسیسی روزانہ ہے جو ہیرلڈ کا مدِّمقابل ہے۔ بعض عیسائی اخبارات سرب زبان میں نکلتے ہیں۔ جو روسی سے کسی قدر ملتی ہے۔ بعض کی زبان ترکی ہے مگر سرب حروف میں لکھی ہُوئی۔ لیکن ترکی اخبارات تعداد اور اشاعت میں ان سب سے زیادہ ہیں اور انہیں ہر مذہب و ملّت کے لوگ پڑھتے ہیں۔ ترکی روزانے آج کل چار ہیں۔ صباح۔ اقدام۔ ترجمانِ حقیقت اور سعادت۔ اور جیسا کہ ہر جگہ فطرتِ انسانی کا خاصہ ہے ان میں باہمی رقابت ہے۔ ہم ہمیشہ لوگوں کی رقابت تو قدرتی بات ہے۔ اس پر اعتراض نہیں لیکن رقابت کی بھی قسمیں ہیں اور درجے جب یہ حد سے گذر جائے تو ترقی کی مانع ہوتی ہے۔ جیسا کہ ہندوستان کے دیسی اخبارات کے تجربے سے ظاہر ہے۔ افسوس ہے کہ استانبول کی اخباری دُنیا

بھی ہمارے ہاں کی طرح اس مرض میں مبتلا ہیں اور وہاں یورپ کے دوسرے پایۂ تختوں کی طرح وُہ جائز رقابت نہیں جو خوبیوں میں ایک دُوسرے سے بڑھنے کی ترغیب دیتی ہے۔ ہمیں اس رقابت کا ایک ناگوار تجربہ ہُوا۔ اور وُہ یہ کہ سب سے پہلے ہم نے صباح کا مطبع دیکھا۔ اور اس اخبار میں ہمارے وہاں جانے کا ذکر شائع ہو گیا۔ اس کے بعد جو اقدام کے مطبع میں گئے تو صاحبانِ اقدام کو ناراض پایا۔ کہ ہم نے صباح کو اُن پر ترجیح دی۔ حالانکہ ہمارا ہرگز یہ منشا نہ تھا۔ بلکہ محض اتفاقی طور پر ہمارے مطبع صباح میں جانے کی تقریب پیدا ہو گئی تھی۔ اور وُہ یُوں کہ صباح کے اڈیٹر محمد توفیق آفندی سے استانبول پہنچنے سے پیشتر ریل میں ہماری ملاقات ہو گئی۔ وُہ گرمی کے سبب دیہات میں مقیم تھے اور صبح اُٹھ کر اپنے دفتر کو جانے کے لئے اُسی گاڑی میں سوار ہُوئے جس میں ہم تھے۔ چُونکہ اہی سیاحت میں ہندوستانیوں کو دیکھ چکے تھے اس لئے اُنہوں نے خیال کیا کہ ہم ہندوستانی ہیں اور عربی ہیں ہم سے پُوچھا کہ ہم کہاں کے رہنے والے ہیں۔ مَیں نے کہا ہند کے۔ اس پر باتیں شروع ہو گئیں باتوں باتوں میں معلوم ہُوا کہ وُہ اخبار نویس ہیں۔ مَیں نے کہا مَیں بھی اخبار نویس ہُوں۔ وُہ یہ سُنکر بہت خوش ہُوئے اور کہنے لگے۔ "ہمارے دفتر کو دیکھنے کے لئے ضرور آئیے گا۔ آج تو ہفتہ ہے جلدی دفتر بند ہوتا ہے اور آپ کو بھی سفر کی کوفت ہوگی۔ کل یکشنبہ کو مَیں وہاں نہیں ہُونگا۔ آپ دوشنبہ کو اگر آسکیں تو مَیں بہت ممنون ہُونگا۔" ہم نے وعدہ کیا کہ آئینگے۔ اِس طرح ہم سب سے پہلے وہاں گئے۔ کارخانہ نہائت معقول حالت میں نظر آیا۔ عمارت نئی بنی ہے۔ مالکِ کارخانہ مہران آفندی نامی ایک ارمنی صاحب ہیں۔ اُن سے بھی ملاقات ہُوئی۔ وُہ تجارتی اصُول پر کارخانے

کو چلاتے ہیں۔ لکھنے کا کام اڈیٹروں کے سپرد ہے۔ اور اُن میں کچھ ارمنی ہیں کچھ مُسلمان۔ لیکن اخبار کے خریدار بیشتر مُسلمان ہیں اور اس کی تحریر ایسی ہو۔ جس سے عیسائیت کا کوئی اظہار نہیں ہوتا اور سلطان المعظّم کی مدح و ثنا اور خلافت کی تائید و حمایت اس اخبار میں دُوسرے اخبارات سے بڑھ کر ہوتی ہے۔ اخبار کے دفتر میں ایک ترجمان انگریزی دان بھی تھا۔ اس کے توسّط سے ہم نے مالکِ اخبار سے باتیں کیں۔ اُن سے ہم نے پُوچھا کہ اشاعت کا کیا حال ہے۔ کہنے لگے بہت اچّھی ہے۔ بالا وسط تیس ہزار کے قریب بتائی۔ اشاعت استانبول میں دیگر مقاماتِ یورپ کے طریق پر ہو۔ یعنی زیادہ تر مدار روزانہ فروخت پر ہو۔ نہ کہ سالانہ خریداروں پر۔ روزانہ اخبارات کی قیمت یہاں سستی رکھی گئی ہو اور یہ بھی ایک راز ان کی معقول اشاعت کا ہو۔ ادھنّی فی پرچہ عام قیمت ہو۔ بازاروں کے موڑوں پر اخبار بیچنے والے کھڑے رہتے ہیں اور ہر شخص ادھنی ادھنّی کو ایک پرچہ لے جاتا ہے۔ ان کے علاوہ صرّافوں کی دوکانوں اور کتب فروشوں کے ہاں بھی اخبارات فروخت کے لئے موجود ہوتے ہیں۔

صباح والوں کی مُلاقات کے دُوسرے دِن بابِ عالی سے جلال بے ہماری رفاقت میں دیئے گئے۔ دو تین دِن بعد ایک دن وُہ اور ہم اس چھوٹی سی تہ زمینی ریل میں سوار ہُوئے جو پُل سے غلطہ کو جاتی ہے اور جسے "ٹُونل" کہتے ہیں۔ ریل میں ایک صاحب اخبار اقدام کے اڈیٹروں میں سے بیٹھے تھے۔ جن کا نام اسمٰعیل حقّی آفندی تھا۔ جلال بے انہیں پہچانتے تھے۔ اُنہوں نے ملاقات کرائی۔ وُہ کہنے لگے "ہمارے مطبع میں بھی آپ کو آنا چاہیئے۔ بلکہ صباح سے پہلے آپ کو ہمارے ہاں آنا چاہیئے تھا۔ کیونکہ وُہ عیسائی کا پرچہ ہے۔ اور ہمارا پرچہ ایک مُسلمان کی ملک ہے۔

ویسے بھی اُس سے مقدّم سمجھا جاتا ہے"۔ مَیں نے کہا کہ ہم آپ کے ہاں بڑے شوق سے آئیں گے۔ چنانچہ اس قرارداد کے موافق ہم مطبع اقدام میں گئے۔ اسمٰعیل حقی آفندی فارسی بولتے تھے۔ اُن سے فارسی میں باتیں ہوتی رہیں۔ پُوچھنے لگے "آپ کے استانبول آنے کا کیا مقصد ہے"۔ مَیں نے کہا سیر وسیاحت اور مسلمانانِ ہند اور عثمانیوں کے درمیان رشتۂ محبّت کی مضبوطی کے ذرائع ڈھونڈھنا۔ مَیں نے اس سلسلے میں اپنی مسرّت کا اظہار کیا کہ عثمانی اخبارات ہندوستان کے مُسلمانوں کے حالات ہندوستان کے اخبارات کے حوالے سے درج کرتے رہتے ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ اردو اخبارات سے براہ راست ترجمہ کرانے کا کوئی انتظام نہیں۔ بلکہ مصر کے اخبارات کے ذریعے سے انہیں خبریں ملتی ہیں اور مصر کے اخبارات عموماً انگریزی اخبارات سے نقل کرتے ہیں۔ اُنہوں نے جواب دیا "میرے نزدیک تو یہاں آپ کا آنا لاحاصل ہو۔ یہاں کے باشندے اور یہاں کے اخبارات بالکل بیجان ہیں۔ اُن کے ہاتھ پاؤں جکڑے ہُوئے ہیں۔ جو وُہ کسی کے کچھ کام آسکتے ہیں نہ اپنے۔ اخبارات کی حالت آپ نے ان چند روز میں دیکھ ہی لی ہوگی۔ اُن میں کیا ہوتا ہے۔ خبروں پر رائے زنی کرنے کا تو کیا ذکر۔ خبریں بھی سب درج نہیں ہونے پاتیں۔ ہر روز ہمیں اخبار کی ضرورت سے دُوگنا رطب و یابس تیار کرنا پڑتا ہے۔ تاکہ اگر سنسر[1] صاحب عین وقت پر کوئی دو چار کالم ردّی کردیں تو کچھ اَور مواد موجود ہو۔ جو اُن کی جگہ رکھدیا جائے۔ ہر شام کو کام کرکرا کے رُوح قبض ہوتی ہو کہ خدا جانے اخبار نکلنا پائے گا بھی یا نہیں۔ باوجودیکہ اس میں سوائے بیکار

[1] سنسر۔ انگریزی اور فرانسیسی میں اس افسر کو کہتے ہیں جس کا کام اخبارات کے مضامین کی پڑتال ہو۔ اور جو مجاز ہو کہ جس مضمون کی اشاعت اُسے نامناسب معلوم ہو اسے روک دے ۱۲

خبروں کے کوئی مضمون بھی تو کام کا نہیں نکلنے پاتا۔ کسی کی نسبت یہ ڈر ہو کہ دول یورپ اس سے ناراض ہونگی۔ کوئی رعایا کے خیالات کو بھڑکانے والا سمجھا جاتا ہے۔ آزادی۔ اِصلاح۔ اتحاد۔ یہ سب الفاظ ممنوع ہیں۔ آپ ہی کہئے کہ اخبار اس حالت میں کس کام آسکتے ہیں"۔ مَیں نے کہا:۔ محکمۂ سنسر کی صعوبتوں کی نسبت آپ کی شکایت بجا ہو۔ لیکن مَیں آپ کے اخبارات کی قوّت کو اس مایوسی کی نگاہ سے نہیں دیکھتا جس سے آپ دیکھتے ہیں۔ مانا کہ اخبارات کو آپ کے ہاں وُہ قوت حاصل نہیں جو بعض اَور ملکوں میں اُن کا حصہ ہو۔ لیکن اس پر بھی وُہ بڑا کام کر رہے ہیں۔ ہر اخبار کے ہزاروں پرچے روز ملک میں پھیل جاتے ہیں۔ اُن میں صرف خبریں بھی ہوں جب بھی لوگوں کے خیالات میں وُسعت پیدا ہوتی رہتی ہو۔ آپ کے اخبارات کی اشاعت ملک میں اخبار بینی کے مذاق کا ثبوت دیتی ہے۔ آپ کے اخبارات ٹائپ سے چھپتے ہیں۔ اور آپ کی اپنی زبان میں۔ یہ باتیں ایسی ہیں۔ جن پر ہم ہندوستان والے رشک کر سکتے ہیں۔ ہمارے ہاں ہمارے اخباروں کی اشاعتیں عموماً محدود۔ مالی حالت اکثر خستہ اور لیتھو کی محتاجی۔ ہم آپ سے اس خصوص میں ابھی منزلوں پیچھے ہیں۔ مگر پھر بھی مایوس نہیں۔ آپ کو تو اُمید کے لئے بہت زیادہ گنجائش ہو۔ جس دن یہ جانچ پڑتال کی سختی رفع ہو جائے۔ تُرکی مطابع فوراً وُہ اثر حاصل کر لینگے۔ جس کی اُنہیں آرزو ہے۔ کیونکہ آپ کے ہاں ڈھانچہ مکمل موجود ہو۔ جسم تیار ہے۔ اُس میں ذرا جان ڈالنے کی ضرورت ہو"۔ اس موضوع پر اس قسم کی بحث کچھ دیر تک جاری رہی۔ مگر اسمٰعیل حقی آفندی اپنی رائے بدلنے کی طرف مائل نہ ہُوئے۔ یعنی مصلحتاً مضمونِ گفتگو بدل دیا۔ اور تھوڑی دیر کے بعد اُن سے اجازت لیکر ہم رخصت ہُوئے۔

اس کے بعد ہم نے سعادت کا مطبع دیکھا۔ جو دفتر اقدام کے قریب ہی واقع ہے۔ اس کے مالک و اڈیٹر دو تعلیم یافتہ اور خوش خیال نوجوان ہیں۔ احمد بے اور نافذ بے ان سے ملکر ہم بہت مسرور ہوئے۔ یہ پرچہ ایک زمانے میں بہت زور پر تھا درمیان میں بند ہوگیا اور اب پھر کچھ عرصے سے از سر نو جاری ہوا ہے اور اس کے کارکن اسکی کامیابی میں پوری سعی کر رہے ہیں۔ ان اخبارات میں سے ہر ایک کو تھوڑی سی مدد خرچ سرکاری طور پر بھی ملتی ہے۔ اور اس کا غیر متیقن ہونا اکثر ان کی حالت کو بھی غیر متیقن کر دیتا ہے۔

ترجمانِ حقیقت کے مطبع میں ہم نہیں گئے۔ لیکن اس کے مالک و اڈیٹر جودت بے آفندی سے ایک دن عزت پاشا کے کمرے میں سرائے ہمایون میں ہماری ملاقات ہوگئی۔ تجربہ کار اخبار نویس ہیں۔ مگر اندنوں کوئی سرکاری عُہدہ بھی ان سے متعلّق ہے اور اخبار کا کام ان کے ملازمین ان کے زیر نگرانی چلاتے ہیں استانبول میں اخبارات عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں اور جو شخص جرائد کے ذریعے سے نام پیدا کرے۔ اس کے لئے حکومت کے عہدوں کے راستے کھلنے کی بھی نظیریں موجود ہیں۔ ہز ہائی نس فرید پاشا صدر اعظم ایک زمانے میں جرائد سے متعلق تھے اور اہلِ قلم میں امتیاز رکھتے تھے۔

روزانہ اخباروں کے سوا استانبول میں کئی ہفتہ وار پرچے اور دیگر موقت الشیوع رسالے ہیں۔ اُن میں ثروت الفنون کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ بچّوں کے لئے اور عورتوں کے لئے خاص پرچے علیحدہ ہیں۔ افسوس کہ عربی یا فارسی میں آجکل کوئی اخبار استانبول سے نہیں نکلتا۔ جب معلومات زندہ تھا تو اس کا ایک پرچہ عربی

بھی تھا۔ فارس میں ایک زمانے میں ایک اخبار نکلا تھا۔ مگر بعض مقامی مصلحتوں سے وُہ جلد
بند کیا گیا۔ مجھ سے اور جودت بے سے اس بارے میں گفتگو ہوئی۔ اور مَیں نے کہا کہ
ایک اخبار عربی اور ایک فارسی مقامِ خلافت سے نکلنا ضروری ہے۔ تاکہ اس بڑے
اسلامی مرکز کے حالات شرح وبسط کے ساتھ دُوسرے اسلامی ملکوں میں معلوم ہو
رہیں۔ عربی اخبار عرب وشام ومصر اور شمالی افریقہ کے دُوسرے حصّوں کے لئے
مفید ہوگا اور ہندوستان میں بھی پڑھا جا سکیگا اور فارسی اخبار ہندوستان
اور ایران اور افغانستان میں عثمانیوں کے متعلق صحیح اطلاعات کا ذریعہ ہوگا۔ اُنہوں
نے کہا کہ اگر حکومت سے اجازت مل جائے تو وہ فارسی اخبار نکالنے کو آمادہ ہیں
اس کے بعد مَیں نے بعض ارکین دولت کو اس ضروری امر کی طرف متوجہ کیا۔ یہ نہیں
جاسکتا کہ انہیں اس کے متعلّق کوئی عملی کارروائی کرنے کا خیال رہیگا یا نہ رہیگا
اور ان کی کوشش کامیاب ہوگی یا نہ ہوگی۔ مگر انہوں نے مجھے یقین دلایا۔ کہ وُہ ایک
ایسے اخبار کی ضرورت کے معترف ہیں اور حتی الامکان اس کے لئے اجازت حاصل کرنے
کی سعی کرینگے۔

اخبارات کے متعلق سب سے زیادہ دِل خوش کُن چیز جو استانبول میں نظر آئی
وُہ یہ تھی کہ ادنیٰ و اعلیٰ ہر طبقے کے لوگ اخبار کا شوق رکھتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے قہوہ خانوں
میں بھی اخبارات رکھے ہیں اور سب لوگ انہیں پڑھتے ہیں۔ اگر یہ اخبار سب مضامین
آزادانہ لکھ سکیں تو دنوں میں قوم بیدار ہو جائے۔ مگر اب بھی عثمانی حالاتِ عالم سے
بے خبر نہیں۔ کم از کم پایۂ تخت کا ہر عثمانی یہ کہ سکتا ہے کہ ع زکارِ جہاں بے خبر نیستم
لوگ اخبار غور سے پڑھتے ہیں اور ذرا ذرا سی خبر بھی اُن کی نظر سے نہیں بچتی

ہمارے وہاں پہنچنے کے متعلّق جس دن اخبارات میں مضمون نکلے۔ اُس دن ہم نے دیکھا کہ بازاروں میں کئی لوگ ہم کو پہچانتے تھے۔ اور ایک دُوسرے سے کہتے تھے کہ یہی وہ ہندوستانی ہیں جن کے آنے کی خبر آج صبح پڑھی تھی۔ اور ہمیں رستہ بتانے میں غیر معمولی اخلاق سے کام لیتے تھے۔

اخبارات پر لوگوں کی اس توجہ کو مَیں ان اخبارات کے حق میں فال نیک سمجھتا ہوں اور اسی سے مجھے امّید ہوتی ہے کہ کسی دن یہ اخبار بہت مفید ثابت ہونگے*

تربیتِ اطفال

ہر قوم کی زندگی میں تربیتِ اطفال ایک جزوِ ضروری ہے۔ جس پر اس کی آیندہ بقا موقوف ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر بیحد مسرت ہوئی کہ عثمانیوں کو تربیتِ اطفال کا بہت خیال ہے۔ اور جس سلیقے سے متوسط طبقے کے عثمانی اپنے بچوں کی پرورش کرتے ہیں وُہ ہر طرح تعریف کے قابل ہے۔ مغربی اور شرقی دونوں تربیتوں کے مناسب ملاپ سے عثمانی بچوں کے عادات اور اطوار میں ایک عجیب جوہر پیدا ہوگیا ہے۔ وُہ بزرگوں کے ادب میں پُورے ایشیائی ہیں اور بزرگوں کے روبرو ہوشیاری سے بات چیت کرنے میں اور اُن کی صحبت میں متانت کے ساتھ بیٹھنے اُٹھنے میں یورپ کی دیگر اقوام کے بچوں سے کم نہیں۔

بچوں کے لئے استانبول کے ہر حصے میں ابتدائی مدرسے ہیں۔ اُن مدرسوں کو دیکھنے کا مجھے اتفاق نہیں ہوا۔ مگر کئی گھروں میں چھوٹے چھوٹے بچوں کو دیکھا جو وہاں سے پڑھ کر آتے تھے اور اُن میں سے بعض کی خواندگی کا امتحان بھی کیا۔ تو معلوم ہوا کہ خواندگی معقول ہے۔ قرآن مجید سب پڑھتے ہیں۔ ترکی کی ابتدائی کتابیں رواں پڑھ سکتے ہیں اور ان کا مطلب آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔ حساب میں ضرب تقسیم تک سیکھ چکتے ہیں۔ اپنے ملک کے جغرافیہ اور بعض تاریخی حالت سے بھی تھوڑی سی واقفیت رکھتے ہیں۔ اِن ابتدائی مدرسوں میں چھوٹے چھوٹے لڑکے لڑکیاں دونو پڑھتے ہیں۔ اور بڑی لڑکیوں کے مکاتب علیحدہ ہیں۔

مدرسے کے بعد گھر میں بچّوں کی مائیں بہنیں اُن کی خواندگی کے دُہرانے اور اُنکی عام تربیت کی ذمہ دار ہیں اور یہی سب سے بیش بہا حصّہ اُن کی پرورش کا ہے۔ بچّوں کی حرکات سکنات دیکھ کر جی خوش ہوجاتا ہے۔ لباس نہایت صاف اور ستھرا۔ اطوار دل لبھانے والے۔ جب اُن کے بزرگوں کی مُلاقات کے لئے لوگ آتے ہیں۔ تو بچّے بھی سلام کرنے آتے ہیں۔ کمرہ میں داخل ہوتے ہی جھک کر ہر بزرگ کے پُشتِ دست کو چُومتے ہیں اور پھر ادب سے ایک طرف کھڑے ہوجاتے ہیں۔ اگر باپ کی طرف سے یا مہمان کی طرف سے اشارہ پائیں تو بیٹھ جاتے ہیں۔ ورنہ کھڑے رہتے ہیں اور جو بات پُوچھی جائے اس کا مناسب جواب دیتے ہیں۔ اس کے بعد جب چار یا قہوہ آئے تو اپنے ہاتھ سے پیش کرتے ہیں۔ بعض دفعہ گھر میں خادموں کے ہوتے ہُوئے میں نے بچّوں کو خوش خوش یہ خدمت کرتے دیکھا۔ بہت بھلے معلوم ہوتے تھے۔ لڑکیوں کی تربیت میں مدرسے کی خواندگی اور سینے پرونے کی پڑھائی کے ساتھ خانہ داری کی تعلیم بھی شامل ہو۔ اور وُہ ماباپ کا ہاتھ بٹانے میں لڑکوں سے زیادہ مُستعدی دکھاتی ہیں۔ اس صفت میں وُہ یورپ کے خوشحال گھروں کی لڑکیوں سے بہتر ہیں۔ استانبول میں اُنکی ظاہری صُورت باعتبار پوشش و وضع کے بالکل یورپ کی لڑکیوں کی سی ہو۔ بچپن میں سر پر دوپٹہ نہیں ہوتا۔ ایک کھُلا سا جامہ یورپی قطع کا زیبِ تن ہوتا ہو۔ پاؤں میں بُوٹ اور جرابیں۔ اُن کی تعلیم میں بھی بہت سی باتیں یُورپ کے طریق پر ہیں۔ مثلاً موسیقی کا سبق اُن کے نصاب میں موجود ہے۔ فرانسیسی زبان بھی سکھتی ہیں۔ اس پر وُہ یورپ کی اکثر خوشحال لڑکیوں کی طرح کھانے پکانے گھر بار کی خبر گیری

اور بزرگوں کی خدمت اور بچوں کی نگہداشت کے فرائض سے بے بہرہ نہیں رہتیں۔ عثمانی اس عُمدہ مشرقی اصُول پر کاربند ہیں کہ لڑکیوں کو اپنے گھر میں جس قدر محنت اور کام کاج کی عادت ہوجائے۔ اسی قدر اُن کے لئے مفید ہے۔ جب بیاہی جائینگی اور اپنا گھربار بنائینگی۔ تو یہ مشق اُن کے کام آئیگی۔

ہمارے دوست جلال بے کی ایک صاحبزادی[1] کوئی نو سال کی ہوگی۔ ایک دن اُنہوں نے کہا کہ اس کی خواندگی دیکھئے۔ سب مضامین میں اس نے معقول امتحان دیا۔ آخر ہم نے اس سے کہا کہ قرآن مجید بھی تھوڑا سا سُناؤ۔ وُہ پہلے ننگے سر بیٹھی تھی۔ دَوڑ کر دوپٹہ لے آئی اور دوپٹے سے اپنی پیشانی تک ڈھانپ کے اُس نے قرآن پڑھنا شروع کیا۔ اِس سے معلوم ہوا کہ فرنگیوں کی ہمسائیگی اور دیگر اثرات سے گو بہت سی عادات اہل یورپ کی چپکے چپکے عثمانیوں میں گھُس آئی ہیں اور آتی جاتی ہیں۔ مگر اسلام کی خوبیاں اُن کے دِل میں بدستور جاگزین ہیں۔ اور وُہ قرآن کی عظمت۔ اسلامی عبادات اور معتقدات میں کسی دُوسرے ملک کے مُسلمانوں سے کم نہیں۔ نماز روزے کی تلقین بچوں کے ہوش سنبھالتے ہی شروع کی جاتی ہے۔ اور اکثر اوقات مدت العمر کے لئے مفید ثابت ہوتی ہے۔ نوجوانوں جدید تعلیم یافتہ لوگوں میں جتنی تعداد نماز ادا کرنے والوں کی تُرکوں میں مل سکتی ہے۔ شاید اَور کہیں نہ مل سکے گی۔ اور عورتیں چونکہ ہر جگہ مذہبی اُمور میں مردوں سے زیادہ محتاط ہوتی ہیں۔ اس لئے عثمانیوں کی نئی تعلیم پائی ہوئی لڑکیوں میں بھی نماز روزے کا چرچا ہے +

---

[1] ترکی میں کسی لڑکی کا ذکر کرتے ہیں تو اُسے کریمہ کہتے ہیں اور لڑکے کو مخدوم۔ یعنی آپ کا صاحبزادہ" کہنے کی بجائے کہیں گے "آپ کا مخدوم" اور اگر "صاحبزادی" کہنا ہو تو "آپ کی کریمہ" ۱۲

تعلیمِ نسواںؔ

بچوں کی تربیت کی جس خوبی کا مَیں نے ذکر کیا ہے ۔ظاہر ہے کہ وہ تعلیم یافتہ ماؤں بہنوں کے بغیر ناممکن ہو۔ اور یہ عثمانی عورتوں کے تعلیم یافتہ ہونے کا ہی نتیجہ ہے کہ اُن کے بچے ایسے سُلجھے ہوئے ہیں۔ اُن کے ہاں یہ بات عملی طور پر مسلّم ہو کہ عورتوں کی تعلیم ویسی ہی اہمیت رکھتی ہو جیسے مردوں کی تعلیم ۔صرف درجے کا فرق ہے ۔عام طور پر زنانہ مدرسوں کی تعلیم مضامین کے لحاظ سے ہمارے ہاں کے ہائی سکول کے برابر سمجھنی چاہیئے ۔ اور سینا پرونا کاڑھنا ۔نقاشی۔ موسیقی وغیرہ ہنر اس کے علاوہ ہیں اور باقی مضامین کے ساتھ ساتھ سکھائے جاتے ہیں ۔اس سے اوپر کے مدارج کی تعلیم کے لئے کوئی مدرسہ یا کالج عورتوں کے لئے نہیں ہو۔لیکن بعض امرا جو اپنی لڑکیوں کو یورپ کے اونچے گھروں کی لڑکیوں کے برابر تعلیم یافتہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ وُہ یورپ سے اُستانیاں منگوا کر گھر میں اُنہیں پڑھاتے ہیں اور وُہ لڑکیاں فرانسیسی یا جرمن زبان میں نہایت معقول دستگاہ پیدا کر لیتی ہیں۔ اور اُن زبانوں کے ادبیات سے عُمدہ واقفیت رکھتی ہیں۔ گو زیادہ مشکل اور فکر طلب مضامین سے آشنا نہیں ہوتیں۔

ایک دن اتفاق سے ہمیں اپنے ایک دوست کے گھر ایک فارغ التحصیل لڑکی کی معلومات کا اندازہ کرنے کا موقع مِل گیا۔ وُہ لڑکی مدرسے کی تعلیم دو سال ہُوئے ختم کر چکی ہے ۔اور اب اُستانی ہے۔ لڑکیوں کے ایک مدرسے میں معلّمہ دوم ہو۔ اس روز

اپنی بڑھیا والدہ کے ہمراہ ہمارے دوست کے ہاں آئی ہوئی تھی۔ وہ اس مدرسے کے نگراں ہیں۔ اُن سے کچھ کہنا سُننا تھا۔ اِس لئے اپنی سند ساتھ لائی تھی۔ ہمارے دوست نے وہ سند ہمیں لا کر دکھائی کہ اِس سے معلوم ہو کہ کن کن مضامین میں اُستانی صاحبہ نے امتحان دیا ہے۔ دیگر مضامین کے علاوہ تاریخ۔ جغرافیہ۔ حساب۔ عربی فارسی اور فرانسیسی سب اُس سند میں درج تھے۔ ہم نے کہا خاصی جامع تعلیم ہے۔ مگر دریافت کیا کہ ان مضامین میں کس درجے کی مہارت اسے حاصل ہے۔ اُنہوں نے کہا۔ یہ آپ خود دریافت کر سکتے ہیں۔ ہم نے کہا۔ کیسے۔ اُنہوں نے کہا ہم اُستانی کو اور اسکی ماں کو اُوپر بُلائے لیتے ہیں۔ مَیں نے حیران ہو کر کہا کہ وُہ پردہ دار ہیں کیسے آئینگے۔ انہوں نے کہا۔ اُنکی والدہ تو ضعیفہ ہیں۔ اب مُنہہ چھپا کر نہیں پھرتیں۔ اور اُستانی صاحبہ ابھی بن بیاہی لڑکی ہیں۔ اُنکے لئے بھی مُنہہ چھپانا ضروری نہیں۔ مجھے اس دستور کا پہلے علم نہ تھا اور مَیں بازار میں بعض اوقات چند نقاب پوش عورتوں میں کسی ایک آدھ کو بے نقاب دیکھ کر متعجب ہوتا تھا اور یہ سمجھتا تھا۔ کہ یہ پردہ کی پروا نہیں کرتیں۔ لیکن معلوم ہوا۔ کہ ترکوں میں لڑکی جب تک بیاہی نہ جائے اُس وقت تک مجھے ہے کہ مُنہہ پر نقاب نہ ڈالے۔ فراجہ اوڑھے رہنا اس کے لئے کافی ہے۔ کہ بہت ہی حیادار ہوئی اُس نے نقاب گرا لیا۔ ورنہ جو نہ گرائے اس کا عمل خلاف رواج نہیں۔ پردہ عثمانیوں میں اوّل تو دیر سے شروع ہوتا ہے۔ یعنی بارہ برس تک تو لڑکی محض سر پر دوپٹہ لیکر باہر نکل سکتی ہے۔ اور اس کے بعد فراجہ پہننا شروع کرتی ہے۔ چہرے کا پردہ اصل میں بیاہ کے بعد شروع ہوتا ہے۔

وُہ اُستانی صاحبہ آئیں اور اُن کی والدہ بھی ساتھ تھیں۔ السلام علیکم

علیکم السلام - ہم نے تکلیف دہی کی معذرت چاہی اور کہا کہ مُدعا اُن کا امتحان نہیں - بلکہ مروجہ تعلیم نسوان کا اندازہ کرنا مقصود ہے - اُنہوں نے کہا - آپ بے تکلف جس مضمون کے متعلق چاہیں سوال کریں - مَیں اپنی واقفیت کے مطابق جواب دونگی - اور اس سے اگر کچھ آپ کو عام تعلیم کے متعلق قیاس کرنے میں مدد مل سکے تو میں خوش ہونگی - ہم نے پہلے انہیں حساب کا ایک سوال دیا جو اُنہوں نے سیاہ بورڈ پر ہمارے روبرو حل کیا - پھر ایک عربی عبارت لکھوائی اور اس کا ترجمہ پُوچھا - پھر فارسی کے چند فقرے پُوچھے پھر فرانسیسی کے - کچھ نام جغرافیہ میں ہندوستان کے شہروں کے پُوچھے اُن کی سمت وغیرہ سے وُہ واقف تھیں - ہمارے دوست نے ایک آدھ سوال تاریخ عثمانی کا پُوچھا - اُس کا اُنہوں نے خاطر خواہ جواب دیا - اس کے بعد ہم نے اُن کا شکریہ ادا کیا اور اُن کی قابلیت کی تعریف کی - انہیں دیکھ کر اور اُن سے یہ معلوم کر کے کہ سب اُستانیوں کو ملازمت ملنے سے پہلے وہی سند حاصل کرنی پڑتی ہے جو اُن کے پاس تھی - یہ اطمینان ہوا کہ تعلیم نسوان استانبول میں اچھے ہاتھوں میں ہے -

جتنے حضرات سے میری مُلاقات استانبول میں ہُوئی - قریب قریب سب نے مجھ سے پُوچھا کہ ہندوستان کے مُسلمانوں میں تعلیم نسوان کی کیا حالت ہے - جس سے معلوم ہوتا تھا کہ اِس مسئلے کے ساتھ اُنہیں بہت دلچسپی ہے - پُرانی وضع کے علما تک کو مَیں نے عورتوں کی تعلیم کی ضرورت پر متفق پایا - ہاں یہ فرق ضرور ہے کہ اُن میں سے اکثر فرانسیسی وغیرہ کا سبق عورتوں کے لئے ضروری نہیں سمجھتے - بلکہ وہ اور انکے ہم خیال عورتوں کی تعلیم کے اس پہلو کو مضر سمجھتے ہیں - سال گذشتہ کے اوائل میں استانبول میں ایک ناگوار واقعہ پیش آیا - وُہ یہ کہ وہاں کے ایک اچھے گھر کی

دو جوان لڑکیاں جن کا باپ ایک معزز عہدہ دار ہے - اور جس نے نئے خیالات کے سبب انہیں فرانسیسی معلّمہ کی شاگردی میں دیا تھا - آزادی کے شوق میں فرانس کو بھاگ گئیں - شاید فرانس کی آزادانہ زندگی کے حالات پڑھ کر انہیں پردہ میں رہنا دشوار معلوم ہوا - اُنہوں نے کسی ذریعے سے دو فرانسیسیوں سے رسم و راہ پیدا کی اور گھر چھوڑ دیا - ماباپ پر جو مصیبت گذری ہوگی - اس کا تو کیا ٹھکانا ہے - وُہ اپنی دُوسری بہنوں کے حق میں بھی کانٹے بو گئیں اور اُن کے اعتبار میں فرق ڈال گئیں - مگر خوش قسمتی سے ایسے واقعات شاذ ہیں اور اُن سے یہ قیاس کر لینا درست نہ ہوگا - کہ سب عورتیں جو فرانسیسی پڑھ سکتی ہیں - ایسی ہیں - یا اپنی حالت سے بیزار ہیں - فرانسیسی پڑھنے والی عورتوں کی تعداد وہاں بہت ہے - اور اُن میں بہت سی عورتیں اپنے شوہروں کی وفادار بیبیاں اور اپنے والدین کی وفادار لڑکیاں ہیں - جو مرنا قبول کریں - مگر اپنی آبرو اور اپنے بزرگوں کے ناموس پر کوئی دھبہ نہ آنے دیں - البتہ آزاد خیالی یورپ کے اکثر ادبیات میں پائی جاتی ہے اور فرانسیسی میں اَور زبانوں سے بڑھ کر ہے - یہ اپنا اثر کئے بغیر نہیں رہتی - اس میں شک نہیں - کہ استانبول میں ہندوستانیوں کی طرح بہت سے نو تعلیم یافتہ زن و مرد پردہ کی قید سے قطعی آزاد ہونے کے آرزومند ہیں اور چاہتے ہیں کہ اپنے یوروپین دوستوں کی طرح اپنی بیویوں کو ساتھ لیکر سیر کو نکلیں - مگر بادشاہِ وقت کا رُعب مانع ہے - جو موجودہ صُورت پردہ کی استانبول میں قائم ہے - وُہ تو ملکی رواج کی منظوری پا چکی

ہے اور اس پر نہ وہاں کے علما کو اعتراض ہے نہ سلطان المعظم کو۔ لیکن یہ سب کو اچھی طرح معلوم ہے۔ کہ اگر اس حد سے کوئی گذرنا چاہے تو نہ صرف کثرتِ رائے اس کے خلاف ہوگی۔ بلکہ حکومت کی طرف سے اعتراض ہوگا۔ اس لئے وُہ اپنے خیال کے مطابق عمل کرنے کی جُرأت نہیں کرتے۔ آزادی کے اس میلان کو دیکھ کر جو لوگ تعلیم سے گھبراتے ہیں۔ انہیں یہ یاد رکھنا چاہئے۔ کہ یہ ایک حد تک تو زمانے کی ہوا ہے۔ جو پڑھے ہیں اُن کو بھی لگتی ہے اور جو نہیں پڑھے اُن کو بھی لگتی ہے۔ یورپ والوں کا ستارہ آج کل زبردست ہے۔ دُنیا بھر میں اُن کی ہر ادا مقبول ہوئی جاتی ہے۔ جتنے ادھوری اور کچّی تعلیم کے لوگ ہیں وُہ تقلید کے قدرتی شوق سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں اور جتنے ذی علم اور غیور لوگ ہیں وُہ باوجود علومِ جدیدہ کی تحصیل کے اکثر امور میں اپنے تمدن کی خوبیوں کے معترف ہیں اور کوئی ترمیم یا تغیر بغیر اشد ضرورت یا نہایت معقول وجوہات کے نہیں کرتے۔

عثمانی عورتیں کتابوں کے سوا اخبارات اور رسالے بھی بکثرت خریدتی اور پڑھتی ہیں۔ اور اس طرح ملک کے اخبارات کی اشاعت بڑھانے میں مردوں کے شریکِ حال ہیں۔ اُن کا سیر کرنے یا خرید فروخت کے لئے باہر نکلنا بھی انہیں گردوپیش کی دنیا کی خبر دیتا رہتا ہے۔ اور یہ کہنا بالکل مبالغہ نہیں کہ تعلیم اور واقفیتِ عامہ کے لحاظ سے عثمانی خواتین آج کل اسلامی دُنیا کی پیشرو ہیں +

عثمانی مُعاشرت

عثمانیوں کے ہاں تربیتِ اطفال اور تعلیمِ نسواں پر جو توجہ ہے اُس کا اثر اُنکی عام معاشرت پر صاف نظر آرہا ہے۔ اُن کی مُعاشرت بہت سی باتوں میں ایشیا اور یورپ دونوں کے تمدّن کی جامع ہے۔ اور قدرت نے جغرافی اِعتبار سے جو جگہ ایشیا اور یورپ کے درمیان اُن کے وطن کو دی ہے۔ وُہی صورت اُن کی عادات اور طریقِ بود و باش میں پیدا ہوگئی ہے۔ یعنی مشرق و مغرب کے بَین بَین۔

استانبول میں عثمانیوں کا لباس عموماً یورپ کا لباس ہے۔ عُہدہ داران و مُلازمانِ سرکاری۔ اور جدید تعلیم یافتہ اور سب کے سب تجارت پیشہ لوگ اکثر کوٹ پتلون پہنتے ہیں۔ فقط عُلما اپنی پُرانی وضع نباہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر اُن کے لباس میں بھی بعض چیزیں مغرب سے گھُس آئی ہیں۔ البتّہ سر کی پوشش میں سب عثمانیوں نے دیگر اقوامِ یوُرپ سے اپنے آپ کو آج تک علیحدہ رکھا ہے اور یورپ کی بڑی ٹوپی کو اختیار نہیں کیا۔ استانبول میں ایک مُسلمان بھی ایسا نہیں جو موجودہ یورپ کی ٹوپیوں میں سے کوئی ٹوپی پہنتا ہو۔ بلکہ حکومت کے رُعب اور اثر کی وجہ سے بیشمار عیسائی ایسے ہیں جو تُرکی ٹوپی پہنتے ہیں۔ کوٹ عموماً لمبا پسند کیا جاتا ہے۔ اور بسا اوقات وُہ جس میں گلا کھُلا نہیں رہتا۔ یہ لباس دفاتر اور عدالتوں میں جانے اور کاروبار کی مصروفیت کے لئے ہے۔ اِس کے بعد جب شام

ایک تُرک خاتون

تُرکی بُرقعہ

ہوتی ہے اور لوگ کاروبار سے فارغ ہوتے ہیں تو عثمانی اپنے آرام دہ ایشیائی کپڑے پہن لیتے ہیں۔ جیسے دیکھو ایک لمبا سا چوغہ جو ٹخنوں تک پہنچتا ہے۔ پہنے ہوئے گھر آ ہی۔ چوغے مختلف رنگوں کے اور بہت خوشنما ہوتے ہیں۔ یہ گویا عثمانیوں کا رختِ خواب ہی۔ علیحدہ رختِ خواب رکھنے کی عادت انگریزوں اور دیگر اہلِ یورپ میں بھی موجود ہے۔ مگر عثمانیوں کی رسم میں اور انگریزی رسم میں فرق یہ ہے۔ کہ انگریز رختِ خواب پہن کر باہر نہیں نکل سکتے۔ اور عثمانی اپنے ڈھیلے چوغے پہنے ہوئے شام کے وقت بازار میں بھی نکل آتے ہیں۔ مسجد میں چلے جاتے ہیں اور بے تکلف دوستوں کے ہاں ملاقات کو بھی جا سکتے ہیں۔

اکثر گھروں میں عورتوں کا لباس یورپ کا لباس ہے۔ یہاں تک کہ اُمرا اور اہلِ دولت کے ہاں تو بیگمات کے کپڑے پیرس سے بنوائے جاتے ہیں۔ مگر اوپر سے اُن کا پردہ پوش بُرقعہ انہیں پھر ایشیائی بنا دیتا ہے۔ گو اب اُس بُرقعہ کی تراش خراش بھی ایسی ہو گئی ہے کہ اس کی قطع انگریزی گون کی سی نکلتی آتی ہے۔

مکانوں کی آرائش میں بھی دونوں رنگ پائے جاتے ہیں۔ ہر خوشحال عثمانی کے گھر میں اگر ایک آدھ کمرہ پُرانے طریق پر آراستہ ہے تو ایک آدھ نئی طرز کا ہے۔ پُرانی آرائش یہ ہے کہ دیواروں کے ساتھ ساتھ اُونچی گدیلے دار نشستیں ہیں۔ فرش پر اُمرا کے ہاں قالین بچھا ہے تو متوسطین کے ہاں نفیس بوریا۔ فرش کو عموماً پاک رکھتے ہیں کہ اُس پر نماز ہو سکے۔ اِس لئے وہاں جوتا پہنے ہوئے نہیں آتے۔ یا تو بوٹ کے اوپر موزے چڑھا لیتے ہیں یا وہ بُوٹ پہنتے ہیں۔ جس کے اُوپر ایک گرگابی سی چڑھی ہوتی ہے جو کمرہ میں داخل ہوتے وقت اُتار دی جاتی ہے۔ اور اس طرح اس کے اندر کا حصہ صاف

اور محفوظ رہتا ہے۔ اس لئے اس بوٹ کو پہنے ہوئے لوگ مسجد میں جاتے اور نماز پڑھتے ہیں

عثمانی خورونوش کے طریق میں بھی مشرقی اور مغربی رواج کی ملاوٹ نظر آتی ہے۔ کھانا اب عموماً میز پر چنا جاتا ہے۔ اور لوگ کرسیاں بچھا کر گرد بیٹھ جاتے ہیں۔ ایک۔ ایک صاف پلیٹ ہر شخص کے سامنے رکھی ہوتی ہے۔ اور میز کے وسط میں سب کھانے چُنے ہوتے ہیں۔ یورپ میں عام طور پر ایک ایک کھانا لانے اور نوبت بہ نوبت پیش کرنے کا دستور ہے۔ مگر یہاں چُن دینے کا طریق مشرقی اور کھانے کا طریق مغربی کر دیا گیا ہے۔ اکثر جگہ چھری کانٹا بھی میز پر دیکھنے میں آیا ہے۔ مگر بعض جگہ چمچے اور کانٹے صرف کھانا بڑی رکابیوں سے نکالنے کے لئے برتے جاتے ہیں اور کھانے والے ہاتھ سے کھاتے ہیں۔ کھانے میں ترکوں کی بعض چیزیں یورپ کے مذاق کے موافق ہیں۔ مثلاً اُبلا ہوا گوشت۔ اور بعض ایشیائی مذاق کے مطابق مثلاً ترکاری کا سالن۔ لیکن ہندوستان کا سا نمک مرچ مصالح وہاں اِستعمال نہیں کیا جاتا۔ دو چیزیں استانبول میں بہت شوق سے کھائی جاتی ہیں۔ ایک دہی جسے ترکی میں یُغرت کہتے ہیں۔ جو غالباً وہی لفظ ہے جو فارسی کتابوں میں جُغرات لکھا جاتا ہے۔ اور دُوسرے نمکین چاول۔ جن پر کھانے کا خاتمہ ہوتا ہے۔ ایک آدھ میٹھی چیز دسترخوان پر ضرور آتی ہے۔ اور سب کھانوں کے بعد میوے آتے ہیں۔ میووں میں انگور بہت کثرت سے ملتا ہے اور انگور کے موسم میں ہر کہ ومہ انگور کھاتا دکھائی دیتا ہے۔ امیر کے دسترخوان پر اگر کھانے کے بعد انگور تکلّف کے ساتھ عُمدہ پلیٹوں میں چُنا ہوا نظر آتا ہے تو غریب مزدُور کے ہاتھ میں بھی اُس کا ایک بڑا سا خوشہ نان و پنیر کے ساتھ موجود ہے۔

کھانا رسٹوراں میں کھانا اور وہیں تفریح یا آرام کے لئے بیٹھے رہنا یہ رواج بھی یورپ

سے آیا ہے۔ مگر جو رستوراں عثمانیوں کے ہاتھ میں ہیں۔ اُن میں غذا ایشیائی اور نشست کا انتظام یورپی ہے۔ میز کُرسی اور چھری کانٹا تو موجود ہے۔ مگر تشتری میں کباب سیخ اور کوفتے دھرے ہیں۔ اور منہ میٹھا کرنا ہو تو فیرینی حاضر ہے۔ ترکاری کا سالن بھی مل سکتا ہے۔ روٹی البتہ وُہی ملتی ہے جو یورپ بھر میں مروّج ہے۔ جسے نان پاؤ یا ڈبل روٹی کہتے ہیں۔ ایک بڑی سی روٹی کا ایک ٹکڑا کاٹ کر ہر شخص کے سامنے رکھ دیا جاتا ہے۔ جتنے رستوراں اس قسم کے ہیں جہاں عثمانی زیادہ جاتے ہیں۔ یا جو عثمانیوں کے ہاتھ میں ہیں۔ اُن میں کھانے سے پہلے ہاتھ دھونے اور کھانے کے بعد ہاتھ دھونے اور منہ صاف کرنے کا سامان موجود رہتا ہے۔ یہ طریق اسلامی ہے۔ کیونکہ یورپ میں اگر ہاتھ صاف ہوں تو کھانے سے پہلے انہیں دھونا ضروری نہیں سمجھا جاتا اور کھانے کے بعد ہاتھ دھونے یا منہ صاف کرنے کا تو رواج یورپ میں بہت ہی کم ہے۔ نہایت پُرتکلّف موقعوں پر کھانے کے بعد بلوری پیالوں میں تھوڑا تھوڑا پانی کھانے کے اختتام پر حاضرین کے سامنے رکھا جاتا ہے۔ اِس میں ذرا انگلیاں ڈبو لیتے ہیں۔ کیونکہ وہاں سب چھری کانٹے سے کھاتے ہیں اور اِس لئے انہیں ہاتھ دھونے نہیں پڑتے۔

عثمانیوں کی ایک خوبی قابلِ داد ہے۔ کہ بعض بے ضرر باتوں میں فرنگستان کی تقلید کرنے اور دن رات یوُرپ کی عیسائی اقوام سے ملنے کے باوجود اُنہوں نے آج تک بحیثیتِ قومی شراب سے پرہیز قائم رکھنے میں اپنے اسلام کی پختگی کا ثبوت دیا ہے۔ یوُرپ بھر کے بڑے بڑے شہروں میں سے شراب کی فروخت سب سے کم اِستانبول میں ہے اور جو بکتی ہے اُس کے بھی صَرف کرنے والے بیشتر ملک کے عیسائی باشندے یا

غیر ملکی عیسائی ہیں جو استانبول میں کاروبار یا مُلازمت کے سلسلے میں مقیم ہیں۔ تُرکوں میں بھی کچھ لوگ خصوصاً مغربی تعلیم پائے ہُوئے یا طبقہ اُمرا میں ایسے ہیں جو شراب پیتے ہیں۔ مگر اُن کو یہ مجال نہیں کہ وُہ علانیہ شراب پئیں۔ جو کوئی پیتا ہے چوری چھپے پیتا ہے۔ شہر میں بالعموم اور خاصکر اس حصّے میں جہاں مسلمان آباد ہیں۔ شراب بکتی ہی نہیں۔ ہوٹل والوں کے پاس البتّہ موجُود رہتی ہے۔ تاکہ وُہ اپنے اُن گاہکوں کو جو کھانے کے ساتھ شراب کے استعمال کے عادی ہوں۔ وقت پر مہیّا کر دیں۔ یورپ بھر میں شراب کے استعمال کی کثرت ایک ایسی وبا ہے۔ جس کا زہریلا اثر وہاں کے دُور اندیش عرصے سے محسوس کر رہے ہیں اور اپنی قوموں کے مستقبل سے ہر وقت خائف رہتے ہیں۔ کہ اگر اس بلا کا یہی زور رہا تو یہ ضرور روزِ بد دکھائیگی۔ عثمانیوں کو یہ شعارِ اسلامی نباہنے سے کئی قسم کے فائدے ہُوئے ہیں۔ جن میں سے ایک فائدہ یہ ہے کہ اُن کی سپاہ صُوفی سپاہ ہے اور اُن کے عسکریوں کی بہادری شراب سے جوش میں لائے جانے کی محتاج نہیں۔ اور اس پر ایسی ہے۔ کہ پینے والے بہادروں کے نشے اُتار دیتی ہے۔

جہاں شراب سے عثمانیوں نے پرہیز کی ہے۔ وہیں تمباکو کے استعمال میں دیگر اقوام بلکہ یورپ کو بھی مات کر دیا ہے۔ تمباکو کا استعمال یُوں تو دُنیا بھر میں عام ہے اور مشکل سے کوئی چیز خیال میں آسکتی ہے جو اس قدر ہر دلعزیز ہو۔ لیکن یورپ میں اس کا رواج بہ حیثیتِ مجموعی ایشیا سے زیادہ ہے۔ باوجُود اس کے کہ وہاں ہر ملک میں تمباکو پر بہت بھاری محصُول کا بوجھ ہے اور اس لئے بہت گراں بکتا ہے پھر بھی غریب امیر سب اس کے دلدادہ ہیں۔ اور غربا اپنی محدود آمدنیوں کا ایک

معقول حصّہ سگرٹ اور تمباکو پر صرف کر دیتے ہیں۔ ٹرکی میں تمباکو دیگر ممالک یورپ سے نفیس تر بنتا ہے اور ٹرکی کے تمباکو کی یورپ بھر میں دھوم ہے۔ مگر باوجود اس شہرت کے اتنا باہر نہیں جاتا۔ جتنا ملک کے اندر خرچ ہوتا ہے۔ کیونکہ ملک میں ہر شخص اس کا فدائی ہے۔ ہمارے ہاں ہندوستان میں علمائے دین اور دیگر مقدّس لوگ بالعموم تمباکو سے پرہیز کرتے ہیں۔ برخلاف اس کے ٹرکی میں بڑے بڑے علما بھی اس شوق سے خالی نہیں۔ خود سگرٹ پیتے اور مہمانوں کو پلاتے ہیں۔ اور بہت ہی شاذ ہی کوئی شخص اس کی عادت نہ رکھتا ہو۔ سگرٹ کو ٹرکی میں جگارہ کہتے ہیں۔ لفظ سگار کی صورت بدل کر اس کی تصغیر بنالی ہے۔ اور جہاں جاؤ۔ جگارہ پہلے لاکر سامنے رکھدیا جاتا ہے۔ مجھے جب کبھی عذر کرنے کا اتّفاق ہوا تو میرے عثمانی میزبان عموماً نہایت ہی تعجب سے پوچھتے تھے: "کیا تمہارے ہاں لوگ جگارہ نہیں پیتے"؟ میں کہتا تھا۔ "ہمارے ہاں بھی بہت اس کے شائق ہیں۔ مگر آپ سے کم۔ اور میں اُن لوگوں میں ہوں۔ جنہوں نے نئی تہذیب کا یہ تمغہ نہیں حاصل کیا"۔ زیادہ قابلِ افسوس بات یہ ہے کہ عثمانی خواتین میں بھی جگارہ کا رواج بہت ہے۔ اہل یورپ کسی ترک خاتون کی جب کبھی تصویر دکھاتے ہیں۔ خواہ کہانیوں میں۔ خواہ سٹیج پر۔ اور خواہ تصویرخانوں کی دیوار پر۔ ہمیشہ اس کے ہاتھ میں جگارہ ہوتا ہے جس سے دھوآں نکل رہا ہوتا ہے۔ ممکن ہے وہ اس میں کچھ مبالغہ کرتے ہوں۔ لیکن خود عثمانیوں نے یہ شکایت مجھ سے کی۔ کہ مستورات میں یہ عادت بہت بڑھ گئی ہے۔ یورپ کے دوسرے ممالک میں بھی بعض عورتیں کبھی کبھی سگرٹ کا شوق کرتی ہیں۔ مگر سوائے بعض بیباک عورتوں کے علانیہ سگرٹ پینا لیڈیوں کے لئے عیب سمجھا جاتا ہے۔ اور سب خواتین مردوں سے کم

روبرو سگرٹ پینے سے رُکتی ہیں - اور مرد یہ احتیاط کرتے ہیں کہ جہاں خواتین جمع ہوں - وہاں اوّل تو سگرٹ پیتے نہیں اور پئیں تو اُن سے معافی اور اجازت مانگتے ہیں -

قہوہ کا استعمال عثمانیوں کے ہاں شاید سگرٹ سے بھی زیادہ بڑھا ہوا ہے - اور قہوہ گو بجائے خود ایسی بُری چیز نہیں - تاہم حد سے زیادہ کوئی چیز بھی اچھّی نہیں ہوتی اور عثمانی قہوہ پینے میں بسا اوقات حد سے گذر جاتے ہیں - قہوہ یورپ میں انکی بدولت مقبول ہوا ہے - اور ٹرکی قہوہ شہرۂ آفاق ہے - لندن کے بڑے بڑے ہوٹلوں میں کھانوں کی فہرستوں یا اشتہارات پر جلی حروف میں "ٹرکش کافی" لکھا ہوتا ہے اور پیرس میں شوق اس کا اور بھی زیادہ ہے - مگر وہاں اکثر لوگ دُودھ ملا کر کافی پیتے ہیں - حالانکہ ترکوں میں بے شیر پینے کا زیادہ رواج ہے - بلکہ بہت جگہ تو شکّر بھی نہیں ڈالتے - تلخ ہی پسند کرتے ہیں - ٹرکی میں جو پیالیاں قہوہ کے لئے مخصوص ہیں - وُہ گو چھوٹی چھوٹی ہوتی ہیں - تاہم لوگوں کے ہاں مُلاقات کو آنے جانے والے صبح سے شام تک تین چالیس پی جاتے ہیں - عادت عجب چیز ہے - اُنہیں کوئی فوری نقصان نہیں ہوتا - ورنہ جسے عادت نہ ہو - اسے تین چار دفعہ قہوہ پینے سے نیند آنے میں دشواری محسوس ہونے لگتی ہے -

اِستانبول میں رہ کر قہوہ سے قطعی پرہیز مُشکل ہے - جب کوئی کسی سے ملنے جائے تو سب سے پہلی تواضع یہ سمجھی جاتی ہے - صاحب خانہ ابھی حرم سے نہ بھی برآمد ہُوئے ہوں تو سلیقہ شعار ملازم خود ہی قہوہ لیکر آ موجود ہوتے ہیں - فرض کیجئے - کسی نے ابھی ایک پیالی ختم کی - اتنے میں صاحبِ خانہ برآمد ہُوئے - وُہ آتے ہی سلام اور مزاج پرسی

کے بعد قہوہ منگوائینگے اور دوبارہ پیش کرینگے۔ اب اِنکار بھی کرو تو وُہ اصرار کرتے
ہیں اور پلا دیتے ہیں۔ اور کہتے ہیں "پی بھی لیجئے۔ ایک ذرا سے قہوہ سے کیا ہوتا
ہے"۔ اگر آپ کے رخصت ہونے سے پہلے اُن کا ایک آدھ مُلاقاتی اَور آگیا تو از سرِ نو
قہوہ کا دَور چلتا ہے۔ غرض قہوہ اور جِغارہ۔ نوبت بہ نوبت پیش ہوتے رہتے ہیں۔
کوئی گھر میں ہو یا دفتر میں۔ دوست کے مکان پر ہو یا رِسٹوراں میں۔ بعض پُرانی وضع
کے لوگ رسٹوراں میں جاکر نارگیلہ کا بھی شوق کرتے ہیں۔ یہ ہمارے پیچوان کی سی چیز
ہے۔ صرف اِتنا فرق ہے کہ حقّہ تانبے یا پیتل کے بجائے بلّور کا ہوتا ہے۔ اور
اِس میں صاف پانی ہر وقت بدلا جاتا ہے۔ اور جب کوئی شخص پیچوان کو مُنہہ لگاتا ہے تو
بلوری حُقّے میں پانی کے بُلبُلے عجب بہار دیتے ہیں۔

اخلاق و آداب میں عثمانی اب تک اپنے ایشیائی بزرگوں کے پَیرو ہیں۔ بلکہ
اُنہوں نے پُرانے آداب کی سادگی میں بہت کچھ تکلّف پیدا کر دیا ہے۔ ہندوستان میں
لکھنؤ تکلّف کے لئے مشہور ہے۔ اور حیدرآباد کا تکلّف بھی کچھ کم نہیں۔ مگر استانبول
میں جو تکلّف آدابِ صُحبت میں ملحُوظ ہے۔ وُہ اِن دونوں سے بڑھ کر ہے۔ فرض کیجئے
آپ ایک ایسے شخص کے ہاں جاتے ہیں جو عمر میں یا علم میں یا رُتبہ میں آپ سے بڑا ہے
آپ کمرہ میں داخل ہوتے ہی جُھک کر سلام کرتے ہیں۔ اور اُس کے ہاتھوں یا دامن
کی طرف بڑھتے ہیں۔ کہ ہاتھ یا دامن کو ادب سے بوسہ دیں۔ وُہ اپنا خُلق یُوں ظاہر
کرتا ہے کہ اپنے ہاتھ یا دامن کو کھینچ لیتا ہے اور کہتا ہے "استغفراللہ" یعنے
آپ مجھے کیوں محجوب کرتے ہیں۔ مَیں اس قابل نہیں کہ آپ میرے دامن کو بوسہ دیں۔
اور آپ سے مصافحہ کرتا ہے۔ اس کے بعد آپ کُرسی یا دیوان پر بیٹھ جاتے ہیں۔

اب صاحبِ خانہ اپنی کُرسی سے اُٹھ کر یا جُھک کر سلام کو ہاتھ اُٹھاتا ہے اور خیر مقدم کہتا ہے آپ پھر اسی سلام کے شکریہ میں سلام کرتے ہیں۔ اگر مجلس میں اَور کچھ معزّزین حاضر ہیں تو اب آپ اُن کو سلام کرتے ہیں اور وُہ آپ کو۔ اِس لمبی رسم کے ادا ہو چکنے پر قہوہ اور جگارہ کی باری آتی ہے اور پھر کہیں کوئی مطلب کی بات شروع ہوتی ہے۔ اسمیں شک نہیں کہ یہ رسُوم پُرلُطف ہیں۔ مگر وقت کا بیحد خون کرتی ہیں۔ اور زمانہ اُن میں تھوڑی بہت ترمیم ضرور کر دیگا۔ گو اب تک ان کے قدر دان کثرت سے موجُود ہیں۔ جو کوئی استانبول دیکھنے آتا ہے۔ اگر اُسے عثمانیوں سے ملنے جُلنے اور اُن میں بیٹھنے اُٹھنے کا موقعہ ہوتا ہے تو وُہ اُن کے اخلاق کا ثنا خواں جاتا ہے۔

عثمانی عورتوں کی حالت بھی وُہی دونوں تمدنوں کے بَین بَین ہے۔ اُن کا لباس یورپی ہے۔ اور تعلیم بھی بہت کچھ یورپی۔ مگر جن مکانوں میں وُہ رہتی ہیں وُہ ایشیائی مکانوں میں پردہ کا پُورا انتظام ہے۔ سب دریچوں میں لکڑی کے پنجرے لگے ہوتے ہیں۔ اور مسلمان کا مکان فوراً اس نشان سے پہچانا جاتا ہے۔ مستورات میں سیر کے لئے نکلنے۔ ریل اور جہاز میں مُستعدانہ سوار ہونے کی عادت مغربی ہے۔ تو قبُور کی زیارت۔ فقرا سے عقیدت مشرقی۔ شادی بیاہ میں ہندوستانی خواتین کے مقابلے میں انہیں ایک سانی ہے کہ اُن کے ہاں حلقۂ انتخاب وسیع تر ہے۔ لیکن یہ شرط کہ شادی کے معاملے میں وُہ اپنے والدین کے انتخاب کی پابند ہیں انہیں اپنی ہندوستانی بہنوں سے مساوات کا درجہ دیتی ہے۔ شادی بیاہ کی رسُوم تُرکوں میں ایسی پیچیدہ اور ایسی مُسرفانہ نہیں۔ جیسی ہندوستانی مسلمانوں کے طبقۂ اُمرا اور شُرفا میں رواج پاگئی ہیں۔ اور اب شادی کے موقعے پر کوئی بڑا مجمع کرنے یا بڑی بڑی دعوتیں دینے کا بھی دستور

نہیں رہا۔ کیونکہ ایک عرصہ سے استانبول میں بعض پولٹیکل وجوہات سے قریب قریب ہر قسم
کے مجموں کی بندش ہے۔ اور اسی سلسلے میں بڑی براتوں پر بھی قلمِ اختصار چل گیا ہے۔
اس حکم نے ترکوں کی مجالس کے لطف میں تو کمی کر دی ہے۔ مگر اس کے ساتھ اسراف
کا راستہ بھی بہت کچھ مسدود ہو گیا ہے۔

گانے بجانے اور موسیقی کا شوق ہر قوم میں کم و بیش پایا جاتا ہے۔ اور ترک کچھ
اس سے مستثنےٰ نہیں۔ مگر رقص و سرود کی مجلسیں اُن کے ہاں عام نہیں۔ البتہ اُنہوں نے
یورپ سے موسیقی کی باقاعدہ تعلیم کا دستور اخذ کر لیا ہے۔ اور اسے لڑکیوں کے مدارس میں مضامینِ درس
میں شامل کیا ہے۔ چنانچہ اکثر تعلیم یافتہ لڑکیاں اس سے واقف ہیں اور اپنے گھروں میں گاتی بجاتی
ہیں کہیں کہیں لڑکے بھی موسیقی سیکھتے ہیں۔ مگر وہ بیشتر فوجی مُلازمت کے لئے سیکھتے ہیں
اور فوجی بینڈ میں بھرتی ہو جاتے ہیں۔ ترکوں نے موسیقی کی کتابیں اپنی زبان میں یورپ کے نمونے
پر تیار کی ہیں۔ اور بینڈ میں ہر بجانے والے کے آگے موسیقی کے اشارات کی ایک کتاب رہتی ہے۔
جسے دیکھ دیکھ کر اپنے سرگروہ کی اُنگلی یا چھڑی کے اشاروں پر وُہ چلتا ہے۔ ترکوں کی ان
کتابوں سے فارسی یا اُردو میں اشاراتِ موسیقی بنانے میں بہت مدد مل سکتی ہے۔ کیونکہ ان
تینوں زبانوں کے حروف وُہی ہیں۔

شہر کے قریب سیر و تفریح کے لئے نکلنا بھی عثمانیوں کے ہاں بکثرت مروّج ہے۔ مگر پھر بھی
اس شغف کو نہیں پہنچ سکتا جو یورپ کے دیگر مقامات کے لوگ رکھتے ہیں۔ وُہ تو دیوانہ وار
تعطیل کے منتظر رہتے ہیں۔ اور جب موقعہ ملتا ہے تو لاکھوں گھروں سے باہر تفریح کے لئے نکل پڑتے
ہیں۔ شہر سے باہر اپنے ملک میں سیاحت کے لئے جانا یا ممالکِ غیر میں سیاحت کو نکلنا
آج کل عثمانیوں میں نایاب ہے۔ اور یہ کچھ اُن کی مُردہ دلی کی وجہ سے نہیں۔ بلکہ اس لئے کہ

حکومت کی طرف سے نقل وحرکت کے متعلق سخت روک تھام ہے۔ مُلک کے اندر ایک شہر سے دُوسرے شہر تک جانے کے لئے رعایائے عثمانی کو بھی تذکرہ یعنی پروانہ راہداری حاصل کرنا پڑتا ہے اسی وجہ سے مُلک سے باہر جانے کے لئے تو اَور بھی زیادہ باز پرس ہوتی ہے۔ پس اب یہ لوگ دُکان خانہ میں بیٹھے ہیں اور اِسی سے اِن کی ترقی بہت کچھ رُکی ہُوئی ہے۔

تجارت اور صنعت کی طرف گو عام میلان نہیں ہے اور اکثر ملازمت سرکاری کو ہی ذریعۂ عزّت و دولت سمجھا جاتا ہے۔ لیکن پھر بھی یہاں کے لوگوں میں تجارت اور صنعت کو اُس حقارت کی نظر سے نہیں دیکھتے۔ جس کے سبب ہندوستان کی بعض جماعتیں مفلس اور تباہ ہوتی جاتی ہیں مگر تجارت اور صنعت کی طرف رجوع نہیں کرتیں۔ استانبول میں معمولی دوکاندار کو بھی لوگ عزّت سے بُلاتے ہیں اور وُہ اپنے آپ کو عزّت کا مستحق سمجھتا ہے۔ بہت سی دوکانوں پر خوشخط قطعے لٹک رہے ہیں جن پر اَلکَاسِبُ حَبِیْبُ اللّٰہِ لکھا ہوا ہے۔ یعنی جو شخص کسی جائز پیشے سے روزی کماتا ہے خُدا اسے دوست رکھتا ہے۔

مذہبی فرائض کی پابندی تُرکوں میں اکثر اور ممالکِ اسلامی سے زیادہ ہے۔ خود لوگوں کو بھی خیال ہے اور سلطنت کی تائید بھی شامل ہو۔ جمعہ کی نماز بڑی دھوم دھام سے ہوتی ہے۔ اور شہر بھر کی جامع مسجدیں اس دن بھری ہوتی ہیں۔ رمضان میں مسجدوں کی رونق اور سجاوٹ کہتے ہیں نہایت ہی قابلِ دید ہوتی ہے اور افطاریوں کے جلسے نہایت پُرلطف۔ بڑی بات یہ ہے کہ نئی روشنی کے لوگ۔ فرانسیسی تربیت پائے ہُوئے عثمانی بھی ان فرائض سے غافل نہیں۔ نماز روزہ کے علاوہ وِرد

وظیفہ کا یہاں بہت شوق ہے۔ اور پیر و جوان جسے دیکھو ہاتھ میں تسبیح لئے پھرتا ہے۔ یہاں تک کہ تسبیح ایک قسم کا فیشن ہوگئی ہے۔ اور کئی نمود کے طالب ایک خوبصورت قیمتی تسبیح ہاتھ میں رکھنا ضروری سمجھتے ہیں۔ اور اس عادت میں استانبول کے بہت سے عیسائی ان کے شریکِ حال ہیں ؛

عیسائیوں سے تعلقات

ترکوں اور عیسائیوں کے تعلّقات باہمی خصوصیّت سے قابلِ ذکر ہیں۔ اور ترکوں کی موجودہ طرزِ معاشرت پر ان تعلّقات نے گہرا اثر ڈالا ہے۔ ٹرکی میں دو قسم کے عیسائی نظر آتے ہیں۔ ایک مُلکی ایک غیر مُلکی۔ مُلکی عیسائیوں کا طریقِ بود و باش اور بہت سی اور باتیں اپنے مُسلمان ہمسائیوں سے ملتی ہیں۔ اوّل تو سب ترکی زبان بے تکلّف بولتے ہیں اور گفتگو میں خالص اسلامی الفاظ بکثرت استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً انشاء اللہ۔ ماشاء اللہ۔ استغفر اللہ۔ اُن کے کھانے پینے میں بھی وہی ترکی مذاق موجود ہے۔ سالن بھی ترکی طریق پر پکاتے ہیں۔ دُودھ۔ دہی۔ فیرینی۔ وغیرہ اِن سب چیزوں کے اپنے تُرک ہمسائیوں کی طرح شایق ہیں۔ تُرکی مٹھائی جو یورپ میں "ٹرکش ڈیلائیٹ" یعنی "فرحتِ تُرکی" کے نام سے مشہور ہے۔ تُرکوں اور عیسائیوں دونوں میں مقبول ہے۔ رستوراں میں اگر دو چار تُرک نارگیلہ پیتے نظر آتے ہیں۔ تو دو چار عیسائی بھی اس کا شوق کر رہے ہیں ایسے رستوراں وہاں بکثرت ہیں۔ جن کے مالک اور مہتمم عیسائی ہیں۔ مگر مُسلمان اُن میں کھانا کھاتے ہیں اور عیسائی بھی وہیں آتے اور اُنہی میزوں پر اُنہی برتنوں میں کھانا کھاتے ہیں۔ عیسائی دوکاندار اپنے مُسلمان گاہکوں کی خاطر سے لحمُ الخنزیر سے اور غیر مذبوح گوشت سے پرہیز کرتے ہیں اور اُسے اپنی دوکان میں نہیں رکھتے اور اس لئے عیسائی اور مُسلمان دونوں کسی ہچکچاہٹ کے بغیر اِن مقامات میں ملتے جُلتے ہیں۔ اس کے علاوہ تفریحی مشغلے بیشتر مشترک ہیں۔ ناٹک وغیرہ کے تماشے عیسائیوں کے ہاتھ میں ہیں

مگر وہ کھیل ترکی میں کرتے ہیں اور تماشائیوں میں مسلمان شامل ہوتے ہیں اور عیسائی بھی۔ تماشے میں پارٹ کرنے والی عورتیں سب عیسائی ہوتی ہیں۔ کوئی مسلمان عورت پارٹ نہیں کرتی مگر یہ عیسائی عورتیں زنانہ دانی میں ترکی عورتوں کی مدِ مقابل ہوتی ہیں اور عثمانی مستورات کی زندگی کی تصویر خوب اُتار سکتی ہیں۔

غیر ملکی عیسائی بھی ٹرکی کے دارالخلافہ میں بکثرت رہتے ہیں۔ کچھ تجارتی ضرورتوں سے۔ کچھ تعلیمی اور مذہبی کاموں کے لئے اور کچھ سیاسی معاملات کے متعلق۔ ان کی عادات میں اور ترکوں کی عادات میں بہت سا فرق ہے۔ مگر ان عیسائیوں کے ساتھ بھی استانبول میں عثمانیوں کی خاصی نبھتی ہے۔ تالی ہمیشہ دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔ اور یہاں یہ دیکھا جاتا ہے کہ ترک اور عیسائی دونوں اس کوشش میں رہتے ہیں کہ باہمی میل جول بآسانی جاری رہے۔ ایک طرف تو ترکوں نے ان لوگوں کو بہت سی رعائتیں دے رکھی ہیں۔ اور دوسری طرف یہ لوگ بھی کسی قدر اپنا مزاج یہاں آکر بدل لیتے ہیں۔ فرانسیسی طبیعت تو سیال ہی ہے۔ ہر سانچے میں ڈھل جاتی ہے۔ مگر لطف یہ ہے کہ جرمن اور انگریز بھی استانبول میں ذرا نرم ہو جاتے ہیں۔ انگریزوں کی نسبت یورپ میں ایک مثل مشہور ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ ان کی اکڑ کی یہ حالت ہے۔ کہ جہاں ان کی حکومت نہ بھی ہو وہاں بھی یوں اکڑ کے چلتے ہیں جیسے ساری دنیا ان کے زیرِ نگین ہے۔ مگر میں نے دیکھا کہ استانبول میں یہ کیفیت نہیں۔ بازاروں اور سڑکوں پر چلنے پھرنے میں جو مساوات حاکم و محکوم۔ مسافر و مقیم میں یورپ کے بڑے شہروں میں نظر آتی ہے۔ وہی نظارہ استانبول کے بازاروں۔ گلی کوچوں اور پلوں پر نظر آتا ہے۔ غریب امیر۔ مسلمان۔ عیسائی۔ یہودی اور گبر سب ایک دوسرے کے ساتھ چل رہے ہیں۔

اور کوئی دُوسرے سے تعرّض نہیں کرتا۔ انگریز۔ جرمن اور فرانسیسی وہاں یہ توقع نہیں رکھتے
کہ کوئی اُن کے لیئے راستہ چھوڑے اور نہ کسی کو نا ملائم الفاظ سے مخاطب کرتے ہیں۔ اور
تُرک بھی اُن پر کسی قسم کا تحکّم نہیں کرتے۔ اور یہ دستور ترکوں میں کچھ اب سے نہیں۔ کہ کوئی
سمجھے۔ کہ تُرک سیاسی کمزوری سے نرم ہو گئے۔ بلکہ اس بارے میں وُہ ہمیشہ معقول اور آزاد
خیال رہے ہیں۔ اور اپنے اقتدار کے زمانے میں اُنہوں نے بڑی بڑی رعائتیں عیسائیوں
سے کی ہیں۔

مُلکی عیسائیوں سے جو رعائتیں تُرکوں نے کی ہیں۔ اُن میں سب سے اوّل مذہبی آزادی
ہے۔ اور وُہ بھی ایسے وقت میں جب دُنیا میں بہت کم ایسے حصّے تھے جہاں یہ خیال
موجُود تھا۔ ارمنی اور یونانی دونو گرجے اُس زمانے سے آج تک بالکل آزاد اور اپنے
اندرونی انتظام میں خود مختار چلے آتے ہیں اور اُن کے باہمی تنازعات جب ناگوار
صُورت اختیار کرنے لگتے ہیں تو اُس وقت تُرکوں کا زبردست ہاتھ اُن کے درمیان
آکر بیچ بچاؤ کرتا اور انہیں خونریزی سے روکتا ہے۔ ان دونوں فریقوں کے بڑے
بڑے قسّیس اور رہنما ابتک انعامات۔ تمغے اور جاگیریں پاتے ہیں۔ دُوسری رعایت
جو اُن کے ساتھ کی گئی یہ تھی کہ صیغۂ فوج کے سوا باقی سب صیغوں میں انہیں ترکوں
کے برابر حقوق دیئے گئے۔ جس کا نتیجہ ہے کہ اس وقت بہت سے مناصبِ جلیلہ
پر عیسائی ممتاز ہیں۔ ٹرکی کے سفیر اور قونصل بہت سے عیسائی ہیں اور بڑی بڑی
تنخواہیں پاتے ہیں۔ اور اُن پر اسی طرح اعتبار اور اعتماد کیا جاتا ہے۔ جیسے کسی تُرک پر
کیا جاتا۔ علوم و فنون کے مکاتب میں اور تمام اُن خیراتی کارخانوں میں جو سلطنت کی
طرف سے قائم ہیں۔ عیسائیوں کے حقوق کا پُورا لحاظ رکھا گیا ہے۔ کئی باتوں میں عیسائی

بمقابلہ تُرکوں کے آرام میں ہیں۔ اور اُن کے امُور میں اِس قسم کی مداخلت نہیں ہوتی جیسے
تُرکوں کے مُعاملات ہیں۔ مثال کے طور پر تعلیم کو لیجئے۔ تُرکوں کی تعلیم مکاتب سرکاری میں
اُن قواعد کی پابندی سے ہوتی ہے۔ جو اس بارے میں نافذ ہیں۔ اور اُن کے لئے
چند قیود موجُود ہیں۔ کہ فلاں علوم پڑھیں اور فلاں علوم نہ پڑھیں۔ خاصکر سب ایسی
کتابیں اور مضامین جن سے لوگوں کے مذہبی۔ تمدّنی یا سیاسی خیالات میں آزادی
پیدا ہونے کا اندیشہ ہو۔ نصاب درسی سے خارج ہیں۔ برعکس اس کے عیسائیوں کے
مدرسے میں کوئی اس قسم کی قید نہیں لگائی گئی۔ چنانچہ متعدّد مدارس عیسائی بچّوں کے
لئے استانبول میں ہیں۔ جہاں ہر قسم کی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں۔ اِس حکمتِ عملی کی
وجہ کچھ ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ اور اس کا نتیجہ ملک کے حق میں بظاہر مضر ہو رہا ہے۔
ایک طرف عیسائی رعایا کی آیندہ نسل نہایت آزادانہ خیالات کی تعلیم حاصل کر رہی ہے اور
دُوسری طرف تُرکوں کی فطرتی آزادی بھی مٹائی جا رہی ہے۔ اُن تعلیم گاہوں میں
جو عیسائیوں نے ملک کے عیسائی بچّوں کے لئے قائم کی ہیں۔ سب سے بڑی تعلیم گاہ
رابرٹ کالج ہے۔ اور یہ کالج کئی وجوہ سے ایک خاص اہمیّت رکھتا ہے۔ جس پہاڑی
پر سُلطان محمد فاتح کی مشہور یادگار رُوم ایلی حصار کے کھنڈر ہیں۔ اُس پہاڑی کی چوٹی
پر قلعہ سے ذرا اوپر اس کالج کی رفیع عمارت اور اس کے ساتھ ایک وسیع میدان ہے۔
امریکا کے ایک دولتمند رابرٹ نامی کی فیاضی سے یہ کالج قائم ہُوا ہے۔ اور اس کا منشا
ممالکِ عثمانی کے عیسائی نوجوانوں کی تعلیم ہے۔ اِس کے ساتھ ایک عالیشان بورڈنگ
ہوس بنا ہے۔ اور اس میں قریب چار سو طالب علم رہتے ہیں۔ جن میں بہت سے
رعایائے عثمانی ہیں اور کچھ طالب علم گرد و نواح کی ریاستوں سے بھی آئے ہُوئے ہیں۔

یہ سب انگریزی پڑھتے ہیں اور دیگر السنۂ یورپ بھی حسبِ پسند سیکھتے ہیں۔ علوم و فنونِ جدیدہ میں اکثر کا درس یہاں دیا جاتا ہے۔ مگر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہ طلبہ سیاسی جنگ کے لئے تیار کیے جاتے ہیں۔ مَیں نے اس کالج کا کُتب خانہ دیکھا۔ اس میں دُنیا بھر کا رولیوشنری لٹریچر ہے۔ یعنی وُہ کتابیں جو مختلف ممالک کے حصُولِ آزادی کی داستانیں بیان کرتی ہیں اور یہ سکھاتی ہیں کہ فلاں زبردست سلطنت کس طرح اکھیڑ کر پھینک دی گئی۔ اور اس کالج کے طلبہ عمومًا اپنا مقصدِ زندگی یہ سمجھتے ہیں کہ تحصیلِ علم سے فارغ ہو کر وُہ اپنی ہمّت عیسائی اقوامِ شرق کو مطلق العنان کرنے میں صَرف کرینگے اور اس کالج والے علانیہ یہ دعوی کرتے ہیں کہ بلغاریوں کو جن لوگوں کی ہمّت سے آزادی حاصل ہُوئی ہے۔ وُہ یہیں کے تعلیم یافتہ تھے اور اب جو نئے لوگ پیدا ہونگے وُہ باقی ماندہ اقوام کو تُرکوں کی حکومت سے نکالینگے۔ یہ کالج کوئی چالیس سال سے جاری ہے۔ جب یہ قائم ہُوا۔ اُس وقت فرمانِ سُلطانی سے اس کے بنانے کی اجازت دیگئی تھی اور اس کے زمین عطا ہُوئی تھی۔ اس بے تعصّبانہ روش کا اب یہ انعام مل رہا ہے کہ اِس کالج کی تعلیم کا خاص منشا عثمانیوں کی مخالفت ہے۔ مگر حکومت عثمانیوں کی طرف سے عیسائیوں کے حق میں نرمی کا برتاؤ برابر جاری ہے۔

عثمانیوں کی عام حالت

اب عثمانیوں کی عام حالت پر ہم ایک مجموعی نظر ڈالنا چاہتے ہیں جس سے اندازہ ہو سکے کہ بہ حیثیت ایک حکمران قوم کے اُنکے دُنیا میں باقی رہنے کی اُمّید کیجا سکتی ہی یا نہیں ہم دیکھ چُکے ہیں کہ اُن کی موجُودہ تعلیمی حالت اگر بہت عُمدہ نہیں تو چنداں بُری بھی نہیں۔ تعلیم گو بڑے اعلیٰ اور وسیع پیمانے پر نہو۔ مگر ایک عرصے سے مُلک کے ہر حصّے میں جاری ہے اور علم کے ہر صنف کا درس قلمرو سُلطانی میں موجُود ہے۔ دینیات کی تعلیم سے بہت لوگ بہرہ ور ہو رہے ہیں۔ تعلیم جدید اور تعلیم السنۂ غیر بھی خاصی اچھّی حالت میں ہیں۔ طبِّ جدید میں عثمانی بہت معقول ترقی کر رہے ہیں۔ صنعت و حرفت کی تعلیم بھی کئی جگہ ہوتی ہے۔ فنونِ لطیفہ کی طرف بھی توجّہ ہے۔ صیغۂ حربیہ کی تعلیم بہت مکمّل ہی اور صیغۂ بحریہ کا بھی ایک کالج موجُود ہے۔ اور ان سب باتوں کا مجموعی نتیجہ یہ ہی کہ تُرک کچھ نہ کچھ ترقی کر رہے ہیں۔ ہر چند کہ اس ترقی کی رفتار بہت سُست ہی اور وُہ ترقی کی دوڑ میں اپنی ہمسایہ اقوام کے ہم قدم نہیں ہیں۔ لیکن اس سُستی پر ہم تُرکوں کو موردِ الزام قرار نہیں دے سکتے۔ جو طرزِ حکومت اُنکے ہاں مروّج ہے۔ اس میں ترقی کی رفتار کا تیز ہونا غیر ممکن ہے۔ نہایت سخت قواعد سے اُن کا بند بند جکڑا ہوا ہے۔ استانبول میں سوائے مذہبی مجالس کے کوئی جلسے تعلیمی۔ تمدّنی یا سیاسی ترقّی کی کوشش کے لئے نہیں ہوتے اور نہیں ہو سکتے۔ قومی انجمنوں کا وجُود ناپیدا ہے۔ یہاں تک کہ محض تجارتی اغراض کے لئے بھی کوئی بڑی کمپنی قائم کرنے کی اجازت ملنی مشکل ہے اور ممکن نہیں کہ حکومت اسے

شُبہ کی نگاہ سے نہ دیکھے۔ ایسی صورت میں اگر عثمانیوں کی ترقی محدود ہو اور وُہ دیگر اقوامِ [illegible]
یورپ کے مقابلے میں کمزور ہوں تو مقامِ تعجب نہیں۔ اِس میں شک نہیں کہ حکومت بھی [illegible]
در چند معذوریاں رکھتی ہے۔ جن میں متفرق طبقات رعایا کے باہمی عناد و اختلاف کی [illegible] اور اب مدت
سب سے بڑھ کر ہے۔ جو دقتیں مختلف اقوام پر حکومت کرنے کے متعلق ہندوستان میں [illegible] تجارت کی طرف
حکومت برطانیہ کو پیش آتی ہیں۔ اُن سے کہیں زیادہ تکالیف کا سامنا حکومتِ عثمانیہ [illegible] یا اغیار کے
کرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ دُنیا بھر میں شاید کسی اَور مُلک میں اتنے اضداد کا مجموعہ یکجا نہیں [illegible] جو ترک [illegible]
اور طُرّہ یہ کہ وہاں کی یہ متضاد جماعتیں ہندوستان کی رعایا کی طرح بے سلاح نہیں بلکہ [illegible] کی
کے ساتھ پُشتوں سے جنگجوئی کی خوگر ہیں۔ بات بات میں فساد ہوتا ہے اور ذرا سے فتنے [illegible]
تیغ و خنجر نکلتے ہیں۔ ایسی رعایا کو قابو میں کرنے اور مُلک میں امن قائم رکھنے کے لئے [illegible]
آہنیں درکار ہے۔ اور وُہ پنجہ موجودہ فرماں روائے ٹرکی کا ہاتھ ہے۔ استانبول [illegible]
سب سے زیادہ تعجب خیز جو بات ہے وُہ یہی ہے کہ ایسے عُزلت نشین بادشاہ کا رُعب [illegible]۔ اِن حالا[illegible]
کے ہر طبقے پر اِس شدّت کے ساتھ کیونکر قائم ہے۔ کہ چند آدمی تخلیہ میں بیٹھ کر بھی [illegible] طرح چُپ چا[illegible]
کے خلاف کوئی حرفِ شکایت زبان پر لانا خالی از خطر نہیں سمجھتے۔ بغاوت اور [illegible] جو ذاتی طور پر [illegible]
کی سازش کا تو کیا ذکر۔ مگر یہ حیرت انگیز نتیجہ بغیر نقصان کے نہیں حاصل ہوا۔ وہی [illegible] لوگوں کو [illegible]
ہے گیہوں کے ساتھ گھُن بھی پس گیا۔ رعایا کے شورش پسند اور مخالف حصّوں کو [illegible] ارکینِ اعلیٰ [illegible]
سے روکنے کے لئے جو تدابیر عمل میں لائی گئیں۔ اُن کا اثر رعایا کے امن پسند اور [illegible]
مُلک و مِلّت حصّے پر بھی پڑا۔ بلکہ زیادہ سختی کے ساتھ پڑا۔ اور عثمانیوں کی آزادی [illegible] اپنے [illegible]
فعل کا خاتمہ ہو گیا۔ اُنکی ترقّی کی نہ صرف رفتار رُک گئی۔ بلکہ قوّتِ ترقی میں بہت کچھ کمی آ گئی [illegible] ملکوں میں
دِل بُجھ گئے۔ ہمّتیں ٹُوٹ گئیں اور اُمنگیں جاتی رہیں۔ جسے دیکھو زندگی کے دن [illegible] عالی

کررہا ہے۔ ترکی لٹریچر کوئی بیس پچیس برس پیشتر اس زور سے ترقی کرنے لگا تھا کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دنوں میں یورپ کے بہترین ذخائر ادب کا ہم پلہ ہو جائیگا۔ مگر وُہ رفتار روک دی گئی اور اب مدت سے جہاں تھا وہیں ہے۔ بلکہ کسی قدر رُو بہ انحطاط کہنا چاہئے۔ تجارت کی طرف پہلے ہی سے اس جنگی قوم کو توجہ نہ تھی۔ اور اس لئے ملک کی بیشتر تجارت یا اغیار کے ہاتھ میں ہے یا بالکل غیر متحرک پڑی ہے۔ اور ملکی ترقی کا راستہ مسدود ہے۔ جو ترک اپنی تجارت کے امکانات سے باخبر بھی ہو گئے ہیں۔ وُہ موجودہ بے دست و پائی کی حالت میں کوئی تحریک اُن امکانات کو قوہ سے فعل میں لانے نہیں کر سکتے۔ صنعت و حرفت کے میدان میں جو تھوڑا بہت کام ہو رہا ہے۔ وُہ سرکاری کام ہے۔ کارخانے عموماً سرکاری ہیں۔ اور گو وُہ اپنی جگہ بہت منتظم اور عمدہ حالت میں ہیں۔ تاہم رعایا کو اپنی ہمت آزمائی کا موقعہ اس صیغے میں بھی پورے طور پر حاصل نہیں۔ ان حالات میں عثمانیوں کی ترقی کا فقط یہ امکان باقی ہے۔ کہ وُہ کچھ مدت اور اسی طرح چُپ چاپ تھوڑی تھوڑی ترقی کرتے جائیں۔ تاوقتیکہ کوئی ایسا حکمران آئے جو ذاتی طور پر اتنا زبردست نہ ہو جتنا فرمانروائے حال۔ اور وُہ اپنی رعایا کے قابل ترین لوگوں کو موقعہ دے کہ وُہ اپنی اپنی لیاقتوں کے جوہر دکھائیں۔ موجودہ وزارت کے ارکینِ اعلیٰ میں مَیں نے کئی وُزرا اس قابلیت کے دیکھے۔ کہ اگر اُنہیں اُن عہدوں کے جن پر وُہ ممتاز ہیں اختیاراتِ کاملہ حاصل ہوں۔ اور وُہ اُنکو نیک نیتی اور ایمانداری سے اپنے ملک کے نفع کے لئے کام میں لائیں۔ تو چند سال میں ٹرکی ترقی کرنے والے ملکوں میں شمار ہونے لگے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ ان کے علاوہ اَور بہت سے عالی دماغ اور روشن خیال مدبر اس وقت ٹرکی میں موجود ہیں۔ جو

معزول یا معتوب ہو کر خانہ نشین ہو گئے ہیں اور جن کی بے نظیر لیاقت سے مُلک آج کل
کسی طرح کا فائدہ نہیں اُٹھا سکتا۔ یہی لوگ دُوسرے حالات میں اگر سلطنت کے عمائد میں
نہ ہوں تو بھی رعایا کے عُمدہ مشیر اور رہنما بن سکتے ہیں۔ ان کے سوا بہت سے
تعلیم یافتہ اور دردمند تُرکوں کی وُہ متفرق جماعت ہے۔ جو نوجوان تُرک کے نام سے
موسُوم ہے اور جن کا شیرازہ سالہا سال سے سخت پریشان ہے۔ یہ لوگ کسی زمانے میں
جوان ہونگے۔ اب ان میں بہت سے اصحاب پچاس ساٹھ برس کی عمر کے ہیں۔ یہ لوگ
طرزِ حکومت میں اصلاح کے طلبگار تھے۔ اور چاہتے تھے کہ یورپ کے دیگر ممالک کی
طرح استانبول پر بھی بذریعہ پارلیمنٹ حکومت ہو اور سُلطان المعظم آئینی بادشاہ ہونا
منظور فرمادیں۔ لیکن مُلک کی حالت اس تغیر کے لئے تیار نہیں سمجھی گئی اور اُن کی
یہ خواہش پُوری نہیں ہُوئی۔ ان میں سے بعض نے حکومت کی سختی سے گھبرا کر وطن چھوڑ
اور بعض شُبہاتِ مخالفت کی بنا پر جلاوطن کر دیئے گئے۔ مجھے اس گروہ کے اُن
لوگوں سے اختلاف ہے جو ممالکِ غیر میں مخالفین کے روبرو اپنے مُلک اور اپنی حکومت
کا رونا روتے رہتے ہیں۔ کیونکہ مَیں نہیں سمجھتا اس سے اُن کے مُلک کو کیا فائدہ
پہنچ سکتا ہے اور نقصان جو پہنچتا ہے وُہ ظاہر ہے۔ لیکن اس اختلاف کے باوجود
اِس امر کا اعتراف میرا فرض ہے کہ اس گروہ میں بعض لوگ نہایت اعلیٰ قابلیت رکھنے والے
ہیں۔ اور بلادِ یورپ میں برسوں کی رہائش نے اُنکے تجربہ میں بہت سے مفید اضافے
کئے ہیں۔ اگر یہ لوگ کبھی اپنے وطن میں واپس بُلائے گئے اور اُن سے کچھ خدمت
لی گئی تو بہت کچھ کارآمد ہو سکتے ہیں۔ اس جماعت کا شور و غل جس قدر ہے ممالکِ غیر
میں ہے۔ مگر ٹرکی میں کوئی ان کا نام نہیں لیتا۔ اور جن لوگوں کو ان سے ہمدردی ہے۔

وُہ چھپے چھپے رہتے ہیں اور کبھی اپنے خیالات کے اظہار کی جُرأت نہیں کرتے۔ یہ اُمّید کہ اس جماعت کی علانیہ یا خُفیہ کوششوں کے ذریعے کوئی انقلاب ٹرکی کی حالت میں یا کوئی تغیّر وہاں کی طرزِ حکومت میں موجُودہ عہد میں ہو۔ خود اس گروہ کے اندرونی حلقے میں مُنقطع ہوچکی ہے۔ اور وُہ یہی کہتے ہُوئے سُنے جاتے ہیں۔ لَعَلَّ اللّٰہَ یُحدِثُ بَعدَ ذٰلِکَ اَمرًا۔

مَیں نے یہ دیکھا ہے کہ باوجود نامساعدتِ زمانہ کے اب تک تُرکوں میں جان ہے۔ اور زندہ قوم ہونے کے بہت سے نشان اُن میں پائے جاتے ہیں۔ اگر زمانہ نے اُنہیں مُہلت دی تو ایک دفعہ پھر دُنیا میں نام کرینگے اور یہ ثابت کردکھائینگے۔ کہ وُہ فنونِ حرب میں امتیاز حاصل کرنے کے علاوہ فنونِ صلح۔ علم وہُنر اور صنعت و تجارت میں بھی ترقی کرسکتے ہیں۔ اور اُس قابلِ افتخار وراثت کے حقدار ہیں جو سُلطان عثمان غازی سے اُنہیں پہنچی ہے۔ اور جس کو قائم رکھنا اُن کا مذہبی اور قومی فرض ہے۔

دورِ حمیدیہ

"مقامِ خلافت" کا یہ مختصر سا مُرقعہ نامکمل رہیگا۔ اگر اس میں زیبِ اورنگِ خلافت یعنی تاجدارِ عثمانیاں سُلطان عبدالحمید خاں غازی خلد اللہ مُلکہٗ کا ذکر خاص طور پر نہ کیا جائے۔ دُنیا میں جتنے حکمران اِسوقت موجُود ہیں۔ اُن میں کوئی ایسا نہیں جس کے اصلی حالات اِس قدر کم معلوم ہوں۔ جیسے سُلطان المعظّم کے ہیں۔ یا جس کی نسبت اِتنی غلط اور غیر معتبر روائتیں دُنیا میں مشہور ہوں۔ ذاتِ شاہانہ کے مخالفین انکی نسبت دنیا جہان کی تہمتیں تراشتے ہیں اور انکے جواب میں اُنکے لاکھوں مدّاح انہیں جامع کمالات مانتے ہیں۔ مگر اس امر پر دشمن و دوست سب متّفق ہیں کہ سلطان المعظّم کئی اعتبار سے یگانۂ روزگار ہیں بلکہ تاریخ عالم میں ایسے لوگ کم ہُوئے ہیں۔ اُن کی تدابیرِ مُلکی سے خصمِ اِختلاف کرنیوالے بھی معترف ہیں کہ وُہ فہم و فراست میں لاجواب ہیں۔ محنت کا یہ حال ہی کہ جس قدر کام اپنے ہاتھ سے وُہ روز کرتے ہیں۔ یُورپ کا کوئی اَور تاجدار نہیں کرتا۔ اِس پر جو نقائص انتظام میں موجُود ہیں۔ وُہ اس لئے ہیں کہ وُہ کسی پر اعتبار نہیں کرتے۔ اور کوئی فردِ واحد خواہ کیسا ہی قابل کیوں نہ ہو اتنی بڑی سلطنت کے کاروبار کہانتک انجام دے سکتا ہی۔ اِن کے عہدِ حکومت کے مُلک کے لئے مفید یا مُضر ہونے کے بارے میں بہت سی مختلف رائیں ہیں۔ "فریقِ نوجوان" تو یہ کہتا ہے کہ مُلک کی موجُودہ حالت سُلطان المعظّم کی حکمتِ عملی کی غلطیوں اور حد سے بڑھے ہُوئے اختیاراتِ ذاتی کا نتیجہ ہے۔ اور جو کمزوری مُلک کو پہنچی ہے سب کا ذمّہ دار وُہ اپنے فرمانروا کو ٹھہراتا ہی۔ برعکس اس کے رعایا کا وُہ کثیر

حصّہ جو بادشاہ کی اطاعت میں سرگرم ہے اور جن میں عساکرِ سُلطانی بھی شامل ہیں۔ جو اُن کے ذرا سے اشارے پر اپنی جانیں نثار کر دینے کو تیار ہیں۔ یہ کہتا ہے کہ اگر سُلطان عبد الحمید خاں نہ ہوتے تو تُرک یُورپ سے کبھی کے نکل چکتے۔ اور ان کے اس خیال کی تائید یورپ کے اخبارات کے بعض بیانات سے بھی ہوتی ہے۔ گذشتہ سال جب سُلطان المعظّم بیمار تھے اور دُشمنوں نے اُن کے قریب المرگ ہونے کی خبر اُڑا رکھی تھی۔ تو یورپ کے کئی اخباروں نے اِس خبر کو بدیں الفاظ درج کیا تھا۔ کہ وُہ سیاسی چالباز جس نے تیس سال تک یورپ کی متّفقہ چالوں کو بیکار رکھا۔ آخر ایسے دشمن کے پنجے میں گرفتار ہی جس کے پنجے سے رہائی مُشکل ہے۔ گو عجب نہیں کہ وُہ اجل سے بھی چال کر جائے"۔ چنانچہ ایسا ہی ہُوا اور دشمنوں کو اس بے موقع اظہارِ خوشی پر ندامت اُٹھانی پڑی۔ ہمارا مسلک اِن دونوں فریقوں سے جُدا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ فرمانروائے رُوم آخر ایک انسان ہی اور انسان کی تدبیر کبھی درست ہوتی ہی کبھی غلط۔ اُن کے عہد میں کئی اچھّی باتیں ہُوئی ہیں۔ جن کے لئے دَورِ حمیدیہ یادگار رہیگا۔ اور بعض باتیں قابلِ اعتراض ہُوئی ہیں۔ جن پر لے دے ہو رہی ہے اور ہوتی رہیگی۔ لیکن بحیثیتِ مجمُوعی سُلطان عبد الحمید خاں ایک نہایت قابلِ تعظیم سُلطان ہیں۔ جن کے ساتھ اُن کے اکثر ابنائے زمان ناانصافی کرتے ہیں۔ وُہ اپنی عادات اور طریق بود و باش میں نہایت سادہ اور بہت سے شاہانِ سلف کا نمونہ ہیں۔ اُن کے مزاج میں غرُور بالکل نہیں۔ نہایت رقیق القلب اور فیّاض طبع ہیں۔ اسلام سے سچّی محبت رکھتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ غیر مسلم رعایا کے حقوق کا خیال رکھتے ہیں۔ امُورِ خارجیہ میں اُنکی طبیعت خُوب لڑتی ہے۔ اور اسی لئے عملاً وُہ اپنے وزیرِ خارجیہ آپ ہی ہیں۔ اور اگر یہ خیال ملحُوظ رہے کہ جب وُہ تخت پر بیٹھے ٹرکی کے

اکثر شاہزادوں کی طرح باقاعدہ اور اعلیٰ تعلیم سے محروم تھے۔ تو اُن کی لیاقت کی اَور بھی تعریف کرنی پڑتی ہے۔ بہت سے اہل الرّائے اصحاب کا خیال ہے کہ ان کے بعد امُورِ خارجیہ کا ایسا سمجھنے والا ٹرکی کو پھر نصیب نہیں ہوگا۔ خود علومِ جدیدہ سے واقف نہ ہونے کے باوجود مُلک میں تعلیم کو رواج دینا اور خزانۂ سلطنت سے ایک بیش قرار رقم ہر سال اخراجاتِ تعلیم کے لئے جُدا کر دینا بھی ایک ایسا کام ہی۔ جسکی داد نہ دینا ناانصافی ہوگی۔ اس سلسلۂ تعلیم کے ذریعے جو دَورِ حمیدیہ میں بہ نسبتِ سابق بہت ترقی پا گیا ہے۔ ہزاروں آدمی کاروبارِ مُلکی میں حصّہ لینے کے لئے تیار ہو گئے۔ گو ابھی مُلک اپنے امُور پارلیمنٹ کے ذریعے سے اپنے ہاتھ میں لینے کو بالکل تیار نہیں کہا جاسکتا۔ تاہم جو تیاری انکی تخت نشینی کے وقت تھی اس سے بہت زیادہ ہے۔ ریلوے کی ساخت میں بہت سی ترقّی اسی دَور میں ہُوئی۔ سو کاموں کا ایک کام یہ کہ حجاز ریلوے کی بُنیاد اس عہد میں پڑی۔ حرمین شریفین تک مُسلمانوں کی آمد و رفت بآسانی ہونے کی بھی صُورت ہو گئی۔ اور مختلف مُلکوں کے مُسلمانوں کو ایک مشترکہ مذہبی ضرورت کے مِل کر پُورا کرنے کا مفید خیال بھی پیدا ہو گیا۔ ضمناً جو مُلکی فائدہ اس سے نکل آیا وُہ جُدا رہا۔ اس حُسنِ تدبیر کے لئے سلطان المعظم کی جس قدر تعریف ہو کم ہے۔ اور اس نیک کام سے اُن کا نام ہمیشہ زندہ رہیگا۔

دَورِ حمیدیہ کی خُوبیوں کا ذکر کرتے ہُوئے یہ بھی تقاضائے انصاف ہے کہ یہ مان لیا جائے کہ رعایا کی اندرونی ترقّی اس عہد کی قیوُد سے بہت کچھ رُکی۔ اور سُلطان المعظم کے جوڑ توڑ لڑانے کے باوجود دُوَلِ یورپ بہت سے حقوق و مقبوضات اِن سے اسی عہد میں چھین لے گئیں۔ صیغۂ بحریہ کا کمزور رہنا ایک بڑا نقص ہے جو اس عہد سے منسوب رہیگا۔ اور جس کی تلافی چند کشتیوں سے جو حال میں خریدی گئی ہیں۔ ہرگز نہیں ہو سکتی۔

ظاہر ہے کہ ہم اُن اسباب سے واقف نہیں۔ جو صیغۂ بحریہ کی حالت کی درستی کے سدِّ راہ ہوئے لیکن خواہ اسباب کچھ ہی ہوں۔ کسی قوم کے لئے جو اتنے بڑے ملک پر حکمران ہو اور جو دوسری دُول کے ساتھ ہی مساوات قائم رکھنا چاہے اس قسم کی غفلت جائز نہیں۔ اور جب قوم کی طرف سے ساری ذمہ داری انکے سرتاج نے لے لی ہو تو اس غفلت کا گلہ اُسی سے ہوگا۔ سلطان المعظم کی ایک بڑی کمزوری یہ ہے کہ وُہ کسی پر اعتبار نہیں کرتے۔ اور اس وجہ سے بہت سے نقص انتظام میں راہ پا گئے ہیں۔ خود مختارانہ حکومت کی طرف اُن کی ذاتی رغبت بھی حد سے بڑھی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور اس سبب سے بہت سی ترقیاں جو بغیر کسی قسم کے خطرے کے ممکن ہیں ناممکن ہوگئی ہیں۔ اور ملکی کل چلنے سے عاجز آتی جاتی ہے۔ لیکن با ایں ہمہ ہمارا خیال یہ ہے کہ سلطان عبد الحمید خان غازی نے اپنے عہدِ حکومت میں اپنی سمجھ کے موافق ملک و ملت کی خدمت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور ہم اُن لوگوں کی رائے سے اتفاق نہیں کرسکتے جو انکی سیاسی کمزوریوں کو بدنیتی پر محمول کرتے ہیں۔ جو لوگ یہ جانتے ہیں کہ اُن کے سریر آرائے سلطنت ہونے کے وقت ملک کی حالت کس قدر ضعیف اور قرض کا بار کس قدر گراں تھا۔ انہیں یہ ماننا پڑیگا کہ ٹرکی کے نام سے یورپ کے "مردِ بیمار" کا دھبا چھڑانا کچھ آسان کام نہ تھا۔ پہلے ہر وقت یہ لفظ ٹرکی کے نام کے ساتھ استعمال ہوتا تھا اور اب عرصے سے سُننے میں نہیں آیا۔ پس اگر دورِ حمیدیہ میں "مردِ بیمار" رُو بصحت ہوگیا ہے۔ تو اس دور کے لئے یہ یادگار کافی ہے ؞

روزنامچہ کا خلاصہ

روزنامچہ کا خُلاصہ

سیرِ استانبول کے یہ حالات اُن دِنوں میں جب ہم "مقامِ خلافت" میں مقیم تھے۔ مختصر طور پر خطُوط کے ذریعے اخبار ابزرور۔ لاہور میں بزبانِ انگریزی شائع ہو کر مقبولِ عام ہُوئے تھے اور بڑے بڑے اُردو اخبارات میں انگریزی خطوط کے ترجمے بھی چھپے تھے۔ چونکہ ان خطوط میں سب باتیں بقیدِ تاریخ مندرج تھیں۔ اِس لئے اُن کا ترجمہ بطورِ ضمیمہ اس کتاب کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ یہ ترجمہ ایک مشّاق مترجم سے کرایا گیا ہے اور اس کے بعد ترجمہ میں اس نظر سے قطع و بُرید کی گئی ہے۔ کہ جو باتیں گذشتہ اوراق میں مفصّل بیان ہو چکی ہیں۔ اُن کا اعادہ نہ ہو۔ اور خطوطِ مطبُوعہ کے صرف وُہ حصّے یہاں درج ہوں۔ جو ہمارے مشاہدات کا تسلسل دکھانے کے لئے ضروری ہوں۔ یا جن سے کوئی ایسی بات نکلے جو اصل کتاب میں بیان نہیں ہو سکی۔ جو تصاویر اس کتاب کے ساتھ چھپی ہیں۔ اُن میں بعض ایسی ہیں۔ کہ اُنکی توضیح بغیر ان خطُوط کے ممکن نہ تھی۔ جو صاحبان پہلے انگریزی میں یا اخباراتِ اُردو کے ترجموں کے ذریعے ان خطوط کو پڑھ چکے ہیں وُہ شاید پسند فرماویں گے کہ سب کا خلاصہ یکجا اُن کے پاس موجُود رہے۔ اور جن کی نظر سے پہلے یہ خطُوط نہیں گذرے۔ اُن کے لئے یہ ایک تازہ دلچسپی کا باعث ہونگے:-

۲۸-جولائی ۲۸-جولائی کو صبح کے چھ بجے ٹرین میں ہماری آنکھ کُھلی تو دیکھا کہ ہم قسطنطنیہ کے قریب آن پہنچے ہیں۔ دو دِن لگاتار سفر میں کٹے تھے اِس لئے تکان تو بہت چڑھی ہُوئی تھی۔ لیکن ٹھنڈی ٹھنڈی نسیمِ سحر کے جھونکے ہماری ساری تھکن اُتار کے تازہ دم کئے دیتے تھے۔ اِس کے علاوہ ہر چھوٹے سے چھوٹے سٹیشن پر جو دار الخلافہ کے قریب

بکثرت واقع ہیں پُرانی وضع اور نیز نئے فیشن کے تُرکوں کا نظارہ دلکش تھا۔ جن میں مرد عورتیں بوڑھے بچے سبھی دکھلائی دیتے تھے۔ یہاں کے دیہات میں پُرانے فیشن کے لوگوں اور غریب غُربا کا لباس ابھی تک زیادہ تر وُہی شرقی طرز کا چلا آتا ہے حالانکہ اُنہیں اہلِ یورپ کے ساتھ میل جول رکھتے صدیاں گذر چکی ہیں۔ ہاں تُرکوں کی نئی پود نے البتّہ اپنی وضع قطع میں بالکل یوروپین لوگوں کا رنگ ڈھنگ اختیار کر لیا ہے۔

ہماری ٹرین جُوں جُوں منزلِ مقصود کے قریب آتی جاتی تھی۔ اُس کی رفتار دھیمی پڑتی جاتی تھی اور وُہ چھوٹے چھوٹے سٹیشنوں پر بھی ٹھہرتی تھی۔ ایک سٹیشن پر گاڑی ٹھہری ہی تھی کہ ایک تُرک جنٹلمین نے ہمارے درجہ میں داخل ہو کر ایک اَور تُرک سے گفتگو شروع کی جو اُس درجہ میں کئی گھنٹے سے ہمارے ساتھ بیٹھا آیا تھا مگر چونکہ ہم تُرکی زبان سے نابلد تھے ہماری اُس کی کچھ بات چیت نہیں ہُوئی تھی۔ یہ نَووارِد شخص ایک خوش وضع جوان معلوم ہوتا تھا۔ اُس کے انداز سے اُس کی شائستگی مترشح تھی لیکن شروع شروع میں اُس نے بظاہر ہماری طرف کچھ التفات نہ کیا۔ اور اپنے اُس دوست ہی سے سرگرمِ تکلّم رہا۔ لیکن چونکہ مجھے وُہ مہذّب اور تعلیم یافتہ ترکوں کا ایک اچھا نمونہ معلوم ہوتا تھا اس لئے مَیں اُسے ذرا توجّہِ خاص سے دیکھے گیا اور اندر ہی اندر میرا جی چاہتا تھا کہ اگر ہو سکے تو اُس سے باتیں کروں۔ اِتنے میں ریسٹوراں گاڑی سے جو ایک طرح کا سفری کمرہ خورونوش ہے۔ اور اُس گاڑی کے ساتھ بھی لگی ہُوئی تھی۔ ایک آدمی نے آن کر پُوچھا "کیوں صاحب۔ کسی کو قہوہ چاہیئے"؟ اِس پر دونوں تُرکوں نے ایک ایک پیالی قہوہ کی اس سے لیکر نوش کی۔ تب ذرا سفر کی کوفت رفع ہو کر اُن کے چہروں پر بشاشت آئی اور اُن میں سے ایک نے جسے مَیں خصوصیّت کے ساتھ تکتا آیا تھا مجھ سے عربی میں

پُوچھا "کیا آپ ہندوستان کے باشندے ہیں؟ مَیں نے کہا "ہاں"۔ اِس پر وُہ بولا کہ
مَیں نے کلکتہ اور بمبئی کی سیر کی ہے۔ اور دُنیا کے اور بھی بہت سے حِصّوں میں سفر و
سیاحت کر چکا ہُوں جہاں اکثر ہندوستانیوں سے مُلاقات کا موقعہ ملا ہے۔ اسواسطے
آپ کو دیکھ کر مجھے یہی خیال ہوا کہ آپ غالباً ہندوستانی ہونگے۔ یہ صاحب چند منٹ
تک عربی میں گفتگو کرتے رہے۔ پھر مجھے اپنا وزٹنگ کارڈ دیا جس سے اُنکا پتہ
نشان معلوم کر کے مجھ کو ایک قسم کی مسرت آمیز حیرت ہُوئی کہ یہ تو اپنے ہم پیشہ و فنکار
ہی نکلے۔ آپ استانبول کے مشہور و مقبول روزانہ اخبار صباح کے ایڈیٹر تھے اور اپنے
گھر سے جو مُضافات میں کسی مقام پر ہے اپنے دفتر کو جا رہے تھے۔ مَیں نے اِن سے
کہا کہ مَیں بھی اخبار نویس ہُوں۔ جسے سُنکر اُنہیں بھی بڑی خوشی ہُوئی۔ آپ نے
فرمایا کہ "مختلف اقطاعِ عالم کی سیر و سیاحت میں مَیں نے بہتیرے ہی شہر دیکھے جو اپنی جگہ
خوبصُورت اور دلفریب ہیں لیکن میری نظر میں تو قسطنطنیہ اُن سب سے بڑھ کر ہے"۔ اُنہوں
نے فرمایا کہ کل تو خیر اتوار ہے۔ دفتر بند ہوگا۔ پرسوں پیر کو میری خوشی ہے کہ آپ دونوں
صاحب دفترِ صباح میں تشریف لا کر مجھ سے ملیں۔ حُسنِ اتّفاق دیکھئے پہلا ہی تُرک جس سے
ہمیں سابقہ پڑا ایک اخبار نویس نکلا۔ اُنہوں نے اپنے اخبار میں ہماری آمد کا اعلان
کر دیا اور اس اعلان سے ہمیں مختلف موقعوں پر بڑی مدد ملی۔

جب ہم قسطنطنیہ پہنچے کوئی آٹھ بجے صبح کا وقت تھا۔ سٹیشن پر پہنچتے ہی دو عمّال
سرکاری نے پلیٹ فارم پر ہمارے پاسپورٹوں (راہداری کے پروانوں) کا معاینہ
کیا۔ اِن اہلکاروں کے ساتھ جُدا جُدا کلرک تھے جو اپنے اپنے رجسٹروں میں ان پروانوں
سے ضروری ضروری باتیں نقل کرتے جاتے تھے۔ افسرانِ موصوف میں سے ایک

جو خاصہ مُسن بزرگ تھا مجھ سے بڑی شائستگی و ملائمت کے ساتھ پُوچھا " کیا آپ عربی بول سکتے ہیں"؟ جب مَیں نے کہا "ہاں"۔ تو وُہ تھوڑی دیر تک مجھ سے گفتگو کرتا رہا۔ پھر وُہ اپنی ڈیوٹی پر چلا گیا۔ اور ہم نے اپنی راہ لی۔ یہاں تک تو خیر خاصی گذری لیکن محصول خانہ کی تکلیف باقی تھی۔ وہاں ہمارے اسباب کی گٹھڑی مُٹھڑی سب کھول کے ڈالدی گئیں۔ اور ایک ایک چیز کی بڑی چھان بین اور امعانِ نظر سے دیکھ بھال کیگئی خصوصًا کتابوں اخباروں، رسالوں اور دیگر کاغذاتِ مطبوعہ کی جو نہ صرف اُسی جگہ ایک ایک کر کے دیکھے گئے بلکہ وُہ سب دفترِ معائینہ میں بھی پہنچا دیئے گئے تاکہ فُرصت و اطمینان کے وقت انہیں اَور بھی احتیاط سے دیکھ لیں۔ تب واپس دیں۔ ہمارے ہوٹل کے گائیڈ نے اس موقع پر بڑی مدد دی۔ وُہ اس معائنہ کے بعد ہمیں گاڑی پر بٹھلا کر ہوٹل لے آیا۔ اور دوپہر کو اُسی نے ہمارے وُہ تمام کاغذات اور کتابیں وغیرہ بھی دفترِ مذکور سے لادیں۔ جن کا اتنی جلدی واپس ملجانا تو ہمیں بڑا غنیمت معلوم ہؤا۔ مگر اس کے ساتھ ہی یہ امر قابلِ ملاحظہ ہے کہ ان حضرت نے اس حق الخدمت میں ایک خاصہ معقول بل بڑی متانت سے ہمارے آگے پیش کر دیا جو ہمیں چار و ناچار ادا کرنا ہی پڑا۔

یہ معائنہ جو اِس قدر سختی سے کیا جاتا ہے اور بلا شبہ ہر مُسافر کو شاق گذرتا ہوگا۔ بلغاری بدمعاشوں کی شرارت کے باعث ضروری سمجھا گیا ہے۔ جو ہمیشہ بغاوت خیز و فتنہ انگیز لٹریچر چوری چھپی اِدھر سے اُدھر لیجا کر مُلک میں پھیلاتے اور بدامنی و فساد کی بُنیاد ڈالتے رہتے ہیں۔ جن کے ہاتھوں تنگ آکر ٹرکی حُکّام کو بحکمِ ضرورت اِس قدر غیر معمولی اِحتیاطیں عمل میں لانی پڑتی ہیں۔ اور صرف یہی ایک زحمت وزیر باری تو نہیں جس کی دولتِ سنیہ عثمانیہ انکی عنایت سے متحمل ہوتی ہے بلکہ مَیں نے دیکھا کہ سرحد

بلغاریہ سے قسطنطنیہ تک لمبی ریلوے لائن ہے۔ اس پر ترکی جنگی جوانوں کا شب و روز ہر وقت سنگین پہرا رہتا ہے کہ مبادا اشرارِ بلغار میں سے کوئی انارکسٹ ریل کی سڑک کو گزند پہنچائے۔ اُن مشکلات میں سے جو ترکی گورنمنٹ کو اپنے عیسائی ہمسایوں اور سابق ماتحتوں کے ہاتھوں برداشت کرنی پڑتی ہیں۔ مشتے نمونہ از خروارے یہ ایک ادنیٰ سی نظیر ہے۔ اور اسی وجہ سے ترکوں کے لئے انتظامِ قلمرو کا کام روز بروز سخت ہوتا جاتا ہے۔

لندن ہوٹل میں ہم نے ایک کمرہ لے لیا۔ جہاں سے گولڈن ہورن (شاخِ طلائی) کا دلکش منظر بخوبی دِکھلائی دیتا تھا۔ اُونچے اُونچے خوبصورت مکانات کی قطاریں نگاہوں کو اپنی طرف خواہ مخواہ کھینچے لیتی تھیں۔ اُنہی سربفلک عمارتوں میں جہاں تہاں شاندار مساجد کے گنبد اور مینار اَور بھی موثر اور نظر فریب سین پیش کرتے تھے۔ یہاں ہم نے تھوڑی دیر آرام کیا۔ پھر برٹش پوسٹ آفس کو گئے اور طامس کک کے دفتر میں پہنچکر اپنی ڈاک کی بابت پوچھا۔ چونکہ پچھلے دس دنوں میں ہم کو کوئی خط نہیں ملا تھا اس وجہ سے کئی چٹھیاں پرچے وغیرہ اکٹھے ملنے سے ہمیں بڑی خوشی ہوئی۔ اُن کے پڑھنے سے فراغت پاکر ہم نے سہ پہر کا وقت اِستانبول کی سیر میں گذارا۔ شہر کا وہ حصّہ جہاں ہوٹل واقع ہیں۔ پیرا کہلاتا ہے۔ اور اس میں زیادہ تر وہ فرانسیسی اور دیگر اجنبی لوگ رہتے ہیں جو ٹرکی ہی میں آن بسے ہیں۔ یہ حصّہ آبادی اِستانبول سے جو اصل ترکی شہر ہے ایک بڑے بھاری پل کے ذریعے مِلا ہوا ہے۔ یہ پل پُرانا اور محتاجِ مرمّت ہی۔ اور میں نے سُنا ہی کہ ایک جرمن کمپنی کو اسکی از سرِ نو تعمیر کا ٹھیکہ دیا گیا ہے جو موجودہ سے زیادہ وسیع پیمانہ پر ہوگی۔ پیرا سے پل تک

اور پُل کے اُس پار سے مختلف حصصِ شہر تک بیسیوں ٹریموے گاڑیاں دَوڑتی ہیں جن میں گھوڑے جوتے جاتے ہیں۔ اُن کے علاوہ ایک چھوٹی سی زمین دوز ریلوے بھی تیرا سے پل تک گئی ہے جس پر سفر کرنے میں آنے جانے والوں کو بہت سا پھیر بچ جاتا ہے۔ ہمارے ہوٹل کے سامنے ایک مختصر سا میونسپل باغ ہے۔ جہاں تُرکوں کا بینڈ باجہ ہر شام کو اپنے دل کش ترانوں سے مسرور کرتا ہے۔ اِس باغ کے بالمقابل کئی جگہ فونوگراف بھی رکھے ہیں جو ہمیشہ مختلف راگنیاں الاپتے رہتے ہیں۔ فونوگراف کے گانے کو جس غیر معمولی شوق سے یہاں کے لوگ سُنتے ہیں۔ اِس سے پایا جاتا ہے کہ یہ ایجاد یہاں حال ہی میں پہنچی ہے۔ ہمیں اپنے کمرہ ہی میں بیٹھے بیٹھے یہ دیکھ کر مسرّت ہُوئی کہ ایک فونوگراف میں تھوڑے ہی فاصلہ پر بعض ہندوستانی راگ بھی اُڑ رہے تھے۔ جن کی آوازوں نے ہم پر میٹھی لوری کا کام کیا۔ ہم اُنہیں سُنتے ہی سُنتے سو گئے۔ اور اس طرح قسطنطنیہ میں ہمارا پہلا دن ختم ہُوا۔

۲۰۔جولائی | آج ہم سب سے پہلے حسبِ وعدہ اپنے دوست ایڈیٹرِ صباح سے ملنے گئے۔ آپ اُس وقت دفتر ہی میں تھے۔ ہمیں دیکھ کر بہت خوش ہُوئے اور بڑے تپاک سے ہمارا خیر مقدم کیا۔ ہم نے مطبع کی عمارت کو جا کر دیکھا جو نئی ہے اور بہت معقول و موزوں معلوم ہوتی ہے۔ مطبع کے پروپرائٹر مہران آفندی نام ایک ارمنی صاحب ہیں۔ ابھی ہم پریس ہی میں تھے کہ جریدہ موصوفہ کا ایک انگریزی دان قائم مقام ہم سے آن کے ملا۔ اور جو کچھ اُس کی ہماری بات چیت ہُوئی اُس کا حاصل اخبار کے اگلے پرچہ میں شائع ہو گیا۔ یہاں بڑی مسرّت مجھے اس امر سے حاصل ہُوئی کہ یہاں کے اخبارات ہندوستانی مُسلمانوں کے معاملات سے بہت دلچسپی رکھتے ہیں۔ ایڈیٹر صباح

نے مجھ کو اُس روز سے ایک دن پہلے کا جو پرچہ دکھلایا اس میں پورے دو کالم ہندوستان کے واقعات سے پُر تھے۔ یہاں کے مُسلمان اپنے ہندی برادرانِ دینی کی علمی ترقیات کا حال سُن سُن کر پھُولے نہیں سماتے اور بڑی شادمانی اور فخر و مُباہات کے ساتھ اپنے اخباروں میں ان کا چرچا کرتے ہیں۔

دفترِ صبّاح سے ہم ثروت الفنون نام ایک اور مشہور اخبار کے دفتر میں گئے جو باتصویر پرچہ ہے اور احمد احسان بے نامی ایک بہت ہی روشن خیال اور محبِّ وطن تُرک کی ایڈیٹری میں نکلتا ہے اور وُہی اس کے پروپرائٹر بھی ہیں۔ اس اخبار کی اشاعت بہت معقول ہے۔ اور ظاہری شکل و صُورت نفیس و پاکیزہ۔ اِس پر قیمت بالکل واجبی یعنی پانچ آنے فی کاپی۔ اور تو ہر اک لحاظ سے یہ پرچہ اپنی قسم کے یورپی جرائد کا مقابلہ کرسکتا ہے۔ ہاں اِس میں اور اُن میں اِتنا فرق ضرور ہے کہ وہاں کے اخباروں کو مُلکی و قومی مُعاملات میں رائے زنی کی جو آزادی حاصل ہے اُس سے یہ محروم ہے کیونکہ یہاں اخباری تحریرات پر سخت نگرانی و محاسبہ کی ایک بڑی تیغ لگی ہُوئی ہے۔ احمد احسان بے وُہ جنٹلمین ہیں جن سے نیاز حاصل کرنے کی مجھے میرے مہربان دوست حامد بے چانسلر سفارتِ عثمانیہ متعینہ لندن نے بہت تاکید کردی تھی۔ اور اُن سے مِلنے کے واسطے مجھ کو مُعرّفی کی چِٹھی بھی دی تھی۔ جب ہم نے وُہ چِٹھی اِحسان بے کو دِکھلائی تو آپ بہت خوش ہُوئے۔ اور فرنچ زبان میں مجھ سے فرمانے لگے کہ حامد بے کے ارشاد کی تعمیل میرے لئے عین سعادت ہے۔ آپ کی جو امداد میرے امکان میں ہو اس کے لیے میں بسرو چشم حاضر ہُوں اور جب تک آپ یہاں رہیں بڑی خوشی سے اور بدل و جان اپنا وقت آپ کو دُونگا۔ حامد بے

ترکی زبان کے ایک جیّد بلکہ وحید العصر مصنّف ہیں اور انکی تصانیف سے میں نے اپنے دکپن میں بہت کچھ استفادہ کیا ہے"۔ میں نے کہا کہ ہماری خواہش ہے کہ بروسہ کی بھی سیر کریں۔ کیونکہ سُنا ہے کہ وُہ خالص ترکی بستی ہے جس میں اس دار الخلافت (قسطنطنیہ) کی طرح تُرکوں اور غیر اقوام کی ملی جُلی آبادی کم ہے۔ اس پر آپ بولے کہ والیٔ بروسہ میرے عنایت فرما ہیں۔ میں بخوشی آپ کو اُنکے نام چٹھی لکھدونگا۔ اثنائے گفتگو میں فنونِ لطیفہ کا ذکر چل پڑا تو فرمایا کہ گو ہمارے ہاں فنون وہنر کی کچھ قدر وحوصلہ افزائی نہیں کیجاتی۔ پھر بھی ٹرکی میں کم از کم فنِ نقاشی ومصوری کے بعض بڑے باکمال ماہر موجود ہیں۔ اُن میں سے ایک چوٹی کے آرٹسٹ حمدی بے کا آپ نے نام بھی لیا۔ جن کے ہاتھ کی ایک قابلِ دید وبے نظیر تصویر رائل اکیڈمی واقع لندن کی عظیم الشان نمائشِ تصاویر میں دیکھ چکا تھا۔ جہاں وُہ ایک ممتاز جگہ رکھی گئی تھی اور لوگ اس کی بڑی تعریف کرتے تھے۔ میں نے حمدی بے سے ملنے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ حُسنِ اتّفاق سے جس وقت اِحسان بے ہمارے واسطے انکے نام کی چٹھی لکھ رہے تھے۔ اسی وقت حمدی بے بھی آنکلے۔ احسان بے مارے خوشی کے اُچھل پڑے اور بڑے فخر کے ساتھ اُس باکمال مُصوّر کو کمرہ کے اندر لاکر ہم سے ملایا اور کہا کہ یہ صاحب آپ کے کمالِ ہنر کے بہت مدّاح ہیں اور آپ سے ملنے کے ازحد مشتاق تھے۔ حمدی بے ایک سادہ مزاج پنجاہ سالہ بزرگوار ہیں عجائب خانہ سُلطانی کے ڈائرکٹر ہیں۔ اور آثارِ قدیمہ کے مشہور ومعروف مُبصر۔ جن کی تحقیقات وجستجو سے ایشیا کوچک میں زمانہ قدیم کی بہت سی قیمتی وقابلِ قدر یادگاریں دریافت ہُوئیں اور کھود کر نکالی گئیں جو میوزیم مذکور میں اس وقت موجود ومحفوظ ہیں۔ اُنہوں نے

اُس نانام چِٹّھی کو دیکھا جو احسان بے اُن کے نام لکھ رہے تھے اور خاص دلچسپی کی نگاہوں سے اُس کو پڑھا۔ بعد ازاں ہمیں مدعو کیا کہ اگلی جمعرات کو آپ لوگ ہمارے میوزیم میں تشریف لائیں۔ ہم نے بخوشی قبول کیا۔ پھر تھوڑی دیر اَور بات چیت کر کے ہم دفتر ثروت الفنون سے رخصت ہو گئے۔

۳۱-جولائی | ۳۱-جولائی کی تاریخ اور منگل کا دن ہمارے لئے اَور بھی دلچسپ ثابت ہُوا کیونکہ میرے دوست شیخ مشیر حسین قدوئی کے پاس مولوی بدرالاسلام صاحب ہندی کے نام معرفی کی چِٹّھی تھی۔ یہ صاحب محل شاہی کے اندر کُتب خانہ میں ملازم ہیں۔ اس چِٹّھی کو لئے ہم اُن سے نیاز حاصل کرنے کو چل پڑے اور گاڑی میں سوار ہو کر قصر یلدیز کی راہ لی۔ قصر یلدیز کی عظیم الشان عمارت ایک پہاڑی پر بنی ہُوئی ہے۔ جس کے پاس ہی مشہور و معروف حمیدیہ مسجد بھی واقع ہے۔ جہاں حضرت خلافت پناہی ہر جمعہ کو نماز پڑھنے تشریف لیجاتے ہیں۔ اِس مقدس مقام پر پہنچکر تُرکی فوج کے سپاہیوں سے ہماری مُڈبھیڑ ہُوئی۔ جو نہ عربی بولتے تھے نہ فارسی اور نہ کوئی یوروپی زبان۔ اِس واسطے ہم اُن سے اپنا مدّعا زبانی تو کیا کہتے صِرف وُہ لفافہ اُنہیں دِکھلا دیا جو ہمارے ہاتھ میں تھا اور مولوی بدرالاسلام آفندی کا فقط نام لے دیا تاکہ وُہ اِتنا تو سمجھ جائیں کہ ہم فلاں شخص سے ملنے آئے ہیں لیکن اُنہوں نے شانے سُکیڑ کر اور سر ہلا کر گویا اِس بات کا اشارہ کیا کہ ہمیں نہیں معلوم بدرالاسلام کون ہیں۔ ہم اسی عالم میں کچھ متحیّر سے کھڑے تھے کہ اتنے میں ایک ترک سول ڈریس زیبِ بر کئے ہُوئے حضرت خضرؑ کی طرح وہاں آن موجود ہوئے۔ اَور چِٹّھی کا سر نامہ دیکھ کر جان گیا کہ یہ کس کی ہے؛ اس نے بکمال خندہ پیشانی ہم سے کہا کہ آپ ذرا سی دیر یہاں ٹھہرئیے اور خود اندر چلا گیا۔ چند لمحہ کے بعد ایک شخص

لپکا ہوا ہمارے پاس آیا اور ہمیں محل کے ایک بیرونی حصّہ کی طرف لے گیا۔ جہاں لائبریرین صاحب اور ان کے دفتر کے اور آدمیوں کے کمرے واقع ہیں۔ اس جگہ پانچ چھ تُرک کمرہ میں تھے۔ جنہوں نے بڑی مہربانی سے ہمارے سلام کا جواب دیا اور تُرکی میں ہمارا خیر مقدم ادا کیا۔ ہم اُن کے الفاظ تو سب کہاں سمجھ سکتے تھے۔ ہاں مطلب سمجھ گئے اور اشاروں ہی اشاروں میں ہم نے بھی اُن کی عنایت کا شکریہ ادا کردیا۔ مولوی بدر الاسلام صاحب بھی جلدی ہی تشریف لے آئے۔ بڑی گرمجوشی اور تپاک سے ملے اور دلی مسرّت سے ہمارا خیر مقدم کیا۔ چونکہ وُہ تُرک احباب ہماری زبان سے نابلد تھے اور ہم اُن کی زبان سے ناآشنا اس لئے ہم میں اُن میں گویا ایک طرح کی دیوارِ اجنبیّت حائل تھی۔ مولانا ممدوح نے ہمارے درمیان ترجمان بنکر اس حجاب کو دُور کیا۔ جو ہم کہتے آپ اُنکو تُرکی میں سمجھا دیتے اور جو کچھ اُن کا مُدعا ہوتا ہمیں ہماری زبان میں بتا دیتے۔ ہمیں معلوم ہُوا کہ وُہ اُس روز کا پرچہ صباح شروع سے اخیر تک پڑھ چکے تھے۔ جس میں ایک آرٹیکل خاص ہمارے متعلّق تھا اور صبح کو شائع ہونیوالے دیگر اخبارات میں بھی ہماری آمد کا کم و بیش تذکرہ کیا گیا تھا۔ اُنہوں نے اس معاملہ کو لیوانٹ ہیرلڈ کے روزانہ پرچہ سے اقتباس کیا جس کی ہمیں بعد میں خبر ہُوئی کہ پیر کی اشاعت میں ہمارے متعلّق ایک نوٹ چھپ چکا تھا۔

جس بزرگ نے ازراہِ عنایت ہمارا خیر مقدم کیا وُہ اس بات سے بہت ہی متاثر ہو چکے تھے کہ ہندی مُسلمان کیسے مخلص ہیں کہ محض اسلامی دار الخلافت کی زیارت کی خاطر اتنے دُور دراز سفر کی زحمت بطیبِ خاطر گوارا کرکے آتے ہیں اور اسی وجہ سے آپ نے مولوی بدر الاسلام کی معیّت میں ہم سے ملنے کا شوق ظاہر کیا تھا۔ پس اُنہیں

ہم کو وہاں پاکر قدرتاً خوشی ہونی ہی چاہیئے تھی کہ بغیر کسی دقت اور تلاش وجستجو کے گویا گھر بیٹھے مدعا حاصل ہوگیا۔ یہاں ہم بہت دیر تک ٹھہرے بلکہ دوپہر کا کھانا بھی اپنے کرم فرماؤں کے اصرار سے یہیں کھانا پڑا۔ مولوی بدرالاسلام صاحب نے فرمایا کہ حاجی علی پاشا سے جو نوابِ اوّل ہیں۔ آپ کی مُلاقات کرائے دیتا ہوں۔ چنانچہ ہم پاشائے ممدوح کے کمرۂ ملاقات میں گئے۔ اور دیکھا کہ آپ پُرانے فیشن کے ایک واجب الاحترام بزرگ ہیں۔ آپ نے بجز تُرکی کے کوئی بات نہیں کی۔ اِس لئے مولوی صاحب کو پھر ہمارا ترجمان بننا پڑا۔ ہم کوئی گھنٹے بھر تک گفتگو کرتے رہے۔ بیچ بیچ میں عُمّالِ سرکاری بھی کسی نہ کسی کام کے لئے بغیر روک ٹوک یا اجازت وِاطّلاع کے آتے رہے۔ ہاں صرف اِتنا وُہ البتہ کرتے تھے کہ دروازہ کھولا اور ذرا کی ذرا باادب کھڑے ہوگئے۔ منٹوں کا کیا کام ہے؟ بمشکل کچھ سکنڈ ہی اُنہیں اسطرح گذرتے ہونگے کہ پاشائے ممدوح کی نظر پڑ جاتی اور یہ اندر چلے آتے۔ ہم ابھی وہیں تھے کہ صیغۂ صرفِ خاص کے خزانچی صاحب بھی تشریف لائے۔ کچھ دیر تک حاجی علی پاشا کے پاس بلکہ ایک ہی دیوان پر انکے پہلو بہ پہلو بیٹھے اور چُپکے چُپکے کچھ باتیں کرتے رہے۔ پھر ہماری طرف متوجّہ ہُوئے اور عربی میں معمُولی پُوچھ گچھ کی۔ حاجی علی پاشا نے اِس مُلاقات کے آخر میں فرمایا "ہم آپ سے مِلکر بہت مسرور ہُوئے اُمید ہے کہ پھر بھی جب آپ سے ہوسکیگا ضرور آئینگے"۔

دوپہر کے بعد دو بجے کے قریب ہم محل سے نکلے اور اپنے ہوٹل کو واپس آئے۔ تھوڑی ہی دیر میں سفارت برطانیہ کے ایک عُہدہ دار مسٹر فٹنر موریس ہوٹل میں ہمیں ملنے تشریف لائے۔ اِن کا یہ آنا ہمارے اُس خط کے جواب میں تھا جو ہم نے قسطنطنیہ پہنچتے ہی ہز اکسلنسی سر نکولس اوکونر سفیر برطانیہ متعینہ بابعالی کی خدمت میں روانہ کیا تھا۔

بیں مضمون کہ ہم یہاں پر آئے ہوئے ہیں۔ اور اس لحاظ سے کہ برٹش انڈیا کے باشندے اور حضور ملک معظم کی وفادار رعایا ہیں۔ آنجناب سے حصولِ نیاز کا موقعہ ملنے کو ہم اپنے لئے باعثِ فخر و مسرت سمجھتے ہیں اگر ہز اکسلنسی اپنے اوقاتِ گرامی کا تھوڑا سا حصہ ہماری خاطر نکال سکیں۔ مسٹر فٹز موریس نے آنکر ہمیں اطلاع دی کہ سفیر صاحب نے آپ لوگوں کے پیغام کی نسبت اظہارِ مسرت فرمایا ہے۔ لیکن چونکہ وہ شہر سے بہت دور ترا پیہ نام ایک ایسی جگہ رہتے ہیں جو کشتی کے رستہ گھنٹہ بھر کی مسافت پر واقع ہے اسواسطے اُن کا خیال ہے کہ آپ لوگوں کو وہاں جاکر ملنے میں بڑی تکلیف ہوگی۔ ہم نے کہا کہ ہمیں دوری اور مسافت کی کچھ پروا نہیں۔ اگر ہز اکسلنسی کوئی تاریخ مقرر فرماویں تو ہم بخوشی وہاں پہنچیں گے۔ اِس پر مسٹر موصوف نے کہا "میں اس بارہ میں اُن سے گفتگو کرکے آپ کو اُن کی مرضی سے اطلاع دونگا"۔

تیسرے پہر ہم گاڑی میں بیٹھ کر بابعالی کی طرف گئے جہاں وزرائے دولت عالیہ کے دفاتر ہیں۔ یہاں کے واسطے ہمارے پاس ہز اکسلنسی مسورس پاشا سفیر ٹرکی متعینہ لندن کی طرف سے ایک باضابطہ معرفی کی چٹھی تھی اور ہم اُسے دفتر میں پیش کرنا چاہتے تھے بابعالی جس کی نسبت بیرونی دُنیا بہت کچھ سُنتی ہے دراصل بحیثیت عمارت کے باہر کی طرف سے تو کچھ ایسی شاندار اور دلکش چیز نہیں ہے۔ لیکن اندر کے کمرے فی الواقعہ بہت فراخ و وسیع ہیں اور دفاتر کے کمرے بھی ہر طرح کی ضروریات و تکلفات سے آراستہ ہیں۔ داخلہ کے پھاٹک پر فوجی سپاہیوں کا پہرہ لگا ہوا تھا جن کی وجہ سے ہمیں اپنے اظہارِ مدعا میں ضرور دقت پیش آتی۔ لیکن ایک خستہ حال شخص نے آن کر جس بیچارے کے تن پر کپڑے بھی گت کے نہ تھے۔ ہمیں اِس مشکل سے بچایا۔ ایسا معلوم

ہوتا ہے کہ یہ حضرت کوئی اخباروں کے کیڑے تھے اور اخباری دنیا کے واقعات و معاملات سے باخبر کہ آج صبح تک کی خبریں بھی آپ کی نظر سے گذر چکی تھیں۔ اُس نے ہماری شکل دیکھتے ہی فوراً تاڑ لیا کہ یہ وُہی "ہندی سیاح" ہیں جن کا اخباروں میں ذکر تھا۔ اور اپنے قیاس کی صحت سے بالکل مطمئن ہو کر۔ آپ ایسی خوشی میں آئے کہ بلا ہماری اِستدعا کے ہی خود بخود سپاہیوں سے ہماری سفارش کر دی اور اُنہوں نے ہمیں دروازہ پر لیجا کھڑا کیا۔ جہاں ایک اہلکار نے ہمیں اپنی سپردگی میں لیا اور ایک کمرہ میں لیجا بٹھایا۔ جن لوگوں کو فارن آفیس (صیغۂ خارجہ) سے کچھ کام ہوتا ہے وُہ اس کمرے میں انتظار کرتے ہیں۔ یہاں سعد الدّین بے سکرٹری وزیرِ خارجیہ) نے آن کر ہمارا مدّعا دریافت کیا۔ اور ہم سے وُہ چِٹّھی لے لی جو جناب وزارت مآب کے نام تھی۔ اِس چِٹّھی میں صِرف کلماتِ تعارف مرقوم تھے اور کچھ نہ لکھا تھا کہ ہمیں کیا چاہیئے اور کس قسم کی اعانت درکار ہے۔ مگر چِٹّھی لیجانے کے بعد وُہ پھر واپس آئے اور نہایت شفقت سے پُرسانِ حال ہُوئے۔ جب ہم نے بیان کیا کہ اِس سیاحت سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ یہاں کی مذہبی۔ تمدّنی اور تعلیمی حالت کو دیکھیں اور دار الخلافتِ اسلامیہ کے مُمتاز ترین اشخاص سے نیاز حاصل کر کے مُسلمانانِ ٹرکی و ہندوستان کے رشتۂ اخوّت اور ہمدردی کو بڑھائیں اور تقویت دیں۔ تو صاحبِ موصُوف بہت خوش ہُوئے اور جا کر وزیر صاحب سے رپورٹ کی۔ چند منٹ کے بعد آپ تیسری دفعہ پھر آئے اور فرمایا کہ ہز ایکسلنسی توفیق پاشا وزیر صیغۂ خارجیہ آپکو باریابی کا موقعہ دینے کے لئے بخوشی آمادہ ہیں۔ چنانچہ آپ ہمیں اُس وسیع و شاندار کمرہ میں لے گئے جو وزیرِ ممدوح کا دفتر ہے۔ جن کی مُعاملہ فہمی اور تدبّر کی یورپ تک دھاک ہے۔ ہز ایکسلنسی کے پاس معزّز عمایدِ سلطنت اور بھی م

تھے۔ ایک نُوری پاشا جو بعد میں شریکِ گفتگو ہُوئے اور معلوم ہوتا تھا ہندوستان کے معاملات سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ خاصکر مُسلمانانِ ہند کی تعلیمِ نسوان سے۔

جناب وزارت مآب ہمارے ساتھ کمال عنایت و التفات سے پیش آئے۔ یعنی جب ہم اندر گئے تو آپ کھڑے ہو گئے۔ اور ہمیں اپنے پاس ہی جگہ دی۔ سعدالدین بے نے ہمیں نام بنام انٹروڈیوس کرایا۔ اور انگریزی میں ہمارے اور وزیر صاحب کے درمیان ترجمان کا کام کرتے رہے۔ اُس وقت کی گفتگو اس قسم کے معاملات پر تھی۔ مثلاً مسلمانانِ ہند کی تعلیم۔ اُن کی عام ترقی۔ قومی حالت وغیرہ وغیرہ محققانہ پایا جاتا تھا کہ جناب وزارت مآب کی معلومات اُن میں نہایت گہری اور مبصرانہ ہیں۔ توفیق پاشا کی عمر اس وقت ساٹھ سال یا اس سے بھی کچھ اُوپر ہو گی۔ آپ کا چہرہ مُہرہ خدوخال نمایاں طور پر دلکش ہیں۔ بات چیت بڑی دھیمی آواز میں کرتے ہیں۔ دستِ مُبارک کام کرتے وقت بتقاضائے عُمر ذرا کانپتا ہے۔ مگر بیٹھتے چلتے چُست اور مستعد جوانوں کی طرح سیدھے ہو کر ہیں۔ صُورت پر ایک رُعب وجلال برستا ہے۔

وزیر صاحب سے مُلاقات کر کے ہم سعدالدین بے کے کمرہ میں آگئے جہاں ہمیں ابراہیم حقّی بے کے ملنے کی مسرّت حاصل ہُوئی جو بابِ عالی کے مشیر قانونی ہیں۔ آپ فرفر انگریزی میں بات چیت کرتے تھے اور معلوم ہوتا تھا کہ انڈین پالٹکس سے بخوبی باخبر ہیں۔ ہم سے آپ نے تقسیمِ بنگال اور اس کے نتائج متعلقہ مُسلمانان صُوبہ مشرقی بنگال کی بابت کچھ پُوچھا۔ جب ہم اس گفتگو میں مصرُوف تھے اُس وقت توفیق پاشا ہم کی جمارے لئے ایک سفارشی چِٹھی اس مضمون کی لکھ رہے تھے کہ اُنہیں

یہاں کے تمام قابلِ دید مقامات کی سیر کرائی جائے اور اُن کے پیشِ نظر مقاصد کے حصول میں ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچائی جائیں۔ علاوہ ازیں آپ نے اپنے صیغہ کے اہلکار جلال اُنسی بے کو جو فارسی بولتے تھے یہ حکم دیا کہ ان کے ساتھ جاکر ترجمان کا کام دو اور خوب اچھی طرح سیر کرادو۔ یہ چِٹھی ہز اکسلنسی وزیرِ اعظم بالقابہ کی خدمت میں روانہ کی گئی جس کے طفیل ہمیں فرید پاشا (وزیرِ اعظم) کے حضور بھی باریابی کا موقعہ ملا۔ پاشائے ممدوح بھی ہمارے ساتھ اُسی عنایت سے پیش آئے جیسی کہ وزیرِ خارجیہ کی طرف سے ظہور میں آئی تھی۔ اور ویسے ہی امُور کی نسبت آپ بھی استفسار و گفتگو فرماتے رہے۔ از انجملہ ایک بات آپنے یہ پُوچھی کہ کیا آپ کے ہاں (ہند میں) اُمورِ دینی و دُنیوی کے درمیان کچھ امتیاز و تفریق کی جاتی ہے"؟ مَیں نے کہا "نہیں وہاں تو دونوں سے متعلق عجب خلط ملط ہے۔ اِس پر آپ نے کمال تاسّف سے فرمایا کہ یہی حال یہاں ٹرکی کے مُسلمانوں کا ہے۔ پھر عربی کا ایک مقولہ پڑھا اور کہا کہ ہماری قومی زندگی کا اصُول یہ ہونا چاہئے۔ یہ مقولہ غالبًا رسُول اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی ایک حدیث ہے بدیں مفہوم کہ فکرِ عقبیٰ اس طرح کرو کہ گویا کل ہی مرجانا ہے۔ اور فکرِ دُنیا اِس طرح کہ گویا ہمیشہ جینا ہے"۔

یکم اگست ۱۹۰۶ء اگست کا مہینہ جو سارے کا سارا دار الخلافہ اسلامیہ میں گذارنے کا ارادہ ہے اِس کا آغاز ایک ایسی مُلاقات سے ہوا جو مجھے کبھی نہ بھُولیگی۔ ہمارے ترجمان سرکاری یعنی جلال اُنسی بے نے ہم سے پہلے ہی دن پُوچھا تھا کیا آپ ہز اکسلنسی پرنس ارفع الدّولہ سفیرِ ایران متعینہ بابِ عالی سے مِلنا چاہتے ہیں"؟ اور ہم نے اس پر بڑی خوشی سے رضامندی ظاہر کی تھی۔ آج وُہ ہمیں شاہزادہ کے پاس لیگئے۔ اور ہم دیر تک اُن کی خدمت میں رہے۔ مرزا رضا خاں دانشؔ (یہ آپ کا اصلی نام اور تخلّص ہے) نہایت

روشن خیال بزرگ ہیں اور بلادِ یورپ تک میں مشہور و معروف ہیں۔ ہیگ کی گذشتہ "پیس کانفرنس" (مجلس حامی امن) میں آپ ایران کی طرف سے قائم مقام تھے۔ اور اُس وقت سے اب تک امن عام کے حامی کار ہیں۔ لیوسرن کے عجایب گھر میں کمرۂ امن و صلح میں مدبرانِ یورپ کی تصاویر کے درمیان ہم نے جو شبیہہ کسی مشرقی مدبر کی بھی دیکھی تھی جس کے نیچے الفاظ پرنس آف پیس" (شہزادہ امن) لکھے تھے۔ اب ہم نے وہی شکل و شباہت شہزادہ ارفع الدولہ کی پاکر معًا پہچان لیا۔ اور آپ کو اس امتیاز کے حصول اور نیز اس بات پر مبارکباد دی کہ آپ کی مساعی جمیلہ ایسے مبارک مقاصد سے متعلق رہ چکی ہیں۔ یہاں سے اُس نظم کا ذکر چل پڑا جو شہزادہ ممدوح نے "امن" کے مضمون پر لکھی تھی جس کا ترجمہ یورپ کی تمام زبانوں میں شائع کیا گیا۔ پرنس ارفع الدولہ نے اُس نظم کی ایک ایک کاپی ازراہِ عنایت مجھے اور میرے دوست کو بھی مرحمت فرمائی جس کی نہایت نفیس و خوبصورت جلد بندھی ہوئی ہے۔ اور اُسے آپ نے اپنے دستخط سے بھی مزین کیا۔ یہ نظم حال کی فارسی کا ایک لطیف نمونہ ہے۔ اِس میں مختلف ممالک کے قائم مقاموں کی طرف سے حمایتِ امن کے دلائل دیکر بعد میں ایک "مشرقی" کی صدا لگائی گئی ہے جو کانفرنس میں موجود ہے اور اُن سے کہتا ہے کہ اگر تم لوگ واقعی امن اور صلح کے خواہاں ہو تو لازم ہے کہ اہلِ مشرق کو بھی اپنی طرح آدمی سمجھو بلکہ اپنا بھائی جانو اور آدمی بلکہ بھائی کا سا ہی اُنکے ساتھ برتاؤ بھی کرو ۔۔۔ امن عالم کی بہترین ضمانت یہ سلوکِ اخوت ہی ہو سکتا ہے۔ کیونکہ امن اس تجربہ کا قدرتی و لازمی نتیجہ ہوگا۔ اِس قابلِ قدر نظم کی کچھ ابیات بطورِ نمونہ درج کی جاتی ہیں:۔

وانگہ ز اہلِ شرق یکے گفت دوستاں — ایں نکتہ را ز لطف نماید یکے بیاں
در کوہسار و در دہ و در دشت و در دمن — بر جملہ خلق باید فہماند ایں سخن
کافریقی و فرنگی و چینی است ہم وطن — آں یک وطن زمین و بود جملہ را سکن
نوعِ بشر ز یک پدر و مادر ند و ما — باہم برادریم ز روییم یاختا
ہر ملتے کہ تربیتش ہست بیشتر — باید بدیگراں رسد از فیضِ او ثمر
مغرب کند رفاہیتِ شرق را خیال — باشند در جنوب پئے راحتِ شمال
خلق ار شوند جملہ برادر بہ یکد گر — از جنگ و از جدال نماند دگر اثر
وسعت بدہ بہ دائرۂ ہمت و خیال — خود اند کی ببیں کہ چہ ممکن شود محال

پرنس ممدوح نے ہمیں اپنی ایک اور کتاب بھی دی جس میں آپ نے اہلِ مشرق کے اس خیال اور اس کی طرف میلانِ عام کی زور سے مخالفت کی ہے کہ آدمی پچاس یا حد درجہ ساٹھ سال کی عمر کو پہنچتے ہی بوڑھا اور ضعیفُ القویٰ ہو جاتا ہے۔ برخلاف اس کے اُنھوں نے ایک دلکش حکایت کے پیرایہ میں یہ جتایا ہے کہ اُسے ایک سو بیس برس جینا چاہیے۔ جس کا نصف اوّل حصولِ تجارب میں گذار دے اور نصفِ آخر ان تجربات سے فائدہ اُٹھانے میں۔ اور کہ سادہ اور محتاط زندگی بسر کرنے اور صحت بخش ورزش کرتے رہنے سے ہر شخص اپنی عمر بڑھا سکتا ہے۔ علمی و ادبی مسائل کی گفتگو کے بعد ہم دیگر مختلف معاملات پر تبادلۂ خیالات کرتے رہے۔ آپ نے ہندوستان کا ذکر بڑی ہمدردی سے کیا اور مسلمانانِ ہند کے جوشِ ترقی کی نسبت اظہارِ استحسان فرمایا۔ میں سن چکا تھا کہ ترکی ایرانی سرحد کے متعلق جو تنازعہ پچھلے دنوں سلطنتوں کے مابین اُٹھ کھڑا ہوا تھا اس کے رفع کرنے اور باہمی صلح و صفائی

کرانے میں آپ نے حتی الامکان بڑی سرگرمی وخلوص سے سعی وجانفشانی کی۔ پس میں نے اس کو ملحوظ رکھ کر توقع ظاہر کی کہ آپ کی سی قابلیت اور خیالات کا آدمی ضرور ہر کہ ان دونوں ہمسایہ اسلامی طاقتوں کے تعلقات کو استحکام وتقویت دینے میں کوشاں رہیگا۔ آپ نے جواب دیا کہ میں چونکہ عالمگیر امن کا حامی ہوں لہٰذا دو مسلمان ملکوں کے درمیان رابطہ اتحاد قائم رکھنا میرے نزدیک اور بھی زیادہ ضروری مدعا ہونا چاہئے اور اسی لئے جہاں تک میرا بس چلیگا اُس تعلق دوستی کو نہ صرف بنائے رکھنے بلکہ روز بروز بڑھانے میں ساعی رہونگا۔ قبل اس کے کہ ہم پرنس ممدوح سے رخصت ہوں آپ نے ازراہِ کرم ہم کو شاہِ ایران کی تقریبِ سالگرہ میں شریک ہونے کی دعوت دی۔ جو اگلے اتوار کو منعقد ہونے والی تھی۔ جسے ہم نے بشکریہ منظور کیا۔

۲۔ اگست | حمدی بے مہتمم عجائب خانہ نے ہماری سیر کے لئے جمعرات کا دن مقرر کیا تھا۔ چنانچہ ہم اُس روز دس بجے صبح کے وہاں پہنچے۔ آپ پہلے ہی اُس جگہ آچکے تھے۔ ہم نے اپنا کارڈ بھیجا آپ فوراً باہر تشریف لے آئے۔ یہ عجائب خانہ ایک شاندار عمارت ہے جس میں اب بہت کچھ اضافہ ہو رہا ہے۔ جب یہ جدید عمارت مکمل ہو جائیگی۔ تو یورپ کی بہترین عمارتوں میں اس کا شمار ہوگا۔ اب بھی اس کے اندر بعض چیزیں ایسی نادر ہیں کہ اُن کے لحاظ سے اس عجائب خانہ کو عدیم المثال کہہ سکتے ہیں۔ مثلاً ایک سنگ مرمر کا تابوت ہے جو نہایت حیرتناک طور پر اب تک جوں کا توں محفوظ رکھا گیا ہے جس کی قدامت کی یہ کیفیت ہے کہ اس پر جو مورتیں بنی ہوئی ہیں اُن میں سے ایک کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ سکندرِ اعظم کی اس موقع کی شبیہہ ہے جبکہ وہ دارائے ایران سے مصروفِ پیکار تھا۔ بعض کا یہ خیال ہے کہ یہ سکندر کی تصویر

نہیں بلکہ اُس کے کسی سپہ سالار کی ہے۔ ایک اَور نہایت خوبصورت تابُوت ہے جس میں روتی ہُوئی عورتیں دِکھلائی گئی ہیں۔ جن سے قدیم زمانہ کی رسمِ ماتم کا ہُوبہُو نقشہ پیشِ نظر ہوجاتا ہے۔ اِس یادگار کی نسبت بیان کیا جاتا ہے کہ حضرتِ مسیح سے چار سو برس پہلے کی بنی ہُوئی ہے۔ اِنسان حیران رہجاتا ہے کہ زمانۂ قدیم کے لوگوں نے بھی فنِ نقّاشی اور دیگر فنونِ لطیفہ میں کس بلا کا کمال پیدا کیا تھا۔ یہ اَور قسم کے دیگر ذخائرِ قدامت حال میں خود حمدی بے نے اپنی تحقیقاتِ آثارِ قدیمہ کے دَوران میں نکلوائے ہیں۔ ایشیائے کوچک گویا تہذیبِ قدیم کا گہوارہ ہے۔ حمدی بے نے اس کے کھنڈروں کی برسوں خاک چھانی ہے۔ اور استانبول کے عجائب خانہ کو اپنی تلاش سے مالا مال کیا ہے۔ اس میں تُرکی مصنُوعات کے نمونے بھی بڑے ہی دلچسپ ہیں۔

جب ہم عجائب خانہ اس سرے سے اُس سرے تک دیکھ چکے تو جلال بے سے ملے وُہ ہمیں دو اَور مقامی اخباروں کے دفتر دکھلانے لے گئے۔ ایک جریدۂ اقدام دوسرے سعادت۔ اُنہوں نے ہم سے کہا کہ چُونکہ آپ لوگ پہلے دو ہمعصروں سے مُلاقات کرچکے ہیں اِسواسطے باقی معاصرین کو بھی قدرتی طور پر ایسی ہی توقع ہوگی۔ پہلے ہم دفترِ سعادت میں گئے۔ ایڈیٹر صاحب نے بڑی مہربانی و مُسافرنوازی سے خیر مقدم کیا۔ ہمارا دفترِ اقدام میں جانا اَور بھی زیادہ دلچسپی کا موجب ہُوا۔ کیونکہ اس کی طرف سے جو صاحب ہمیں ملے اظہارِ رائے میں اُن کی سی اخلاقی جُراٰت میں نے دیگر حضرات میں جن سے استانبول میں اب تک مُلاقات ہُوئی تھی نہ پائی تھی۔ اُنہوں نے اس نگرانی اور روک ٹوک کی سختی کے خلاف بڑی شکایت

کی جو قسطنطنیہ میں اخبارات کے ساتھ برتی جاتی ہے اور کہا کہ خاصکر ٹرکی اخباروں کے ساتھ اور بھی زیادہ سختی کا برتاؤ ہوتا ہے۔ اُنہوں نے کہا کہ ٹرکی اخبار بالکل ناتوان اور بے دست و پا ہیں۔ اور کہ ہمیں یہاں کے اخبارات سے خاک بھی توقع نہ رکھنی چاہیئے کہ استحکامِ ملت میں کچھ امداد کر سکینگے۔ مَیں نے اُنہیں تسلی دی اور کہا "غنیمت سمجھئے کہ ایک طرح تو یہاں کے اخباروں کی حالت اپنے ہندی معاصرین سے بدرجہا بہتر ہے۔ یعنی اس لحاظ سے کہ ان کے پڑھنے والے تو ہیں چنانچہ ٹرکی میں ایک ایک روزانہ پرچہ کی ہزارہا کاپیاں صبح سے شام تک بازاروں میں ہاتھوں ہاتھ بک جاتی ہیں اور ہندوستان میں قلتِ اشاعت کا اکثر جھینکنا پڑا رہتا ہے۔ لہٰذا میرے خیال میں ٹرکی کے اخباروں کو وُہ بات تو حاصل ہے جو ایک جلیل القدر اور طاقتور پریس کے لئے مُقدّم اور ازبس ضروری سمجھی گئی ہے۔ ہاں یہ کہئے کہ وُہ ابھی حقیقی رُوح یا زندگی سے محروم ہیں۔ سو اگر یہ جسم بے جان بھی بنا رہا تو اس میں جان بھی کبھی نہ کبھی پڑ ہی جائیگی۔ آپ کے ہاں بہت سے اخبار روزانہ ہیں جو ٹائپ میں مشینوں کے ذریعہ چھپکر شائع ہوتے ہیں۔ بس اگر کسر ہے تو آزادی کی جو زمانہ موافق و سازگار رہا اور یہ کسر بھی پوری ہو گئی تو ٹرکی پریس اس قابل ہو جائیگا کہ اپنی اصلی قدر و منزلت پر پہنچکر دیگر مہذّب ممالک کے اخبارات کی طرح سلطنت کا چوتھا رُکن سمجھا جا سکے"۔ لیکن ان باتوں سے ہمارے دوست کو جو اقدام کے ایڈیٹرول میں تھے کچھ تسلّی نہ ہُوئی وُہ حالاتِ موجُودہ کی طرف سے آخر تک برابر مایُوسی ہی ظاہر کرتے رہے۔

ہمارے آج کے دن کا نہایت مفید حصّہ وُہ تھا جس میں ہمیں مولانا محمد آفندی

کی ملاقات نصیب ہوئی - یورپین ٹرکی میں قاضی عسکر ہیں - آپ کا فرضِ منصبی اس حصّہ قلمرو کے مقدّمات کے فیصلوں پر نظر رکھنا ہے کہ آیا وہ شرع شریف کے مطابق ہوتے ہیں یا نہیں - اور صوبہ بھر کے مختلف اضلاع میں قاضیوں کے تقرّر کا اہتمام بھی آپ ہی سے متعلق ہے - اسی قسم کا جداگانہ انتظام ایشیائی رُوم کے لئے ہے اور یہ دونوں صیغے شیخ الاسلام کے ماتحت ہیں - یہ قاضی عسکر جنکے پاس ہم گئے - ظاہری شکل وصورت سے تو ایک پُرانے فیشن کے بزرگوار معلوم ہوتے تھے مگر اُن کے اظہار رائے سے پتہ لگا کہ آپ ایک روشن خیال مُحبِّ مُلک وملّت ہیں - ہم اُن سے بڑی دیر تک باتیں کرتے رہے اور کوئی تین گھنٹے اُن کی خدمت میں بیٹھے رہے - بیچ میں صرف دوپہر کے کھانے کیوقت تھوڑی دیر کا وقفہ ہوا - اس کھانے میں شریک ہونے کو قاضی صاحب کے فرزندانِ رشید نے ہماری بھی صلاح کی - بالکل سیدھے سادے اسلامی طریق پر بلا کسی رسمی تکلّف کے - یہ حضرات بھی بہت ہی راسخ العقیدہ پُرانے فیشن کے تربیت یافتہ معلوم ہوتے تھے - قاضی صاحب ممدوح تعلیم کے بڑے حامی ہیں اور اس کو خاص وقت دینے کے علاوہ یہ بھی مانتے ہیں کہ تعلیم ضروریاتِ زمانہ کے مناسب حال اور انکو ملحوظ رکھ کر ہونی چاہیئے - آپ نے فرمایا "مجھے یہ سُنکر بڑی خوشی ہوئی کہ مسلمانانِ ہند میں ایک طرح کی قومی بیداری پیدا ہوتی جاتی ہے اور وہ مدرسے اور کالج قائم کر رہے ہیں - میرے نزدیک یہ بھی دینِ حق کی ایک اہم خدمت ہے" اور فرمایا "مجھے معلوم ہوا ہے کہ ہندوستان میں تنگ دل مُلاّؤں نے اوّل اوّل کچھ عرصہ تک اس ضروری کام میں مزاحمت کی - جو مذہب کو جدید تعلیم کے خلاف

سمجھتے تھے۔ مگر میں تو اس تعلیم کا بالکل مؤید ہوں بشرطیکہ وُہ دینی تعلیم اور فرائض مذہبی کی بجاآوری سے غافل نہ کردے۔ بلکہ اگر ضرورت ہو تو اُن لوگوں کا مُنہہ بند کرنے کے لئے جو تعلیم پر مخالفانہ نکتہ چینیاں کرتے ہیں میں تو اُس کے جواز اور اس کی حمایت کا فتویٰ دینے پر آمادہ ہوں"۔ آپ نے تعلیمِ نسواں کی بھی زور سے تائید فرمائی مگر کہا یہ ضرور نہیں کہ لڑکیوں کو بھی اُسی قسم کی اور اُتنی ہی تعلیم دیجائے جو لڑکوں کو دیجاتی ہے۔ کیونکہ اُن کی ضروریات اور جسمانی حالات لڑکوں سے مختلف ہیں۔

۲۔ اگست جمعہ کو یہاں تعطیل ہوتی ہے۔ ہم نے بھی آج کے دن اوّل وقت تو چھٹی منائی۔ اور نمازِ جمعہ کے بعد اپنے معمولی مشاغلِ سیر کو شروع کیا۔ جامع بشکطاش میں دوگانہ ادا کیا گیا۔ موجودہ عہد سے پہلے چونکہ سُلطانِ وقت کبھی کبھی اس مسجد میں بھی رونق افروز ہوتے تھے۔ اِس لئے ایک خوبصورت جالی سنگِ مرمر کی لگاکر شاہی جائے نشست علیحدہ بنائی گئی ہے۔ ہم پہنچے ہی تھے۔ کہ امامِ مسجد تشریف لائے۔ زیب بر ایک نیچی سی اور ڈھیلی ڈھالی سبز عبا تھی۔ سر پر سبز عمامہ۔ اس کے گرد زرد رنگ کی ریشمی پٹی جو آپ کے دینی مرتبہ کی علامت تھی۔ امام صاحب کے خطبہ پڑھتے وقت بیچ بیچ میں جہاں مناسب ہوتا تھا حُفاظ بلکہ درود شریف وغیرہ نہایت پُرجوش لہجہ میں بآوازِ بلند دوہراتے جاتے تھے۔ مگر میری رائے میں سیدھا سادہ پُرانا اسلامی طریقِ خُطبہ خوانی زیادہ مؤثر ہے۔ نمازِ جُمعہ میں یہاں ایک نئی بات یہ دیکھی گئی کہ مسجد کے باہر مسلح افواجِ سُلطانی کے دستے برا جمائے کھڑے تھے۔ گو فوج کا بہت سا حصّہ شریکِ جماعت بھی ہوا۔

یہ مسجد ایک ساحلِ بحر کے بالکل قریب ہی واقع ہے۔ جہاں سے نماز پڑھ چکنے

کے بعد ہم نے ایک کشتی باہر جانے کے واسطے لی اور اس پر چڑھ کر ایک اگنبوٹ میں جا بیٹھے جو اُسکدار ایشیائی حصّہ قسطنطنیہ کو جا رہا تھا۔ اس دار الخلافہ کی سحر انگیز دلفریبیوں میں سے ایک یہ ہے کہ آپ یہاں کی ایک بُلندی پر سے دونوں برّاعظموں کو دیکھ سکتے ہیں۔ ایک تو ایشیا جس کو اپنے شاندار زمانہ ماضی پر ناز ہے۔ دُوسرے یورپ جو اپنے روشن زمانۂ حال پر فخر کرتا ہے۔ اِن دونوں کو سمندر کی ایک زبردست شاخ ایک دُوسرے سے جُدا کرتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس ناگوار جُدائی سے ملول ہوکر یہ دونو برّاعظم اب بھی ایک دُوسرے کو حسرت کی نگاہوں سے تکتے ہیں۔ ہمیں کشتی کے ذریعے یورپ سے ایشیا تک جانے میں آدھ گھنٹے سے زیادہ نہیں لگا۔ اور وہاں جاکر ہم نے دیکھا کہ قسطنطنیہ کی زندگی کا مشرقی پہلو یہاں مشرقیت کا اور بھی گہرا رنگ لئے ہُوئے ہے۔ حتّٰی کہ اسکدار کی گھوڑے گاڑیاں تک وضع قطع میں استانبول کی گھوڑے گاڑیوں سے مختلف ہیں۔ گو قسطنطنیہ میں ہر گاڑی کو اعرابہ اور گاڑیبان کو اعرابجی ہی کہتے ہیں۔ لیکن اصلی اعرابہ جو ایشیائی حِصّہ دار الخلافہ میں مستعمل ہے وُہ ہندوستان کے یکہ اور جدید طرز کی ایک گھوڑے والی بگی کے بَین بَین ہے۔ ہم نے دوپہر کا کھانا جس ریسٹوران میں کھایا وُہ بھی مشرق اور مغرب کا معجون مرکب تھا۔ یعنی بعض باتوں میں تو ہندوستان کے نانبائیوں کی دوکان سے مشابہ اور بعض میں بالکل نئے فیشن کے یوروپین ہوٹلوں سے ملتا جُلتا تھا۔ اس کے بعد ہم ایک اعرابہ میں سوار ہوکر شہر کو گئے۔ پھر نواح کے ایک قریہ میں جو حیدر پاشا کے نام سے موسوم ہے اور جہاں سے بغداد ریلوے شروع ہوتی ہے۔ اس ریلوے کی تیاری بغداد کی طرف بڑھنی فی الحال بوجہ کمی سرمایہ بند ہوگئی ہے۔ لیکن مَیں نے سُنا کہ اس نامکمل حالت میں بھی اس کا تیار شدہ

حصّہ اِتنا ہے کہ اُس پر دو روز کا خاصہ لمبا سفر ہو سکتا ہے۔ مگر یہ ملحوظ رہے کہ ٹرکی ہیں
ریلوں کی رفتار کچھ ایسی تیز نہیں ہوتی۔ اِس لئے یہ مسافت اصل میں دو دن سے کم کی
مسافت ہی۔ ریلوے سٹیشن بڑا وسیع ہی اور اس کی وجہ سے وہاں ایک بڑی ساری
جرمن نو آبادی قائم ہو گئی ہے اور میرا خیال ہے کہ جُوں جُوں لائن آگے بڑھتی جائیگی
اسی قسم کی اَور بھی نو آبادیاں ضرور لائن کے اس سرے سے اُس سرے تک پڑتی
جائینگی۔ اس ریلوے کے ملازم ایشیاٹک ٹرکی میں بھی قریباً سارے کے سارے جرمن
ہیں اگرچہ وُہ ترکی ٹوپی پہنتے ہیں۔ مَیں نے سُنا کہ اُن میں سے بعض اہل جرمنی اس
ریلوے لائن کے کنارے کنارے عمارتیں بنانے کے لئے زمینیں خرید رہے
ہیں اور وُہ زمینیں انکو خاصی سستی مل جاتی ہیں۔ کیونکہ اس علاقہ کے باشندے
خود تو ان اراضیات کی آئندہ قدر و قیمت نہیں جانتے یا اُن پر روپیہ لگانے کی مقدرت
اور فائدہ اُٹھانے کا حوصلہ نہیں رکھتے۔ یہ مَیں سمجھتا ہُوں کہ اس لائن سے مُلک
کی مادّی ترقی کو ضرور بڑا فائدہ پہنچیگا اور آمد و رفت یا کاروبار تجارت کے حق میں
بہت کچھ سہولت پیدا ہو جائے گی۔ لیکن کچھ بھی ہو یہ مَیں ضرور کہونگا کہ قلمروئے عُثمانیہ
کے اس حصّہ میں جرمن لوگوں کا اِس طرح چُپکے چُپکے قدم جماتے جانا مجھے بخیالِ
دُور اندیشی کچھ اچھا معلوم نہ ہُوا۔ کیونکہ گو اسوقت ٹرکی اور جرمنی کے تعلقات دوستانہ
ہوں مگر آیندہ آپس میں غیر متوقّع پیچیدگیاں پیدا ہو جانے کا ضرور احتمال ہی۔

قریہ حیدر پاشا کے قریب ہم نے معدنی پانی کا ایک ذخیرہ دیکھا جہاں کا پانی
ایک قُدرتی چشمہ سے جمع ہو کے بکتا ہے اور اس کا نفع ایک شفاخانہ کو ملتا ہے۔ پاس
ہی ایک تُرکی تھیٹر کا چوبی پنڈال بھی بنا ہُوا تھا۔ ہم اُس میں جا گھُسے۔ ناٹک کے

تماشے تو یہاں تُرکی زبان میں ہوتے ہیں مگر انتظام ارمنی لوگوں کا ہی۔ اور ایکٹر بھی اُنہی کے ہیں۔ ہمارے گائڈ نے تھیٹر کے منیجر سے اجازت لے لی اور ہم نے تھوڑی دیر تماشا دیکھا۔ تھیٹر کا ہال تماشائیوں سے بھرا ہُوا تھا۔ ایک بھی نشست خالی نہ تھی۔ تماشائی جو بیشتر تُرک تھے بڑی محویت سے کھیل کے مزے لے رہے تھے۔ ایکٹروں کی زبان سے ہم گو نابلد تھے۔ مگر پھر بھی جس سین کے شروع میں ہم نے اندر قدم رکھا تھا اُس کے ختم ہونے پر ہی وہاں سے اُٹھے۔ اپنے دِل میں اَور کچھ نہیں تو اسی خیال سے خوش تھے کہ چلو تُرکوں کی زندگی کے اس پہلو کی بھی ایک جھلک تو دیکھ لی۔ اس ہال میں ایک گیلری تُرکی خواتین کے لیے بھی تھی مگر اس میں عورتیں موجود نہ تھیں۔ ہم نے اس کا سبب پُوچھا تو بتلایا گیا کہ تھوڑے عرصہ سے اعلیٰ حضرت سُلطان المعظم نے مرد عورتوں کو ایک ساتھ تماشا دیکھنے کی ممانعت کر دی ہے اور اب خواتین کے لیے ایک خاص دِن مقرّر ہے جس میں سب عورتوں کے لئے تماشا ہوتا ہے۔ ہم تماشاگاہ سے نکلے تو شام ہونے کو تھی۔ ہم نے پھر ایک کشتی لی اور وُہ دِن ایشیا میں گذار کر یورپ واپس جانے کے لیۓ اس میں سوار ہو گئے۔

۴۔ اگست | جس چٹھی میں ہم نے برٹش سفیر سے مُلاقات کی خواہش ظاہر کی اس کا یہ جواب ہمیں مل ہی چکا تھا کہ ہز اکسلنسی سر نکولس اوکونر بالقابہ ۴۔ اگست کو مجھ سے اور شیخ مشیر حسین سے ملینگے۔ اس کے مُطابق ہم دونو دس بجے صُبح کے تراپیہ کو روانہ ہُوئے جہاں سفیر ممدوح رہتے ہیں۔ یہ مقام کشتی کے رستہ گھنٹہ بھر کی مسافت پر تھا جسے ہم نے بڑے لُطف سے طے کیا کیونکہ قریبًا آدھی دُور تو ہمیں دو دریہ

خوبصورت عمارتیں ہی عمارتیں نظر آتی رہیں۔ یعنی بحیرہ مارمورا کے اس پہلو میں یوروپین
سین اور اس طرف ایشیائی منظر۔ اور سچ پوچھو تو یورپ کی جانب تو شاندار شاہی
عمارتوں کا سلسلہ اخیر تک برابر چلا گیا تھا۔ ان میں بڑی بڑی عمارتیں تو زیادہ تر
سلاطینِ عثمانیہ کے محلّات ہیں۔ جن کے بیچ میں کہیں کہیں بعض اُمراء کے مکان بھی
آ گئے ہیں۔ محلوں کا ایک سلسلہ دیکھا جس کے گرداگرد باغات لگے ہوئے ہیں۔
یہ فرمانروایانِ مصر کے قصر ہیں۔ جب ہم ترابیہ پہنچے تو ہمیں سامنے سے سفارت خانۂ
برطانیہ کی عظیم الشّان عمارت دکھلائی دی۔ جس کے متعلّق ایک نفیس و موزون باغ
ہے اور سمندر کے بالمقابل اس کا دلکش رُخ ہے۔ ہمارا کارڈ پہنچتے ہی ہز ایکسلنسی
نے ہمیں اندر بلا لیا اور بڑے تپاک سے ملے۔ حجاز ریلوے کے بارہ میں جہاں
اور بہت سی باتیں ہوئیں اُنہی میں آپ نے یہ خیال ظاہر فرمایا کہ اس لائن پر چونکہ
زیادہ تر آمد و رفت سال کے صرف دو مہینوں میں رہیگی اس واسطے مالی پہلو سے
اس میں خاطر خواہ کامیابی مشتبہ معلوم ہوتی ہے۔ میں نے عرض کیا کہ جب ریل
موجود ہوگی تو آمد و رفت آپ سے آپ ہونے لگیگی۔ اور بڑھتے بڑھتے کچھ عرصہ میں
لائن کے نفع بخش ہو جانیکی توقع بھی بعید از عقل نہیں۔ اگرچہ اس کے اجراء کا
مُدعا مالی منفعت نہو۔ لنچ کے وقت ہز ایکسلنسی نے از راہِ عنایت ہمیں اپنے
ساتھ کھانے میں شریک ہونے کی عزّت بخشی۔ اور بیچ کے وقتِ فرصت میں
فرمایا کہ اتنے کھانے کا وقت ہو گاڑی پر سوار ہو کر بطورِ تفریح و تفنّن اِدھر اُدھر کا
چکّر لگا آیئے۔ چنانچہ ۱۲ بجے ہم جنابِ ممدوح سے رخصت ہو کر چل دیئے اور قریباً گھنٹہ
بھر تک سیر کر کے واپس آئے۔ سمندر کے کنارے کنارے میلوں تک آبادی

ہی آبادی چلی گئی ہے یعنی ساحلِ بحر کے متصل تو برابر برابر مکانوں دوکانوں کی قطار ہے اور انکی پشت پر پہاڑیوں کا سلسلہ گویا دیکھنے والے کے لئے یہ ایک عجیب دلکش اور نظر فریب تصویر کا سا منظر ہے۔ لنچ کے وقت تک ہم واپس آگئے اور لیڈی اوکونر صاحبہ سے شرفِ تعارف حاصل ہؤا۔ کھانے کے بعد سہ پہر کا وقت بالکل سوشیل ذکر اذکار اور لطفِ صحبت میں گذرا۔ اثنائے گفتگو میں ہز اکسلنسی نے اعلیٰحضرت سُلطان المعظّم کی ہمّتِ مردانہ اور عالی حوصلگی کی بہت کچھ تعریف کی۔

۵۔ اگست | اتوار کا دن ہم نے سفارتخانہ ایران میں گذارا۔ کیونکہ یہاں آج شاہِ عالیجاہ کی سالگرہ تھی جس میں ہم مدعو کیئے گئے تھے۔ دوپہر کو بہت سے ایرانی جمع ہُوئے جو قسطنطنیہ میں رہتے ہیں۔ یہ امر موجبِ دلچسپی ہی کہ اس جگہ ایرانی لوگوں کی خاصی آبادی ہے۔ یہ لوگ تجارتی کاروبار میں اچھی خوشحالی سے بسر کرتے ہیں۔ اور شہر کا ایک حصّہ اُن کے لئے مخصوص ہی۔ جہاں وُہ اپنی رسوم محرم بلا روک ٹوک ادا کرتے ہیں۔ ایرانیوں کے عمائد نے شاہِ کجکلاہ کی رسمِ تہنیت ادا کی۔ اور سفیر صاحب نے اس مُبارک تقریب میں شامل ہونے پر انہیں مبارکباد دی۔ اور اس موقعہ پر ہماری موجُودگی پر خاص مسرّت کا اظہار کیا۔ جس پر مجھے جنابِ ممدوح کی اجازت سے آنجناب کے عنایت آمیز الفاظ کا جواب دینے کا موقعہ ملا۔ میں نے فارسی میں مختصر سی تقریر کی اس کا ماحصل یہ تھا کہ معزز حاضرین! مَیں آپ کو اس بات پر تہِ دل سے مُبارکباد دیتا ہُوں کہ آپ کو دار الخلافت عثمانیہ میں اس طرح آزادی کے ساتھ اپنے شاہ عالیجاہ کی سالگرہ منانے کی جو اجازت حاصل ہے یہ دولتین کے اتّحاد اور دوستانہ تعلقات کی دلیل ہے۔ جس پر ہم ہندوستان میں خوش ہؤا

کرتے تھے۔ کیونکہ اسلامی اخوّت کا رشتہ قومی ہمیں دونوں سلطنتوں کی ہمدردی
ومحبت پر مجبور کرتا ہے۔ اور یہی ہمدردی اُس حیرتناک طاقت کا پتہ دیتی ہے
جو اسلام نے اپنے پیروؤں کو عطا کی ہے۔ لیکن افسوس کہ ہم اُسے کماحقہ ملحوظ نہیں
رکھتے۔" پرنس ارفع الدولہ نے چند موزون اور مناسبِ موقع الفاظ میں اس کا
جواب دیا اور حاضرین نے بھی ان خیالاتِ اتّحاد پر مسرّت اور طمانیت کا اظہار
کیا۔ آج کی شام اور بھی زیادہ لُطف میں گذری۔ سفارت گاہ کی عالیشان عمارت
میں چراغاں کیا گیا۔ باہر ٹرکی فوجی بینڈ نے شادمانی کے گیت گائے۔ نہایت
نفیس وقیمتی اور اعلیٰ سے اعلیٰ کھانوں کا ڈنر دیا گیا جس میں سفارت گاہ کے اہلکار
ایرانی قونصل جنرل۔ بعض ممتاز تجّار ایران۔ اور چند منتخب مہمان اور بھی شامل
تھے۔ یہاں ہمیں ایران کے ایک دو خاص کھانے بھی کھانے کا اتّفاق ہوا۔
بینڈ باجہ ابھی حمیدیہ مارچ اور مظفّریہ مارچ باری باری بجا ہی رہا تھا کہ یہ مزے
کی شام اختتام کو پہنچی۔

میری اس تقریر کے ذراسے واقعہ نے ہم پر اچھی طرح واضح کر دیا کہ یہاں تحریر و
تقریر کی نگرانی کے معاملہ میں محکمہ سنسر کے اختیارات کس قدر وسیع ہیں۔ اگلی صبح
کو بعض اخباروں نے جو تقریب سالگرہ کے ضمن میں اس اسپیچ کا ذکر کرتے ہوئے
چند کلماتِ خیر اتّحاد بین المسلمین کی تائید میں بھی لکھدیئے تو مَیں نے سُنا کہ سنسر
صاحب نے انہیں کاٹ دیا۔ کیونکہ یہاں مُسلمانوں کے اتّحاد پر مضامین شائع کرنیکی
ممانعت ہے کہ کہیں ایسا نہو دولِ یورپ کو یہ خیال گذرے کہ ٹرکی حکّام دیگر ممالک مُسلمانوں
کو عیسائیوں کے خلاف اُبھارتے ہیں۔

۶- اگست | کل ہمارا سفارت گاہِ ایران میں جانا اور شاہِ کجکلاہ کی سالگرہ میں شریک ہونا قسطنطنیہ کے بڑے بڑے ایرانی تجار کے ساتھ ہمارے تعارف اور مُلاقات کا باعث ہوگیا۔ اور اُن میں سے مرزا محسن اصفہانی اور حاجی زین العابدین نام دو احباب ہم سے ملنے ہوٹل تشریف لائے۔ مرزا صاحب کو گورنمنٹ ایران کی طرف سے معتمد تجار کا خطاب مِلا ہوا ہے۔ اور یہ دونو کے دونو بڑے معقول پسند اور ضروریاتِ زمانہ سے آگاہ ہیں۔ بہ تقاضائے قومی حمیت انہوں نے ایرانی بچّوں کی تعلیم کے لئے ایک سکول بھی کھول رکھا ہے۔ ایران کے مستقبل کے متعلق ان کے خیالات مایوسانہ نہیں اُنہوں نے یہ بھی فرمایا کہ جو آزادانہ تعلیم مُسلمانانِ ہند کو مل رہی ہے اس سے ہمیں بڑی بڑی توقعات ہیں۔

۷- اگست | آج کاردن ہوٹل کے قریب ایک اَور مکان میں جو ذرا زیادہ آرام دہ اور ہماری ضروریات کے مناسبِ حال تھا۔ نقل مکان کرنے میں گذرا۔ اِس تاریخ میں کوئی امر خصوصیت سے قابلِ ذکر نہیں۔

۸- اگست | اپنے سرکاری گائڈ اور ایک افسر پولیس کے ساتھ ہم جامع ایاصوفیہ کو گئے اور وہاں بڑی دیر تک رہے۔ اس کے بعد عدالت عالیہ میں پہنچے۔ جہاں ہمیں تمام عمارات متعلّقہ دکھلائی گئیں۔ لیکن اُسوقت کچہری کا کام ختم ہوچکا تھا۔ اور ہم سے کہا گیا کہ فصلِ مقدمات کی کیفیت مُلاحظہ کرنی ہو تو پھر کسی روز تشریف لائیں۔ اس جگہ عزتلو احمد بیگ مشیرِ عدالت سے جو چیف جسٹس سے دُوسرے درجہ پر ہیں۔ مُلاقات ہُوئی۔ آپ علمِ دینیات کے بڑے بھاری فاضل ہیں۔ عُلمار کا لباس پہنے ہُوئے تھے۔ مُسلمانانِ ہند کی نسبت فرمانے لگے کہ قدیم علومِ دینیہ کی حفاظت و

اشاعت کے متعلق اُنکی مساعی جمیلہ واقعی قابلِ داد ہیں۔ مثنوی مولانا رومؔ کا جو خوبصورت اڈیشن حال ہیں کانپور سے شائع ہُوا ہے۔ اس کا ایک نسخہ آپ کے مُلاحظہ سے گذر چکا تھا اس کی تعریف کرتے رہے۔ ہم یہاں سے عزتلو شکری بے کے کمرہ میں گئے اور اُنکی فضیلت علم دوست طبیعت اور بےتصنّع خوخصلت سے اپنی طبیعت پر بہت اچھا اثر لیکر نکلے

پھر ہم وُہ فوّارہ دیکھنے گئے جسے قیصرِ ولیم شہنشاہ جرمنی نے اپنے سفرِ استانبول کی یادگار میں نصب کرایا ہے۔ اس فوّارہ کے سامنے قدیم تُرکی پوشاکوں کا عجائب خانہ ہے۔

۹۔ اگست آج ہم نے مسجد "جامع شاہزادہ" دیکھی جسے سُلطان سلیمان عالیشان نے ۱۵۴۳ء میں اپنے بیٹے شاہزادہ محمد کی یادگار میں تعمیر کرایا تھا۔ یہ شاہزادہ ایک ہونہار نوجوان تھا۔ عین عالم شباب میں بعمر ۱۸ سال فوت ہوا۔ اور اس مسجد کے صحن میں ہی مدفون ہے۔ مقبرہ کی دیواروں پر خوشرنگ روغنی اینٹیں لگی ہیں۔ مقبرہ کے اندر ایک نہایت خوبصورت منقّش قرآن مجید رکھا ہے جسے شہزادہ مرحوم نے اپنے ہاتھ سے لکھنا شروع کیا تھا۔ مگر افسوس کہ پیغامِ اجل نے اُسے مکمل نہ کرنے دیا۔ مسجد سے ہم عمارتِ سرعسکرت کے سامنے والے میدان میں آئے جو قسطنطنیہ کی نہائت دلکش اور شاندار عمارتوں میں ہے۔ پھر یہاں سے اُس مشہور بازار میں پہنچے جسے برستان کہتے ہیں اور جو اپنی خوبصورتی اور دلاویزی میں عدیم النظیر ہے۔

۱۰۔ اگست تُرک اپنی تعطیل کے دنوں میں چھٹی منانے اور اُن میں سیر کا لُطف اُٹھانے کے اعتبار سے اپنے ہمسایہ یوروپینوں سے کچھ کم شوقین نہیں ہیں۔ اس لئے جمعہ کا دن یہاں ایسے ہی مشاغل کے لئے مخصوص ہے۔ اُس روز تمام آدمی مع اپنی خواتین کے بطورِ سیر جنگلوں سبزہ زاروں وغیرہ کی طرف نکلجاتے ہیں۔ ہم نے بھی آج کے لئے

جلال اُنسی بے کے ساتھ قرار داد کی تھی کہ ایک نظر جاکر دیکھینگے کہ لوگ کیونکر تعطیل مناتے ہیں۔ پس ہم مقری کوئی کی طرف روانہ ہوئے۔ اور وہیں نیم مغربی فیشن پر ناشتہ کیا۔ وہاں سے فلوریہ کو گئے اور لوٹتے ہوئے سینٹ سٹیفانو کو دیکھا۔ یہ وُہ مقام ہے جہاں تک رُوسی سپاہ پچھلے جنگ رُوس و رُوم میں پہنچی تھی۔ یہاں ایک یادگاری مینار بھی بنا ہے، جو تاریخ ٹرکی کے اس افسوسناک واقعہ کو یاد دلاتا ہے اور رُوسیوں نے بہت عرصہ تک درخواست کرتے رہنے کے بعد آخر اُس کے بنانے کی اجازت لے لی تھی۔ فلوریہ میں ہم نے بہت سے عثمانیوں کو دیکھا کہ بال بچوں سمیت موجود ہیں۔ اور مرد عورتیں بچے سب درختوں کے سایہ میں چپ چاپ بیٹھ کر پھل ترکاری اور میوے وغیرہ کھا رہے ہیں۔ اکثر لوگ سامانِ تفریح شہر سے ہی باندھ لیجاتے ہیں۔ ان کے اِس مشغلہ اور دِل بہلاؤ میں ہم نے وہ چھچھورپن اور خفیف الحرکتی نہیں دیکھی جو اقصائے مغرب کی تعطیلوں اور سیر تفریح کی پارٹیوں میں نظر آتی ہے۔ بلکہ بجائے انکے ایک سنجیدگی اور متانت پائی جاتی تھی جو مجھے قابلِ تقلید معلوم ہوئی۔ گویا ترکوں کا مقصد اِس طرح تعطیل منانے سے صرف یہ ہوتا ہے کہ آٹھویں دن تفکرات و مکروہاتِ دُنیوی سے ذرا یکسوئی میں آرام پالیا کریں اور بس۔

اس سَیر سے واپس آکر شام کو یہ رنج دہ خبر سُننے میں آئی کہ آج حضرت سُلطان المعظم کی طبیعت اس قدر ناساز تھی کہ نمازِ جمعہ میں بھی تشریف نہ لا سکے جس سے بڑی تشویش پیدا ہوئی کیونکہ معتبر ذرائع سے معلوم ہوا کہ گذشتہ تیس سال کے عرصہ میں ایک بار بھی ایسا نہیں ہوا کہ اعلیٰ حضرت رسمِ سلامق میں رونق افروز نہ ہو سکے ہوں۔

۱۱- اگست: آج صبح کو سلطان المعظم کی صحت کے بارے میں اور بھی پریشان خبریں سنی گئیں اخباروں کو دیکھا تو اس کے متعلق بالکل ساکت تھے کیونکہ انہیں محکمہ نگرانی کی طرف سے کسی قسم کی اطلاعات شائع کرنے کی سخت ممانعت ہو چکی تھی اور اسی لئے لوگوں میں طرح طرح کی زبانی افواہیں بڑی آزادی سے گشت لگا رہی تھیں - آج قسطنطنیہ کے محکمہ نگرانی اخبارات کی سختی کا حد سے زائد ہونا ہمارے ذہن نشین ہو گیا سلطان المعظم کی بیماری کی خبر استنابول میں اسوقت شائع ہوئی جب وہ صحت پا چکے اور اخباروں میں یہ چھپا کہ ذرا علیل ہو گئے تھے - مگر اب بالکل اچھے ہیں - اس صحت یابی کی خبر پر جو خوشی عام طور پر ظاہر ہوئی - اس سے معلوم ہوا کہ رعایا اپنے بادشاہ کی کیسی عقیدت کیش و خیر اندیش ہے - اگر اعلیحضرت کی اس علالت کا ذکر اخباروں میں چھپتا اور لوگوں کو وقت پر سب حال معلوم ہو جاتا تو خدا جانے کس جوش و خروش سے اظہارِ وفاداری کیا جاتا اور کیسے خشوع و خضوع سے صحت کی دعائیں مانگی جاتیں - لیکن یہاں تو رعایا بیچاری کو اصل صورتِ حال کا پتہ ہی نہیں لگنے دیا گیا - حتیٰ کہ اس پر تشویش وقت میں جبکہ باہر کی دنیا اخباری پیغاماتِ تار کے ذریعہ سے اس خبر کو سن چکی تھی اور آیندہ کی نسبت گرما گرمی سے بحثیں بھی ہونے لگی تھیں - اسوقت مستقرِ خلافت میں سلطانی رعایا کے کانوں تک گویا اس کی بھنک بھی نہیں پڑی تھی اور اسی لئے افسر اور رعایا اندر ہی اندر ایک دوسرے سے سرگوشیاں کرتے اور چپکے چپکے ہی اعلیحضرت کے لئے دعائیں مانگتے تھے - آخر کئی روز بعد ۱۴ اگست کو لوکل پرچوں میں سلطان المعظم کی کامل صحتیابی کا اعلان ہوا اور رعایا کی پریشانی رفع ہوئی -

ہم پھر ایک مرتبہ عدالتوں کو دیکھنے گئے۔ ایک میں تو استغاثہ کی سماعت ہو رہی تھی اور دُوسری میں اپیل کی۔ آخر الذکر عدالت کے سامنے ایک وکیل بزبانِ تُرکی وکالت کر رہا تھا جس کی پُر زور تقریر اور طلاقت و فصاحت بڑی موثر معلوم ہوتی تھی۔ ہم نے سُنا کہ اس وکیل نے قسطنطنیہ کے مکتبِ حقوق (یعنی کالج قانونی) میں تعلیم پائی ہے۔ یہاں سے ہم کچھ اَور معابد و مساجد کی سیر کرنے گئے اور پہلے جامع لالائی جا کر دیکھا۔ پھر والدہ جامع کو جو سُلطان عبد العزیز کی والدہ نے تعمیر کرائی تھی۔ بعدہٗ مشہور جامع فاتح کو جو سُلطان محمد فاتح کی یادگار ہے اور اسی میں اُنکا مرقد بھی بنا ہُوا ہے۔ ہم نے یہاں ایک اَور قدیم یادگار بھی دیکھی جو یدی قُلّہ کے نام سے مشہور ہے۔ یہ ۱۴۵۸ء کے بنے ہُوئے سات بُرج ہیں جنہیں شاہی قیدی نظر بند ہُوا کرتے تھے مگر اب اُن سے یہ کام نہیں لیا جاتا ہو۔ قسطنطنیہ کی قدیم فصیلوں اور آدرنہ دروازہ کے قریب ایک چھوٹی سی مسجد ہے جو بلحاظِ فنِ عمارت کے عجیب کاریگری کا نمونہ ہے۔ کسی زمانہ میں یہ ایک یونانی کلیسا تھا۔ اُسوقت اسکو کلیسا مریم کہتے تھے اور اب قعریہ جامع کے نام سے مشہور ہے۔ شاید اس لئے کہ اس کی زمین ذرا نشیب میں واقع ہے۔ اُس زمانہ میں اس کے اندر فرشتوں اور مذہب عیسوی کے بزرگوں کی مورتیں دیواروں پر بنی ہُوئی تھیں اور انجیل کے عہد جدید و عہدِ عتیق دونو کے منظر پچی کاری کے بنے ہوئے تھے۔ اب اندر کی مورتیں تو ڈھانک دی گئی ہیں لیکن اس حصّہ میں جس میں نماز نہیں ہوتی۔ تصویریں ابتک محفُوظ ہیں اور یورو پین سیاح انہیں نہایت شوق سے دیکھنے آتے ہیں۔ اُن کا ابتک محفوظ رہنا ایک ایسے معبد میں جہاں خُدائے واحد کی پرستش ہوتی ہو۔

مذہبی نقطۂ نظر سے تو ایک غیور مسلمان کے نزدیک محلِّ تعجب ہو لیکن فنونِ لطیفہ اور آثارِ قدیمہ کے قدر دانوں کی نظر میں مغتنمات سے ہو۔ یہاں اب نماز تو اُس جگہ پڑھی جاتی ہے جو اگلے وقتوں میں قلب کنیسہ تھی اور وہاں مورتوں والا حصّہ ڈھکا رہتا ہو۔ پھر بھی یہ دُنیا بھر میں غالبًا ایک ہی مسجد ہے۔ جہاں مورتیں دیکھنے میں آسکتی ہیں اور جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ٹرکی گورنمنٹ اپنی عیسائی رعایا کے مذہبی احساسوں کا پاس خاطر ملحوظ رکھنے میں کیسی بُردبار رہی۔

۱۲-اگست | اس تاریخ میں کوئی خاص بات قابلِ تحریر نہیں۔

۱۳-اگست | آج ہم مشہور اطالین مصوّر موسیو زونارو کا کارخانہ دیکھنے گئے جو خاص اعلیٰحضرت کا کاریگر ہے۔ یہاں علاوہ اور بہت سی چیزوں کے ایک تصویر ٹرکی و یونان کے میدان کارزار کی نظر آئی۔ جس میں اس نامور مصوّر نے اپنے کمال کے جوہر دکھائے ہیں۔ یہاں سے فارغ ہو کر ہم ایک نامکمل مسجد کو دیکھنے گئے جسے سُلطان عبدالعزیز مرحوم نے بنوانا شروع کیا تھا مگر افسوس کہ اُنکی مرگِ ناگہاں نے اس کی تکمیل کی نوبت نہ آنے دی۔ اس مسجد کے لئے اُنہوں نے بہت اُونچی جگہ تجویز کی تھی۔ جہاں سے آبنائے باسفورس اور نیز شہر کی سیر بخوبی ہو سکتی ہے۔ اگر یہ عمارت مکمّل ہو جاتی تو شاید قسطنطنیہ بھر میں سب سے زیادہ خوش منظر مسجد ہوتی۔

۱۴-اگست | آج صبح کے اخبارات میں سُلطان المعظّم کی بحالی صحت کا ذکر تھا۔ ہم بڑے بڑے بازاروں کی سیر گشت کو ایک بار پھر نکلے۔ اور اُسی روز مسجد جامع سلطان بایزید کی زیارت کو تیسری مرتبہ گئے جہاں بھولے بھولے پیارے پیارے کبوتروں کے جھلّڑ کے جھلّڑ رہتے ہیں۔ آخر میں جامع سلیمانیہ کی باری آئی جو

سُلطان سُلیمان کے زمانہ کی یادگار ہے اور ابتک اچھّی حالت میں ہے۔

۱۵۔ اگست

قسطنطنیہ کے قریب چھوٹے چھوٹے جزیروں کا ایک دلفریب مجمع ہے۔ جنہیں پرنس آئیلینڈز (جزائر شہزادگان) کہتے ہیں۔ منجملہ اُنکے ایک جزیرہ ہلکی بہ تُرکی بحری کالج کی وجہ سے مشہور ہے۔ دُوسرا جسے پرنکیپو کہتے ہیں۔ اپنی خوش وضع عمارات اور خوبصورت مناظر کے باعث زیادہ تر دلکش ہے۔ دوپہر کو کشتی میں بیٹھ کر آخرالذکر جزیرہ کی سیر کو چلے اور گھنٹہ بھر سے کچھ زیادہ میں اوّل جزیرہ پر جاکر ٹھہرے۔ مگر یہاں خشکی پر نہ اُترے۔ بدیں خیال کہ اس کی سیر اُس وقت کرینگے جب وزارت بحریّہ سے کالج مذکور کے دیکھنے کی اجازت ملجائیگی۔ جب ہم سے واپس آرہے تھے تو کثیر التعداد نوجوان جنٹلمین ہلکی کے بحری کالج سے ہمارے سٹیمر کی طرف آئے اور اس میں سوار ہو گئے۔ چونکہ ہم سُن چکے تھے کہ بحری کالج میں انگریزی پڑھائی جاتی ہے اور گو اس دارالخلافہ میں عام رواج فرانسیسی کا ہے لیکن صیغہ بحری کی سرکاری زبان انگریزی ہی رکھی گئی ہے۔ اس لئے میرے رفیق نے اُن نوجوانوں میں سے ایک سے انگریزی میں بات چیت شروع کی۔ ہم نے اُسے کہا کہ ہم سیّاح ہیں اور آپ کا بحری کالج دیکھنا چاہتے ہیں۔ کسی دن آئینگے اُس نے کہا کہ آپ کی تشریف آوری ہم سب کے لئے موجب مسرّت ہوگی لیکن آپ یہ توقع نہ رکھیں کہ ہمارا کالج اپنی قسم کے ان درسگاہوں کی برابری کرے جو آپ انگلستان میں دیکھ چکے ہونگے۔ تاہم ہمارا سہارا اس اُمید پر ہے کہ ہمارا بحریّہ پھر ایک دن عُمدہ ہو جائیگا جیسا کہ پہلے رہ چکا ہے"۔ اُس نے بیان کیا کہ میں قریبًا پانسو طالب علم ہیں اور وہ سب کے سب یا انگریزی جانتے ہیں۔ یا ف

اور نصابِ تعلیم میں علومِ عام کی تدریس کے ساتھ بحری کام کی ٹکنیکل تعلیم دیجاتی ہے جسکے لئے زمانۂ قیامِ کالج کے اخیر دو سال رکھے گئے ہیں۔

۱۱۔اگست آج ہم غلطہ سرائے کا مکتبِ سلطانی دیکھنے گئے۔ لیکن افسوس کہ اندنوں تعطیلِ کلاں کے باعث سارے مدارس بند ہوتے ہیں۔ اِسواسطے اُنکو پوری رونق کی حالت میں نہ دیکھ سکے۔ مگر پھر بھی ان مدرسوں میں تعلیم کا کام جیسا عموماً ہوتا ہے اس کا اندازہ کرنے کا ہمیں خاصہ موقع مل گیا۔ اس مدرسے میں طلبہ کی تعداد اچھی ہے۔ اکثر طلبہ ایسے ہیں جو یا تو یتامیٰ ہیں یا وُہ جنکے ورثا، اس قدر مستطاعت نہیں کہ انکے مصارفِ تعلیم برداشت نہیں کرسکتے۔ اِس لئے انہیں بصیغہ ناداری کھانا بھی وہیں سے ملتا ہے اور فیس بورڈنگ وغیرہ بھی معاف ہے۔ مکتبِ سلطانی میں ایسے غریب طالب علموں کی بڑی معقول تعداد ہے اور وُہ اُس وقت بھی مدرسہ میں موجود تھے۔ ہم نے انہیں بسرگرمی وتندہی نوشت وخواند کے کام میں مصروف پایا۔ اس مدرسہ میں کُل ہزار کے قریب طلبا ہیں جن میں سے آٹھ سو بورڈر ہیں اور باقی ایسے جو پڑھنے آتے ہیں اور رات کو اپنے اپنے گھروں کو چلے جاتے ہیں۔ عمارت مدرسہ میں ایک مسجد بھی تھی۔ ہم نے اُسے اندر سے جاکر دیکھا۔ امام صاحب اُسوقت وہاں تشریف رکھتے تھے۔ میں نے اُن سے دریافت کیا کہ کیا یہاں طلبہ نماز کے پابند ہیں؟ اُنھوں نے فرمایا ہاں اکثر پابند ہیں"۔ میں نے پُوچھا جو نماز نہ پڑھیں کیا اُنہیں کسی قسم کی سزا بھی دیجاتی ہے؟ بولے نہیں۔ کیونکہ ایسی جبری نماز سے کچھ فائدہ نہیں ہوتا"۔ یہ مدرسہ یورپ کے ایسے ہی درسگاہوں سے خاصہ برابری کرسکتا ہے۔

اور طلبہ کے طریقِ رہائش میں اُن سے بہت کچھ مشابہ ہے۔ لیکن ایک خاص بات ہم نے یہاں ایسی پائی جو اَور کہیں نہ دیکھی تھی۔ یعنی یہ کہ عمارتِ مدرسہ کے پھاٹک پر چند جوانوں کا ایک فوجی گارد ہر وقت تعینات رہتا ہے۔

مدرسہ مذکورہ کے بعد ہم ایک اور اس سے بھی زیادہ دلچسپ انسٹی ٹیوشن کو دیکھنے گئے۔ یعنی بچّوں کا ہسپتال جس کا مفصل ذکر گذشتہ اوراق میں درج ہو۔

۱۷۔ اگست | آج کا مُبارک دِن ایک مقدّس مقام کی زیارت میں گذرا جسے جامع ابُوایوب انصاری کہتے ہیں۔

۱۸۔ اگست | آج ایک تُرک دوست کے ہاں کھانا کھانے کا اتفاق ہوا۔ جہاں کھانے کے بعد دو اور مہمانوں کے ساتھ بات چیت ہوتی رہی جو مصر سے آئے ہیں۔ اور عربی بولتے تھے۔ وُہ اپنے خیالاتِ مذہبی میں بہت پکّے نظر آئے اور پُرانی وضع کے صاف دِل مُسلمانوں کا نمونہ تھے۔

۱۹۔ اگست | آج علی الصّباح ہزہائی نس فرید پاشا کا ایک خاص قاصد آیا۔ کہ پاشائے ممدوح آپ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ اِس لئے آپ صبح کے دس بجے اُن کے ہاں تشریف لائیں۔ ہم اُن کے دولتخانہ پر گئے۔ وہاں ہمیں اُنکے کمرۂ ملاقات میں پہنچے چند ہی منٹ گذرے تھے کہ وُہ برآمد ہُوئے اور ہمیں مژدہ دیا کہ اعلیحضرت خلافت پناہی نے آپ کو سلام دیا ہے اور نشانِ عثمانی آپ دونو کو عطا فرمایا ہے۔ اِس پر ہم نے اُنکا شکریہ ادا کیا اور اپنے مکان پر واپس آئے۔

۲۰۔ اگست | آج ہم نے دار العجزہ دیکھا۔ اور اسے دیکھ کر بہت متاثر ہُوئے۔

۲۱۔ اگست | ہمارا پروگرام آج عزّت پاشا سیکرٹری حضرت سلطان المعظم و پریزیڈنٹ

حجاز ریلوے کمیشن کی ملاقات سے شروع ہوتا تھا۔ چنانچہ ہم قصر یلدیز کو گئے کہ پاشائے ممدوح سے نیاز حاصل کریں۔ چونکہ وہ اُس وقت حضورِ سلطانی میں پہنچنے کے لئے بعجلت تیار ہو رہے تھے اِسواسطے بہت مختصر سی ملاقات ہوئی۔ جس کے دَوران میں آپ نے ہمیں حجاز ریلوے لائن کی عکسی تصاویر کے دو نفیس البم دکھلائے اِن تصویروں میں اس مقدس ریل کی گاڑیاں۔ انجن۔ لائن۔ پل۔ سٹیشن اور اِفتتاح شدہ حصص پر سے ٹرینوں کی آمد و رفت وغیرہ سب چیزیں بڑی عمدگی وصفائی سے دکھلائے گئے ہیں۔ لائن کے مختلف حصّوں کی رسمِ افتتاح کے بھی فوٹو تھے۔ جن میں عمّالِ سرکاری۔ علمائے کرام۔ روسائے عظام اور عام افراد رعایا کے ٹھٹ کے ٹھٹ اپنے اپنے موقعہ پر ایک شانِ خاص سے کھڑے نظر آتے ہیں۔ تماشائیوں کا ہجوم ہے کہ نقشِ حیرت بنا اعجوبہ ریل کو تک رہا ہے۔

عزت پاشا۔ عمّالِ قسطنطنیہ میں ایک نہایت محنتی و ہوشیار شخص ہیں۔ آپ کا قد میانہ یا اُس سے کچھ کم ہے اور شکل صورت کے اچھے ہیں۔ اُن کے ہاں سے فارغ ہو کر ہم غالب بے کی طرف گئے جو قصرِ سلطانی کے وزیر تشریفات ہیں۔ اُن سے معلوم ہؤا کہ ہمیں محل قدیم کا خزینۂ ہمایوں دیکھنے کی اجازت مل گئی ہے۔ اور فرمانِ سلطانی لکھا ہؤا تیار ہے۔ لہٰذا ہم کپتان حسام الدین ایڈیکانگ شاہی کے ساتھ جو فرنچ زبان بڑی آسانی سے بولتے تھے اس محل کو گئے۔ اور اُس کی قابلِ دید چیزیں دیکھ کر شام کو واپس آ گئے۔

۲۲۔ اگست | آج صبح کے اخبارات میں یہ اعلان شائع ہؤا کہ تیسرے درجہ کا نشان

عثمانی اعلیٰحضرت سُلطان المعظّم کی طرف سے مجھے اور میرے دوست مشیر حسین قدوئی کو عطا کیا گیا ہے۔ اس اعزاز کے متعلّق ہمارے لئے زیادہ تر مسرّت کا موجب یہ امر ہوا کہ ہمیں یہ عزّت بالکل غیر مترقبہ طور پر حاصل ہوئی جس کے لئے ہم نے کسی سے ذرا بھی خواہش ظاہر نہیں کی تھی۔ یہ تمغہ عطا ہوتے ہی بحیثیت رعایائے برطانیہ ہونے کے ہم نے فوراً سفیر برطانیہ کو اس کی اطّلاع دی اور دریافت کیا کہ اپنی گورنمنٹ سے اس کے پہننے کی اجازت ملنے کے واسطے کیا کارروائی عمل میں آنی چاہیئے؟ اس کے بعد ہم نے سفیر ممدوح کی وساطت سے حصولِ اجازت کی درخواست دیدی۔ اُسی دن گیارہ بجے کے قریب وُہ اعزازی نشان ہمیں پہنچ گئے۔ مخمل کے خوبصورت کیسوں میں رکھے ہُوئے تھے۔ بعدازاں ہم قصر یلدیز کو گئے اور ہز اکسلنسی تحسین پاشا فرسٹ سیکرٹری اعلیٰحضرت سے شرفِ مُلاقات حاصل کیا۔ جن کے ہاں باریاب ہونا شاید دیگر تمام عمّال حکومت کی مُلاقات سے زیادہ مشکل امر ہے۔ ہم نے پاشائے ممدوح سے عرض کیا کہ ہمارا شکریہ اعلیٰحضرت کے حضور پہنچا دیں۔ جس کا اُنہوں نے بخوشی وعدہ فرمایا۔ ہم نے تحسین پاشا کو نہایت ہی سنجیدہ و متین اور ساکت و صامت دیکھا۔ اور گو آپ ہمارے ساتھ بڑے خُلق سے پیش آئے لیکن بلا اشدّ ضرورت کے ایک لفظ بھی زبان سے نہ نکالتے تھے۔ پس ہم اظہارِ امتنان اور معمُولی علیک سلیک کے بعد اُنکے کمرہ سے چلے آئے یہ سوچتے ہُوئے کہ شاید پاشائے ممدوح کی یہ کم گوئی اور انتہا درجہ کی متانت ہی اعلیٰ حضرت کی نظروں میں پسند ہُوئی ہوگی۔ کیونکہ ایسے امتیاز و اعتماد کے منصب پر ایسی اوصاف کی بڑی ضرورت ہوتی ہے۔ اور عجب نہیں کہ

اسی اعلیٰ وصف کے سبب آپ ایک معمولی سیکرٹری کے عُہدہ سے ترقی پاکر اس مرتبہ جلیلہ کو پہنچے اور برسوں سے اس اہم ذمّہ واری کے کام کو نباہ رہے ہیں۔

۲۳- اگست | آج ہم بابِ مشیخت کو دیکھنے گئے جو قسطنطنیہ میں اپنی قسم کی ایک ہی چیز ہے۔ یہ وُہ جگہ ہے جہاں تقدّس مآب شیخ الاسلام کی کچہری لگتی ہے۔ آپ کے ماتحت مثل دیگر وُزرا، کے بڑا بھاری عملہ ہے۔ آپ کیبنٹ (مجلسِ وکلا) کے ممبروں میں شامل ہیں۔ وزیرِ اعظم سے دُوسرے درجہ پر سمجھے جاتے ہیں اور اُنکی عدم موجُودگی میں آپ ہی کیبنٹ مذکور کے میرِ مجلس بھی ہوتے ہیں۔ جن آنکھوں نے یہ دیکھا ہو کہ عُلما بالکل مفلسی وخستہ حالی میں بسر کرتے ہیں اور عضوِ معطّل کی طرح بیکار ہی نہیں سمجھے جاتے بلکہ لوگ اُنکے وجُود کو قومی ترقّی میں حارج بھی خیال کرتے ہیں۔ جیسا کہ ہندوستان میں عام طوَر پر خیال ہے۔ اُن (آنکھوں) کیواسطے یہ منظر بڑا ہی تازگی بخش اور فرحت افزا تھا کہ عُلماء کرام سلطنت کے کاروبار میں اپنی واجبی قدر ومنزلت رکھتے۔ یعنی عمّالِ حکومت کا ہاتھ بٹاتے اور معدلت گستری کے اہم کام میں عملی طوَر پر حصّہ لیتے ہیں۔ اس حیثیت سے کہ وُہ علومِ دینیہ سے بھی بہرہ مند ہیں اور دُنیوی معاملات کی واقفیت اور تجربہ بھی رکھتے ہیں۔ یہی قرونِ اُولیٰ میں عُلمائے اسلام کا امتیازی نشان ہوتا تھا جسے افسوس کہ وُہ اکثر اسلامی ممالک میں کھو بیٹھے ہیں۔ وراثت اور جائداد کے۔ نیز بعض دیگر مُقدمات جنکا غیر مُسلموں سے بھی کچھ تعلّق ہو۔ ان مذہبی عدالتوں میں فیصل ہوتے ہیں۔ اور ان میں تمام کارروائی بڑی عُمدگی اور باقاعدگی سے عمل میں آتی ہے۔ عدالت کی عمارت کو اچھی طرح دیکھ بھال کے ہم نے پُوچھا کہ کیا جناب شیخ الاسلام

سے بھی ہماری ملاقات ہوسکتی ہو؟ جواب ملا کہ اسوقت وہ اپنے نائب کے ساتھ کچھ مشورہ کر رہے ہیں۔ اگر تھوڑی دیر ٹھہرو۔ تو انہیں آپ کی اطلاع کیجائے۔ ہم نے منظور کیا۔ اور گو بہت دیر تک انتظار کرنا پڑا مگر آخر اس تمام تکلیف کی کافی تلافی ہوگئی۔ ہم نے اپنے کارڈ بھیجے جس پر ہم اندر بلالئے گئے۔ جناب ممدوح فارسی بول سکتے ہیں۔ چنانچہ آپ نے اسی زبان میں گفتگو شروع کی۔ بیچ میں کہیں کہیں ترکی الفاظ بھی بولتے تھے جنکے معنی ہمیں ہمارا ترجمان سمجھا دیتا تھا آپ کی تقریر ایسی موثر و شائستہ تھی کہ جی چاہتا تھا سنتے ہی جایئے۔ شیخ الاسلام صاحب ایک نہایت خوش وضع بزرگوار ہیں۔ عمر عہدِ شباب سے کچھ ہی ڈھلی ہوئی ہو۔ ریش مبارک میں کوئی بال سفید آگیا ہے۔ ایک سادہ مگر بارعب لباس بر تھا۔ اپنے ڈسک کے پاس تشریف رکھتے تھے۔ میز کے کاغذات زبانِ حال سے بتلا رہے تھے کہ آپ کا جیسا کام میں جی لگتا ہو اُتنے ہی ستھرائی اور ترتیب و نفاست کو بھی عزیز رکھتے ہیں۔ جناب ممدوح نے اس خیال کی بڑے زور سے تائید فرمائی کہ "مسلمان علوم جدیدہ میں ترقی کریں" ۔ فرمایا کہ یہ انکا مذہبی فرض ہے کہ ہر زمانہ میں ضروریاتِ زمانہ کو ملحوظ رکھیں اور مصالح وقت کو ہاتھ سے نہ دیں"۔ اور یہ خیال جو عام طور پر پھیلگیا ہے واقعی غلط ہو کہ اسلام دنیوی ترقی میں مانع ہو یا ترقی اسلام سے دست بردار ہوکر ہی حاصل ہوسکتی ہے۔ اور منشاء کلام اللہ کو ٹھیک ٹھیک نہ سمجھنے یا اس کی نسبت غلط بیانیوں سے یہ خیال پیدا ہوا ہے۔ چنانچہ آپ نے آیات و احادیث بھی اپنے اس کلام کی تائید میں پیش کیں۔ حتی کہ ہم آپ کے تبحر علمی اور غیر معمولی دینی قابلیت سے بہت ہی متاثر ہوئے۔

یہاں سے ہم دار الشفقہ کو گئے جو یتیموں کا بڑا بھاری مدرسہ ہی۔ اور گو اب سے نصف صدی قبل عام چندوں سے قائم ہوا تھا مگر اب اسے سرکاری امداد بھی ملتی ہے اور بڑا مفید کام کر رہا ہے۔

۲۴۔ اگست | خوشی کی بات ہو کہ آج ہمیں رسمِ سلاملق دیکھنے کا بھی موقعہ ملگیا۔ یہاں یہ رسم اب ایک سرکاری تقریب سمجھی جانے لگی ہے۔ جب بم کا گولہ پھٹنے کا حادثہ گذرا ہے جس سے سُلطان کی جان پر حملہ مقصود تھا۔ اِس سے پہلے تو ممالکِ غیر کے معزز سیاحوں کو یہ رسم دیکھنے کی اجازت اپنے سفیروں کی معرفت بسہولت مل جاتی تھی۔ لیکن اُس حادثہ کے بعد بڑی احتیاطیں برتی جانے لگی ہیں اور ہر جُمعہ ممالکِ غیر کے ایسے باشندوں کی بہت ہی قلیل تعداد کو اجازت دیجاتی ہے جو مشہور و مُعتبر ہوں اور جنکے لئے اُن کی سلطنت کا سفیر زور سے سفارش کرے۔ چُونکہ ہمارے (برٹش) سفیر صاحب نے ہمارے لئے سفارش کی تھی اور اس جمعہ کے لئے اجازت حاصل ہو گئی تھی۔ اِسواسطے ہم گیارہ بجے کے قریب محلِ سلطانی کی طرف روانہ ہو گئے۔ جہاں بڑے پھاٹک کے باہر ایک ایڈیکانگ خاص اسی کام کے لئے مخصوص و متعین تھا۔ ہمارے علاوہ بارہ یوروپین لیڈیاں اور جنٹلمین اَور بھی اس رسم کا تماشا دیکھنے آئے تھے۔ ہم کوئی گھنٹہ بھر تک وہیں کھڑے سلاملق کی تیاریاں دیکھتے رہے۔ اِس موقعہ پر منتخب افسروں کی ماتحتی میں تمام افواجِ سُلطانی کے چیدہ چیدہ جوان حاضر تھے۔ پتھر کی اس جدید دیوار سے پرے جو حادثہ مذکورہ بالا کے بعد بنائی گئی ہے۔ حمیدیہ مسجد تک سارے رستے سواروں کا رسالہ صف بستہ کھڑا تھا۔ اور مسجد کے چاروں طرف محل کے

سامنے۔ نیز جس دروازہ سے اعلیٰحضرت باہر تشریف لاتے ہیں۔ اُس کے دونو طرف عرب تُرک وغیرہ دیگر جنگی جوان تعینات تھے۔ فوجی بینڈ حاضر تھا۔ بارہ بجے سے تھوڑی ہی دیر بعد بہانگِ دُہل اعلان ہوا کہ اب اعلیٰحضرت نے اپنی شاہی گاڑی میں قدم رنجہ فرمایا ہے۔ اِس کی خبر ہوتے ہی بینڈ باجہ بجنا شروع ہوا۔ دو تین منٹ میں اُنکی گاڑی سامنے آگئی۔ اعلیٰحضرت کے بالمقابل رضا پاشا کمانڈر انچیفِ افواجِ سُلطانی بیٹھے تھے۔ شاہی سواری کا سامنے سے گذرنا تھا کہ ہر طرف سے "پادشاہم چوق یشا" "پادشاہم چوق یشا" کے نعرے بڑی گرمجوشی کے ساتھ بلند ہُوئے۔ جس کے معنی ہیں کہ بادشاہ سلامت تادیر زندہ رہیں۔ جس وقت اعلیٰحضرت ہمارے پاس سے گذرے ہم نے باادب سلام عرض کیا۔ آپ نے عنایت آمیز تبسم فرماتے ہُوئے ہمارے سلام کا جواب دیا جس سے یہ پایا جاتا ہے کہ غالباً ہمارے ہندی لباس سے پہچان گئے کہ یہ وُہی دونو ہندوستانی سیاح ہیں جو اندنوں ہمارے دارالخلافہ میں آئے ہُوئے ہیں۔

اعلیٰحضرت کا لباس نہایت سادہ تھا اور یہی آپ کی مستقل عادت ہے۔ ایک لمبے اُوورکوٹ سے بٹن بڑی احتیاط سے لگے ہُوئے تھے۔ اندر کی تمام پوشاک ڈھکی ہُوئی تھی۔ اور اس اُوورکوٹ پر سوائے بڑے بڑے بٹنوں کے کوئی شے نمائش و زیبائش کی ٹکی ہُوئی نہ تھی۔ سُلطان المعظّم کی ریش مبارک جس سے ایک وقار اور بزرگی مترشح ہے نہ تو بہت بڑی اور گھندار ہے اور نہ کچھ چھدری۔ پھر بھی خاصی اچھی بھری ہُوئی ڈاڑھی ہے۔ آپ اس میں خضاب

سلطان المعظم کی گاڑی

لگاتے ہیں۔ چہرۂ مبارک سے گو تفکرات عیاں ہوتے ہوں تاہم وُہ ایسا افسردہ
و پژمردہ نہیں جیسا کہ یورپ کے عیب جو حسّاد کی تحریروں سے خیال میں آتا ہے۔
جب اعلیحضرت مسجد کی سیڑھیوں پر پہنچے تو جو افسر احاطۂ مسجد کے اندر کھڑے
تھے اور نیز جو اوپر کی سیڑھی پہ تھے اُنہوں نے کمالِ ادب سے حضور کی سلامی
اُتاری۔ آپ دونو طرف سلاموں کا جواب ہاتھ کے اشارے سے دیتے ہُوئے
بآسانی سیڑھیوں پر چڑھتے چلے گئے۔
سُلطان المعظم کے مسجد میں پہنچتے ہی نماز جمعہ شروع ہو گئی اور جب نماز ختم ہُوئی
تو اعلیحضرت فوراً باہر تشریف لے آئے اور شاہی گاڑی میں سوار ہو کر اس کو خود
ہی ہانکتے ہُوئے محل کی راہ لی۔ اُس وقت پرنس بُرہان الدین حضور کے ساتھ
سوار تھے۔ واپسی پر بلینڈ نے پھر ترانۂ شادمانی سُنایا۔ اور شاہی سواری کے پیچھے
پیچھے اظہارِ وفاداری کے نعرے محلِ سُلطانی کے پھاٹک تک برابر بلند ہوتے
رہے۔ اس موقعہ پر حرمِ محترم کی خواتین بھی بکثرت آئی تھیں۔ اور واپسی کے
وقت وُہ بھی اپنی اپنی گاڑیوں میں شریکِ جلوس تھیں۔ جب رسمِ سلاملق ختم
ہو چکی تو ہم حاجی علی پاشا ناظرِ اعلیٰ کے پاس گئے جن سے ہم ۳۱۔ جولائی کو
بھی مِل چُکے تھے۔ آپ کے کمرہ میں منجملہ دیگر اشخاص کے احمد پاشا دامادِ سلطان
بھی تشریف رکھتے تھے۔ وُہ بھی بڑی التفات سے پیش آئے اور ہمارے
گائڈ کی استدعا پر جو ہماری ہی طرف سے تھی فرمایا کہ میرے لئے موجبِ مسرت
ہوگا اگر آپ لوگ مجھ سے ملنے کو آئیں۔
۲۵۔ اگست | آج کے دِن کوئی قابلِ ذکر واقعہ نہیں گذرا بجز اس کے کہ ہم

جو چٹھی سفیر برطانیہ کی خدمت میں بھیجی تھی اس کے مطابق برٹش سفارتخانہ کے ترجمان صاحب ہم سے ملنے آئے۔ پھر کچھ دیر حقی بے مشیر قانونی بابعالی سے بات چیت ہوتی رہی۔

۲۶۔ اگست | آج ہم نے مدرسہ دار الخیر کی سیر کی جو صرف نادار و محتاج بچوں کے لئے مخصوص ہے اور جس میں علاوہ دیگر ضروری تعلیمات کے تعلیم صنعت و حرفت بھی دیجاتی ہے۔ اس درسگاہ کی عمارت اصل میں ایک محل شاہی تھا جو اعلیحضرت نے حال ہی میں اس خیر جاریہ کے لئے وقف فرما دیا ہے۔ سکول کے سیکنڈ ماسٹر صاحب نے ہمیں اندر سے خوب اچھی طرح اسکی سیر کرائی۔ ہم نے دیکھا کہ یہاں بچوں کی آسائش و تربیت کے تمام ضروری سامان مہیا کیے گئے ہیں۔ اس موقع پر بعض لڑکے بوجہ تعطیل اپنے رشتہ داروں کے ہاں گئے بھی تھے۔ مگر پھر بھی اُنکی ایک معقول تعداد وہاں موجود تھی۔ معلوم ہوا کہ اس مدرسہ میں طلباء کو علم موسیقی اور فن مصوری بھی سکھلایا جاتا ہے۔

اس کے بعد ہم محکمہ مال کی طرف گئے تاکہ جو عمال اس صیغہ سے متعلق ہیں ذرا ایک نظر اُنہیں بھی دیکھ آئیں۔ ہم نے یہاں کی عمارت اور انتظامات کو بھی ویسا ہی پایا جیسا کہ بابعالی اور عدالتوں میں پہلے دیکھ چکے تھے۔ جامع بایزید کے متعلق پبلک لائبریری (کتبخانہ عام) کو بھی دیکھا۔ جہاں جا کے معلوم ہوا کہ علم دوست پبلک اسکی اچھی سرپرستی کرتی ہے۔ اسی روز سہ پہر کے وقت مطبع عثمانی دیکھنے گئے جس کا بڑا بھاری عملہ ہے۔ قسطنطنیہ میں دو سرکاری مطابع ہیں جن میں مختلف محکمہ جات کی رپورٹیں اور دیگر سرکاری کاغذات بطرز جدید طبع ہوتے ہیں۔ اور چھوٹا

موٹا متفرق کام بھی ہوتا ہے۔ پریس میں اس وقت ٹائپ اور لیتھو کی کئی مشینیں کام کر رہی تھیں اور معلوم ہوتا تھا کہ عملہ کا انتظام بہت عمدہ ہے۔ یہاں ہم نے دیکھا کہ گودام کی الماریوں میں ہزارہا قرآن شریف رکھے ہوئے ہیں۔ معلوم ہوا کہ کلام مجید کی یہ تمام جلدیں حجاز اور دیگر حصص قلمروئے عثمانیہ کے غریب غرباء میں اعلیحضرت خلافت پناہی کی طرف سے مفت تقسیم ہونے کے لئے چھپی ہیں۔ خیرات و صدقات کا یہ ایک ایسا احسن طریقہ ہے جسے لینے والے بھی بہت پسند کرتے ہیں اور معطی محترم کو بھی ثوابِ عظیم ہوتا ہے۔

۱۷۔ اگست | چونکہ احمد پاشا دامادِ اعلیحضرت ہمیں ملاقات کا موقعہ دینا منظور فرما چکے تھے ہم آج صبح کو اُنکے گرامی مسکن کی طرف روانہ ہوئے جو فنار باغچہ کے قریب واقع ہے۔ اسکدار سے پرلے پار پہنچ کے مقام حیدر پاشا سے ہم فنار کی ٹرین میں بیٹھ لئے۔ اور سٹیشن سے گاڑی میں سوار ہو منزل مقصود پر آن اُترے۔ جو ساحلِ بحر پر ایک خوشگوار دیہاتی محل ہے۔ اس جگہ ہمیں ایک ڈرائنگ روم (ملاقات کے کمرے) میں لیگئے یہاں چند ہی منٹ بعد پاشائے ممدوح بھی ہم سے ملنے تشریف لے آئے۔ آپ مارشل اسمٰعیل پاشا مرحوم کے فرزند ارجمند ہیں۔ اچھی معقول تعلیم و تربیت پائی ہے۔ آپکی خوش بیانی اور طلاقتِ لسانی کا ہم پر بہت ہی اچھا اثر پڑا۔ باتوں باتوں میں یہ ذکر چل پڑا کہ مسلمانانِ ہند کو اپنے دینی بھائی عثمانیوں کے ساتھ ہمیشہ سے ہمدردی رہی ہے۔ اور وہ ہمدردی صرف زبانی جمع خرچ تک ہی محدود نہیں بلکہ ضروری موقعوں پر وقتاً فوقتاً پبلک چندوں کے ذریعہ سے اُنہوں نے عملی طور پر بھی اپنی دلی ہمدردی کا ثبوت دیا ہے۔ ان واقعات و خیالات کا اظہار کر کے آپ نے فرمایا

کہ اصل میں ہمدردی تو طرفین کو ایک دُوسرے کے ساتھ ہے لیکن مسلمانانِ ترکی جو ہندوستان کے کسی کارِ خیر میں مالی مدد دیکر اپنی ہمدردی کا عملی ثبوت نہ دے سکے اسکی وجہ یہ ہے کہ اُنہیں اپنے ہندی بھائیوں کے اُن اغراض و مقاصد سے پُوری آگاہی نہیں جو محتاجِ اعانت و حوصلہ افزائی ہیں۔ جب مَیں نے پاشائے ممدوح کو اُن ابنیہ کی کیفیت بتلائی جو مُسلمانانِ ہند نے مختلف اقطاعِ مُلک میں اپنے افرادِ ملت کی تعلیم اور یتیموں کی پرورش وغیرہ کی غرض سے قائم کر رکھی ہیں۔ اور کہا کہ وُہی حوصلہ افزائی کی سب سے زیادہ مستحق ہیں تو آپ نے اِن کارہائے خیر کی نسبت بہت کچھ اظہار پسندیدگی فرمایا اور توقع ظاہر کی کہ انشاءاللہ مُسلمانانِ ترکی بھی اپنے ہندی بھائیوں کے ساتھ ایسی ہی عملی ہمدردی ظاہر کرنے میں ساعی ہونگے جیسی کہ اُنکی جانب سے ہمیشہ ظہور میں آتی رہی ہے۔

اسکدار کو واپس ہوتے ہُوئے ہم شفاخانہ فوجی سے گُذرے اور تھوڑی دیر کیلئے وہاں بھی ٹھہر گئے۔ ڈاکٹر عزیز بے نے ہمیں اس ہسپتال کی قابلِ دید چیزوں کی سَیر کرائی اور تیسرے پہر ہم اسلامبول کو لَوٹ آئے

۲۸۔ اگست | ہمارے قیامِ قسطنطنیہ کا سب سے زیادہ دلچسپ دِن آج کا تھا جو ہرکیہ کی سیر میں کٹا۔ یہ اناطولی ریلوے لائن پر ایک چھوٹا سا خوبصُورت قریہ ہے جس میں قبرکہ ہمایُوں واقع ہے جو ریشم اور قالین کا نہایت عالیشان کارخانہ ہے۔

۲۹۔ اگست | جس فرمان میں ہمیں نشانِ عثمانی عطا ہونے کی نسبت ارشادِ عالی تھا وُہ آج صبح کے وقت پہنچا۔ یہ ایک سرکاری سند ہے۔ طلائی حروف میں مرقوم۔ جس پہ شاہی طُغرا بنا ہوا ہے جو ٹرکی کے تمام سرکاری کاغذات پر ہوتا ہے۔
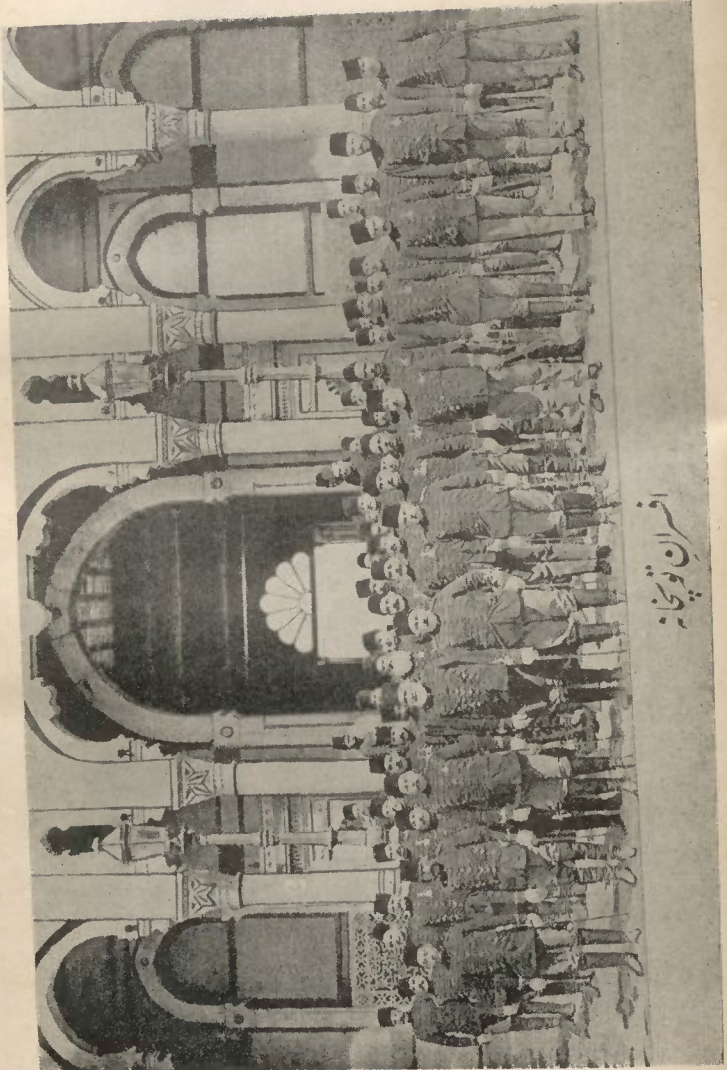
افسرانِ توپخانہ

آج ہمیں جن جن قابلِ ذکر اشخاص سے نیاز حاصل ہوا اُن میں سے ایک امیر البحر حکمت پاشا ہیں۔ یہ صاحب ترکی صیغہ بحری کو تقویت دینے کی بہت ہی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ چونکہ آپ انگریزی بلا تکلف بول سکتے ہیں ہم آپ کے ساتھ بغیر ترجمان کی وساطت کے ہی بخوبی بات چیت کر سکے۔ کپتان سی۔ بی نارمن صاحب ایک انگریز جو قسطنطنیہ میں مدت سے رہتے ہیں۔ اُنہوں نے ان سے ہماری ملاقات کرائی۔

۳۰۔ اگست | آج ہم توپخانہ میں گئے کہ ہز اکسلنسی ترکی پاشا سے نیاز حاصل کریں جو دولتِ علیہ کے وزیر توپخانجات ہیں۔ مگر چونکہ آج اُنہیں اپنے فرائض متعلقہ میں بہت ہی غیر معمولی مصروفیت تھی ملاقات نہ ہو سکی۔ ہمیں اُن سے ملنے کی اس خیال سے زیادہ خواہش تھی کہ آپ کی اجازت سے امپیریل ملٹری سکول دیکھ سکینگے۔ مگر افسوس کہ وہ آرزو باقی رہ گئی۔ پھر ہم بالعالی کو گئے۔ جہاں ہم کو ہز اکسلنسی ممدوح پاشا سے شرفِ تعارف حاصل ہوا۔ یہ ترکی کے ایک پُرانے سویلین ہیں اور وزیرِ داخلیہ کے منصبِ ذمہ داری پر ممتاز۔ ہم نے آپ سے عرض کیا کہ ہم ہفتہ عشرہ میں دولت علیہ کے قدیم پایۂ تخت بروسہ کو روانہ ہونا چاہتے ہیں۔ آپ نے کمال عنایت سے فرمایا کہ میں والیٔ بروسہ کے نام پیغام بھیجدونگا کہ آپ کو وہاں کی سیر کرنے میں ہر طرح سامانِ سہولت بہم پہنچا دیں۔ ہم نے اس مہربانی پر آپ کا شکریہ ادا کیا اور قریباً آدھ گھنٹہ کی دلچسپ گفتگو کے بعد وہاں سے رخصت ہوئے۔

یکم ستمبر | آج جلوس کا دن تھا جس میں قسطنطنیہ کے لوگ اعلیحضرت سلطان المعظم کی تخت نشینی کی سالگرہ مناتے ہیں۔ جو عظیم الشان نظارہ ہم نے آج شام کو دیکھا۔ اُسنے ہمارے دل سے اُس انتظار کی تمام کوفت بھلا دی۔ جو ہمیں اس جلوس ہمایون

کے شوقِ دید میں بہت دنوں تک کرنا پڑا تھا۔ قسطنطنیہ کے دلکش محلِ وقوع اور اسکی
قدرتی دلفریبیوں کا کچھ ذکر میں پہلے ہی کر چکا ہوں۔ آبنائے باسفورس کے دونو
طرف پہاڑی پر وُہ آسمان سے باتیں کرتی ہوئی عمارتیں۔ وُہ شاندار مساجد! کچھ فاصلہ
سے دیکھئے تو بس ایسا معلوم ہوگا کہ یہ خاک وخشت کے بنے ہوئے انسانی مسکن
نہیں ہیں بلکہ ایک دِل آویز تصویر ہے جسکے کھینچنے میں کسی بڑے کاریگر نے
اپنا کمالِ ہنر ختم کر دیا ہے۔ جب معمولی حالت میں اس عظیم الشان شہر کی کیفیت
ایسی نظر فریب ہو تو بھلا اُس حالتِ خاص کا ٹھیک ٹھیک نقشہ کھینچنے کے لئے
موزون الفاظ کہاں مِل سکتے ہیں جبکہ اس تمام بستی میں چراغاں کیا گیا ہو جیسا
کہ یہاں ہفتہ کے دن کی شب کو سالگرہ سُلطانی کی مُبارک تقریب پر کیا گیا اسوقت
شہر بالکل ایک بُقعۂ نور نظر آتا تھا۔ اسی پر بس نہیں بلکہ لوگوں نے روشنی کرنے
میں طرح طرح سے کمالِ ہُنر مندی دکھلایا تھا۔ جابجا روشنی کی محرابیں بنی ہوئی
تھیں۔ گھر گھر کے دروازوں اور دریچوں میں جاپانی لالٹینیں رات کو دن
بنا رہی تھیں۔ بازاروں میں چپہ چپہ پر جھنڈے کھڑے اور پرچم لہرا رہے تھے
جدھر نظر اُٹھائیے نشانِ ہلال مجسم فخر و مسرت بنکے چمک رہا ہے۔ گویا شہر کیا ہے
خاصہ ایک طلسمِ حیرت ہے جس نے جادو کے زور سے قلبِ ماہیت کے بعد یہ شکل
اختیار کرلی ہے۔ مسجدوں کے رفیع الشان بُرج اور مینار نوری حُلّے پہنے
ہوئے ہیں اور اندر جھاڑوں فانوسوں کی کثرت سے گویا ایک دریائے نور
ہے کہ موجیں مار رہا ہے۔ تمام سرکاری عمارات اس مُبارک تقریب پر اہتمام
خاص سے سجائی گئی تھیں اور بڑی رات گئے تک ہم نے دیکھا کہ مردوں عورتوں

کے غول کے غول بازاروں میں چراغاں کا تماشا دیکھنے پھرتے تھے۔ مجھے یہ بات خاص طور پر قابلِ توجہ معلوم ہوئی کہ آج کی رات اعلیحضرت سلطان المعظم کی مسلمان رعایا کی طرف سے تو خیر جتنا کچھ بھی اظہار عقیدت و مسرت ہوتا کم تھا لیکن تعجب یہ ہے کہ غیر مسلم رعایا کی دوکانوں مکانوں کی روشنی و آرائش اُسے بھی ماند کرتی تھی۔ آبنائے باسفورس کا منظر خصوصیت سے دلفریب تھا کشتیوں کے گھاٹوں کے اردگرد۔ جہاں باسفورس کو جانیوالے سٹیمر ٹھہرتے ہیں اور اُسوقت بھی کئی سٹیمر اِدھر اُدھر چکّر لگا رہے تھے۔ لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے ہوئے تھے۔ تیسرے پہر بہت سے آدمی آبنائے کے پرلی طرف چلے گئے تھے تاکہ واپسی کے وقت روشنی کا تماشا دیکھیں شام کے ۷ بجے جبکہ روشنی شروع ہی ہوئی ہم بھی ایک سٹیمر پر سوار ہوگئے۔ اور دیکھا کہ سٹیمر پر ہر شخص سامنے کے دلفریب نظارہ سے ایک عالمِ بیخودی میں آیا ہوا ہے۔ جن شاہی عمارات و محلات کا ذکر تراپیہ کی سیر کے ضمن میں کر چکا ہوں۔ اور جو زیادہ تر خاندان شاہی۔ ممبرانِ خاندانِ خدیوی اور نیز عمائد سلطنت سے متعلق ہیں۔ اُنکی روشنی و آرائش میں غیر معمولی اہتمام اور فراخدلی سے کام لیا گیا تھا۔ اور اس منظرِ نورانی کا عکس پانی میں پڑکر میلوں تک ایک عجیب ہی تحیّر خیز سماں پیدا کر رہا تھا۔ عمارتوں کی پُشت پر اوپر تلے جو مسلسل پہاڑیاں واقع ہیں اُن پر بھی روشنی کی گئی تھی اور الفاظ "پادشاہم چوق یشا" روشن حروف میں کئی کئی طرح بڑی خوبصورتی سے لکھے گئے تھے جن سے مختلف مشرقی رسومِ خط کا کمال ظاہر ہوتا تھا۔ بہت سی کشتیاں بھی بُقعۂ نور بنی ہوئی تھیں اور جب وہ اِدھر اُدھر آتی جاتی تھیں تو گویا روشنی کے بڑے بڑے ستون متحرک

نظر آتے تھے۔ بعض تماشائی بڑی کشتیوں کو چھوڑ کر چھوٹی کشتیوں میں بیٹھنا پسند کرتے تھے اور ہنرمند ملّاح اُنہیں لئے لئے دُوسری چھوٹی کشتیوں اور سٹیمروں کی بھیڑ بھاڑ کو چیرتے ہُوئے اِدھر سے اُدھر نکلجاتے تھے۔ ایسے اِحتیاط طلب وقت میں ان کشتیوں پر بیٹھنا خالی از خطر تو نہ تھا مگر ہاں اِس میں شک نہیں کہ بہ نسبت سٹیمروں کے اِن پر سے تماشا کہیں زیادہ نظر آتا تھا۔ کیونکہ وُہ جہاں چاہتیں بے تکلّف ٹھہر جاتی تھیں۔ چنانچہ ہم نے دیکھا کہ ایک بند کے پاس جہاں سُلطان کے کسی رشتہ دار کے مکان کے سامنے باجہ بج رہا تھا جسے سُننے کو بہت سی تُرکی خواتین بھی آنکر جمع ہوگئی تھیں اور روشنی کے دروازوں اور محرابوں کے تلے جو اس موقع کے لئے تیار کی گئی تھیں چپ چاپ بیٹھی لُطفِ نظارہ اُٹھا رہی اور باجہ سُن رہی تھیں۔ وہیں چھوٹی کشتیاں بھی بیسیوں آٹھہری تھیں۔ ایشیائی ساحل کا منظر بھی گو نسبتہً ذرا دُور تھا مگر اپنی دلفریبی اور کشش میں کچھ کم نہ تھا۔ وُہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا فردوسِ بریں رُوئے زمین پر اُتر آیا ہے اور اس مبارک تقریب شادمانی کی طرف لُطف آمیز تبسم سے تک رہا ہے۔ چونکہ چاند بھی اس وقت پُورے جوبن پر تھا وُہ اس سین کی اُمنڈتی ہوئی دِلفریبی کو اَور بھی دوبالا کر رہا تھا۔ اور جب چاندِ مہتاب آبنائے باسفورس کی لہروں پر آن کے پڑتی تھی تو ایسی کیفیت نظر آتی تھی جس کی سحر کاری روز روز دیکھنے میں نہیں آتی حقیقت یہ ہے کہ اس کا لُطف دیکھنے ہی سے تعلّق رکھتا ہے اور یہ کسی بڑے جادو نگار کا ہی کام ہے کہ اس کا ٹھیک ٹھیک نقشہ کھینچ سکے۔

مجھے یہ دیکھکر حیرت و مسرت ہُوئی کہ اس تقریبِ سعید کے پروگرام میں آتشبازی

کا نام ونشان تک نہ تھا۔ اس سے میری یہ مراد نہیں کہ آتشبازی اگر اچھی ہو تو بھی
مجھے اس کا لطف نہیں آتا۔ بچہ تھا تو اور بچوں کی طرح مجھ کو بھی اس کا بڑا شوق تھا
اور اب بھی اسے دیکھ کر ایک قسم کا لطف تو ضرور آتا ہے مگر جب سے کچھ ہوش سنبھالا
ہے میں سمجھنے لگا ہوں کہ اس پر روپیہ خرچ کرنا گھر پھونک تماشا ہوتا ہے اور اسی لئے
میں اُن احباب کا ہمدرد و موید ہوں جو شبِ برات وغیرہ تہواروں پر آتشبازی
کا بربادی بخش رواج موقوف کرنے کی فکر میں ہیں تاکہ وہی لاکھوں روپیہ جو ہر سال
اِس اسرافِ بیجا کی نذر ہوتا ہے کسی اور بے ضرر مشغلہ یا مفیدِ عام کارِ خیر میں صرف
ہوا کرے۔ پس ناظرین میری اس خوشی کا اندازہ خود ہی کر سکتے ہیں جو مجھے یہ سنکر
حاصل ہوئی کہ کچھ عرصہ سے اس تقریب پر آتشبازی چھوٹنے کی اعلیٰحضرت نے
بذریعہ فرمانِ خاص ممانعت فرما دی ہے اور حکم ہو گیا ہے کہ جو زرِ کثیر عمّالِ حکومت
یا دیگر اشخاص قبل ازیں آتشبازی میں پھونک کر خاک سیاہ کر دیا کرتے تھے
وہ آئندہ سے دار العجزہ (محتاج خانہ) کی اعانت میں دیا جائے۔ اعلیٰحضرت
کی یہ کارروائی فی الواقع نہایت ہی مستحقِ ستائش ہے اور قابلِ تقلید جلوسِ
ہمایوں کی تقریب پر مختلف شکلوں میں صدقات وخیرات اور داد و دہش بڑی
کثرت سے ہوتی ہے۔ اس روز ایک ہی دن میں کئی جگہ "رسمِ ختنہ" ادا ہوئی جسے
حمیدیہ ہسپتال میں ہم نے بھی دیکھا۔ اس دن قریباً تین سو لڑکوں کا ختنہ تو
اس ایک ہی جگہ کیا گیا۔ شہر بھر میں خدا جانے کہاں کہاں اور کتنے مختون
ہوئے ہونگے۔

ہ ستمبر | آج ہم پھر دار العجزہ میں گئے کیونکہ وہاں کل رسمِ ختنہ دیکھنے کا وعدہ پورا

نہ کر سکے تھے۔ وہاں سے لوٹتے ہوئے آرمینی لوگوں کا گورستان دیکھا جسکی نگہداشت
مثل اکثر مسیحی قبرستانوں کے نہایت عُمدگی سے کیجاتی ہے۔ اِس میں کئی بڑے
خوبصورت یادگاری کتبے نصب ہیں جو بعض مخیرانِ ملّت کی یادگار میں کھڑے
کیئے گئے ہیں جنہوں نے اپنی زندگی میں آرمینین قوم کی ترقی و فلاح کے
کاموں کی اعانت کے لیئے اپنی دولتیں وقف کر دی تھیں۔ آج کی شام کا وقت
ایک اَور ایرانی ضیافت کے لیئے رکھا گیا تھا۔ مرزا محسن اصفہانی معتمد التجار نے
جنکے ہوٹل میں تشریف لانیکا تذکرہ مَیں اس روزنامچہ کے شروع میں کر چکا ہوں
ہمیں مدعو کیا تھا اور بیس اک اَور بھی ممتاز ایرانی مہمانوں کو اس میں شریک
ہونے کے لیئے بلوا دیا تھا۔ چونکہ ان احباب میں بعض ایسے بھی تھے جو حال
میں ایران سے آئے تھے اور جلدی ہی انہیں وطن مالوف کو واپس بھی جانا تھا
ہمیں اس تقریب پر ایران کی موجودہ حالت سے آگاہی حاصل کرنے کا بہت
کچھ موقعہ ملا۔ منجملہ انکے ایک صاحب خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ یعنی ڈاکٹر شیخ محمد
طہرانی۔ جو پایۂ تخت ایران کے ایک قابل و تجربہ کار ڈاکٹر ہیں۔ آپ نے ڈاکٹری
تعلیم پیرس میں پائی ہے۔ اور حال میں آپ نے یورپ کا جو سفر کیا وُہ اپنے
بیٹے سے جا کر ملنے کی غرض سے تھا جو ویانا (پایۂ تخت آسٹریا) میں ڈاکٹری
پڑھتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب وہیں سے انہی دنوں لوٹے تھے۔ ایک اَور صاحب
جو ہم سے ملے حاجی سیّد احمد آغا تھے جو طہران کے بڑے بھاری جوہری ہیں
اور اُن دِنوں کاروباری اغراض سے سیاحتِ یورپ کر رہے تھے۔ ہم نے
اُن سے سفرِ طہران کا شوق ظاہر کیا۔ اُنہوں نے ہمیں اپنا پتہ دیا اور فرمایا کہ

جب آپ کو اُدھر تشریف لانے کا اتّفاق ہو تو غریب خانہ پر ضرور قیام کیجئیگا۔ آپ نے دُنیا کے چند ایرانی تجّار کے نام مغربی چھٹیاں دینے کا بھی وعدہ فرمایا کہ شاید دُنیا کے مختصر قیام میں ہمیں کبھی اُن کی ضرورت پڑے۔ چونکہ ہم ایرانیوں کے ساتھ (فارسی زبان میں) بآسانی گفتگو کرسکتے تھے۔ شام کو دیر تک برابر مزے مزے کی باتیں ہوتی رہیں اور ہم نے جو چند باتیں اپنے ایرانی احباب سے پوچھیں تو اُن سے مسائل متعلّقہ پر بہت سی دلچسپ بحثیں چھڑ گئیں منجملہ انکے ایک تعلیم نسواں کا مسئلہ تھا جسے مَیں نے شروع کیا اور پھر اس پر خوب گرما گرمی سے جرح قدح ہوتی رہی۔ عُلمار ایران میں سے ایک صاحب نے جو اُس وقت موجُود تھے یہ بات تو مان لی کہ عورتوں کو تعلیم ضرور دینی چاہیئے مگر صرف اسی قدر کہ اپنے حقوق و فرائضِ دینی کے مسئلہ مسائل سے واقف ہوجائیں قرآن شریف پڑھ سکیں اور نیز انتظامِ خانہ داری و تربیتِ اطفال کی قابلیت سے بے بہرہ نہ رہیں۔ ہمارے دوست حاجی زین العابدین بھی تشریف رکھتے تھے۔ جن کے خیالات سوشیل اور پولٹیکل معاملات میں بڑے آزادانہ ہیں۔ آپ کی یہ رائے تھی کہ عورت کے حقوق تعلیم کے بارے میں مرد سے کچھ کم نہیں۔ اس بحث میں بعض احباب تو ایک طرف تھے اور بعض دُوسری طرف۔ ابھی مسئلہ زیرِ غور و تصفیہ طلب ہی تھا کہ اتنے میں ایک فقیہہ صاحب بطور ثالث بیچ میں پڑ گئے کہ مولانا صاحب نے مذہبی اور علمی تعلیم کو جس حد تک ضروری قرار دیا ہے وُہ عام طور پر تو میرے نزدیک بھی کافی ہے لیکن جو لوگ اپنی بہو بیٹیوں کو اس سے ذرا اعلیٰ تر تعلیم دینا چاہتے ہیں اور اسکی مقدرت بھی رکھتے ہُوں تو بہت اچھی بات ہے اس کی مخالفت نہونی چاہیئے

اس سے صاف عیاں ہے۔ کہ ایران کے بعض علما ہمارے ہندی بزرگواروں سے بلحاظِ روشن خیالی کہیں بڑھے چڑھے ہوئے ہیں۔ نیز اس سے یہ بھی نتیجہ نکلتا ہے کہ مسلمانوں کے زیرِ بحث معاملات دنیا کے تمام حصّوں میں قریب قریب ایک ہی ہیں۔

۲۴ ستمبر چونکہ دار الشفقۃ۔ کے پرنسپل صاحب نے ہم سے قرارداد کی تھی کہ گو ان دنوں تعطیل ہے لیکن میں معہ چند ممبرانِ سٹاف کے آپ کو یہیں ملونگا۔ پس ہم آج اس درسگاہ میں گئے یہ ایک عظیم الشان عمارت ہے جو سلطان عبد العزیز مرحوم کے زمانہ میں عام چندہ سے تیار ہوئی تھی اور اب اسے کچھ تو سرکاری امداد ملتی ہے اور کچھ اسی وقت کے سرمایۂ محفوظ کی آمدنی ہو جاتی ہے۔ نصابِ تعلیم میں عام درس تدریس کے ساتھ کسی قدر دستکاری داخل ہے۔ اور دینیات کو بھی لازمی رکھا گیا ہے۔ پرنسپل صاحب صاحبِ تعلیمی امور کا معقول تجربہ رکھتے ہیں۔ آپ نے اِس بارہ میں بڑے شوق سے گفتگو کی کہ دنیا کے مختلف حصّوں میں تعلیم کے کیا کیا طریق مروج ہیں۔ یہ امر خاص طور پر دریافت فرمایا کہ حضراتِ علما۔ کو علوم جدیدہ سے مانوس و بہرہ اندوز کرنیکے لئے آپ لوگ ہندوستان میں کیا کر رہے ہیں"؟ اور کہا کہ میرے نزدیک اگر آپ ہندوستان سے کچھ طالبانِ علم ایسے بھیجیں جو عربی فارسی خاصی اچھی جانتے ہوں اور وہ علومِ جدیدہ کی تحصیل و تکمیل استانبول میں کریں تو اس میں بڑی کامیابی کی اُمید ہے۔ یہ تعلیم جو آیندہ کے لئے ازبس ضروری ہے۔ انہیں بلادِ اسلامیہ ہی میں حاصل ہو سکتی ہے"۔ فرمایا کہ مثلاً یہاں آ کر وہ پہلے ترکی زبان سیکھیں جو چھ مہینے میں خاصی کام چلانے کے قابل آ سکتی ہے۔ پھر اس زبان میں ڈاکٹری یا طبیعیات کی تعلیم وہ اس سے کہیں تھوڑی مدت میں حاصل کر سکتے ہیں جتنی کسی یورپی زبان کے ذریعہ

سیکھنے میں درکار ہوگی۔ یہاں ایسے طالب علم کا خرچ تخمیناً چھتّر روپے ماہوار ہوگا۔ جو طلبا اسکو برداشت کرنیکی مقدرت نہ رکھتے ہوں۔ انکو حامیانِ تجویز کے چندہ سے وظائف دینے کا انتظام ہوسکتا ہے۔ ہم نے پرنسپل صاحب اور چند ممبرانِ سٹاف کے ساتھ تمام عمارت کی سیر کی۔ اور اسے اُن جمیع ضروریات سے لَیس پایا جو ایک جدید درسگاہ (سکول یا کالج) میں ہونی چاہیئے۔ یہاں ایک سکول میوزیم ہے۔ ایک کیمیکل لیبورریٹری۔ ایک صیغۂ علمِ نباتات۔ ایک صیغۂ علمِ حیوانات مصوّری اور نقش کشی کا بھی بندوبست کیا گیا ہی۔ طلبا کی دستکاری کے جو نمونے ایک کمرہ میں رکھے تھے اُن سے پایا جاتا تھا کہ فنونِ لطیفہ کی وُہ اچھّی قابلیّت و صلاحیّت رکھتے ہیں۔ یہاں ہم نے ایک خاص بات یہ دیکھی کہ ایک صیغہ میں طلبا کو تار برقی کا کام بھی سکھایا جاتا ہی اور وُہ محکمۂ تار کے واسطے تیاّر ہوتے ہیں۔ عمارت مدرسہ کی بالائی منزل طلبار کا بورڈنگ ہوس ہی۔ اور نیچے ڈائننگ ہال ہی۔ جسکو ایک چھوٹی سی ریلوے لائن کے ذریعہ باورچیخانہ سے ملا رکھا ہی۔ اسی لائن پر ہی کھانا باورچیخانہ سے ڈائنگ ہال کو جاتا ہے۔ تمام طلبا کو یکساں وردی ملتی ہی یہی انہیں ہر وقت پہننی پڑتی ہی خواہ سکول سے باہر بھی ہوں۔ اگر کوئی طالب علم بلا وردی پایا جائے یا مدرسہ سے باہر کچھ شرارت کرتا ہوا تو پروکٹر صاحبان جو اِس درسگاہ میں کئی ہیں اسکو سزا دیتے ہیں۔

قبل اس کے کہ دار الشفقۃ کا یہ مختصر ذکر ختم کیا جائے یہ بیان کر دینا بھی بےمحل نہوگا جو مَیں نے اس مدرسہ کے ایک معلّم سے سُنا تھا کہ حال ہی میں چار نوجوان مُسلمان تاتار (وسط ایشیار) سے قسطنطنیہ آئے ہیں اور اپنی بیویوں کو بھی ساتھ لائے ہیں

کہ خود بھی دار الشفقتہ میں علم حاصل کریں اور انہیں بھی پڑہائیں - یہ نوجوان خواتین آجکل زنانہ نارمل سکول میں معلّمی کی تعلیم حاصل کر رہی ہیں اور انکے شوہر کالج میں پڑھتے ہیں - چونکہ متاہل ہیں اور انکی بیویاں بھی انکے ساتھ ہیں اسواسطے کالج (بورڈنگ ہوس) کی لازمی سکونت سے بری کر دیئے گئے اور بمعہ متعلقین شہر میں رہتے ہیں - اس نظیر کی ندرت اور اخلاقی جرأت قابلِ توجہ ہے -

جب ہم اس مدرسہ کو دیکھ بھال چکے تو ڈاکٹر ڈیوڈ ہمیں خواجہ موسیٰ کاظم آفندی کے ہاں لیگئے جنکی نسبت انہوں نے ہم سے ذکر کیا تھا کہ بڑے روشن خیال مولوی ہیں اسلام کی فلاسفی کو اچھی طرح سمجھتے ہیں اور اس کے اصول و احکام کو جدید سائنس سے تطبیق دے سکتے ہیں - مگر افسوس کہ وہ اس وقت گھر پر نہ تھے -

۴ ستمبر یوں تو دار السعادۃ میں ساری ہی ملاقاتیں جنکا ہمیں موقعہ ملا نہایت دلچسپ رہیں - لیکن ایک ملاقات جس کا ذکر آگے آتا ہے - دلچسپی میں پچھلی سب ملاقاتوں سے بڑھ گئی - یعنی مارشل ادھم پاشا فاتح تھسلی سے ملاقات ہوئی -

یہ وہ مشہور جرنیل ہیں جو اب سے چند ہی سال قبل ٹرکی کی تاریخ میں نمایاں کام کر چکے ہیں اس لئے ہمیں قدرتی طور پر ان سے نیاز حاصل کرنے کا از حد اشتیاق تھا - ٹرکی میں آجکل مشاہیر کی ایسی بے وقعتی ہے کہ محل سلطانی کے ایک معزز اہلکار نے جنکے کمرہ میں غازی ادھم پاشا سے ہماری ملاقات ہوئی - ہم سے بڑے استعجاب کے ساتھ پوچھا کہ ادھم پاشا سے آپ سے کیا واسطہ ہے اور انکو دیکھنے کے آپ اس درجہ مشتاق کیوں ہیں؟ ہم نے عرض کیا کہ ہماری اور کوئی غرض نہیں صرف انہیں دیکھنے کی خواہش ہے اور وہ اس لئے کہ پاشائے ممدوح جنگِ ٹرکی و یونان کے ہیرو ہیں اور تھسلی کے میدان کارزار

میں ترکی سپاہ کے سپہ سالار تھے۔ زمانہ جنگ میں چونکہ ہم اُنکی شجاعت وغیرہ کے بہت کچھ حالات اخباروں میں پڑھتے رہے ہیں لہٰذا ہمارا شوقِ دید بے محل نہیں۔ ہم صبح کے دس بجے محل شاہی میں پہنچے۔ تھوڑی دیر بعد پاشائے ممدوح بھی تشریف لائے۔ ہم نے دیکھا کہ زمانۂ جنگ سے ابتک اُنکے چہرہ مُہرہ اور ڈیل ڈول وغیرہ میں کوئی بڑا فرق نہیں پڑا۔ اُنکی جو شکل وصُورت اور تن و توش اُن دنوں باتصویر اخبارات میں دیکھ چکے تھے قریبًا بالکل ویسا ہی اب بھی پایا۔ جس خوش خلق و نوازش سے آپ نے مُلاقات کی اور جیسی گرمجوشی و تپاک سے ہمارے ساتھ کوئی گھنٹہ بھر گفتگو فرماتے رہے وُہ ہمیں مدّت العمر نہ بھُولے گی۔ جیسا کہ یہاں عام دستور ہے ادھم پاشا کے ہاتھ میں بھی ایک تسبیح تھی۔ آپ ہم سے بات چیت کر رہے تھے اور تسبیح کے دانے بڑی تیزی کے ساتھ اُنکی اُنگلیوں سے نکل کر کھٹا کھٹ گرتے جاتے تھے۔ یہ دیکھ کر مجھے زمانہ سلف کے مُسلمان نبرد آزماؤں کا خیال آیا جو طاعت وعبادت میں بھی ایسے ہی سرگرم ومخلص ہوتے تھے جیسے کہ حرب وضرب میں چُست وستعد۔ ہم نے اثنائے گفتگو میں اُن سے کہا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ محض لفظ جنگ کا کان میں پڑنا ہی آپ پر بڑا گہرا اثر ڈالتا ہے۔ اور آپ کے چہرہ سے وُہ اثر نمایاں ہوتا ہے۔ اِس پر آپ مُسکرائے اور فرمایا کہ جس شخص کی ساری عمر فوجی خدمت میں گذری ہو اُس میں اس قسم کا احساس ہونا قدرتی بات ہے۔ فرمانے لگے گذشتہ جنگِ جاپان و رُوس کے زمانہ میں میری بڑی خواہش تھی کہ میدانِ کارزار میں کسی طرح اُڑ کر بھی جا پہنچوں اور لڑائی کا رنگ بچشمِ خود دیکھیں۔ مَیں اس کے واقعات بڑی گہری دلچسپی سے پڑھتا رہا اور اگر مجھ کو اجازت ملجاتی تو ضرور ہی جاتا۔ آپ نے ہماری اِستدعا پر اپنی تازہ ترین تصویر

عنائت فرمانے کا وعدہ کیا۔ ہم آپ کی عنائت کا شکریہ ادا کرکے واپس چلے آئے۔
تیسرے پہر کو مَیں پھر احمد احسان بے سے ملنے دفتر ثروت الفنون کو گیا۔ یہ قسطنطنیہ میں میرے سب سے پہلے مُلاقاتیوں میں تھے لیکن افسوس کہ پہلی مُلاقات کے بعد سے اب تک میں اُن سے ملنے کو نہ جاسکا تھا۔ اُنہوں نے ہم سے وعدہ کیا تھا کہ بروسہ کی سَیر کے واسطے ایک سفارشی چِٹھی لکھدینگے۔ چنانچہ اُنہوں نے ولائت خداوندگار کے سیکرٹری کے نام ایک خط مجھے لکھدیا۔ آجکل بروسہ اسی ولایت کا صدر مقام ہے۔ آپ نے مجھے یہ بھی بتلایا کہ وہاں مقامی دستکاریوں کی ایک نمائش کھولی گئی ہے۔ اور یہ نمائش بہت قابلِ دید ثابت ہوئی۔

۵ستمبر آج صبح ہمیں ایک ایسے بزرگ کو دیکھنے کا موقعہ ملا جس کا وجود ایک خاص اہمیّت رکھتا ہے۔ مُلاقات غیر متوقعہ طور پر ہی ہوگئی۔ لیکن سخت افسوس ہوتا اگر ہم اس سے محروم رہتے۔ شیخ محمد عبد الہدیٰ وُہ بزرگ ہیں جنکے قیامِ قسطنطنیہ کی مدت تو اعلیحضرت سُلطان المعظم کے زمانۂ حکومت کے قریبًا برابر ہوگی۔ لیکن سادات کرام کے ایک محترم خاندان اور ایک مشہور سلسلۂ اولیا میں سجادہ نشین ہونیکی شہرت آپکو عہدِ ہمایوں سے پہلے ہی حاصل تھی۔ عام سیّاحوں کو اُنسے شرفِ مُلاقات کا شاذ و نادر ہی موقع ملتا ہے۔ چونکہ آپ کسی منصب سرکاری پر مامور نہیں ہیں اس لئے کاروباری طریق پر تو کوئی شخص آپ سے ملنے نہیں جاسکتا۔ اعلیحضرت آپ کی فضیلت اور تقدّس پر بہت کچھ عقیدت رکھتے ہیں اس لئے بہتیرے لوگ شیخ ممدوح کی نظرِ عنایت کے آرزومند رہتے ہیں۔ لیکن چونکہ آپ اپنے اس رسوخ و اثر سے غرضمندوں کو فائدہ پہنچانے سے ہمیشہ گریز کرتے رہے۔ اِس سبب سے ہر کسی کو اُنکے ہاں بار نہیں ملتا۔ باوجودیکہ

آپکے گرد و پیش ہر قسم کے سامانِ اِحتِشام جو قسطنطنیہ میں مہیّا ہونے ممکن ہیں ہر وقت موجود ہیں - مگر آپ بالکل درویشانہ زندگی بسر کرتے ہیں - آپ عربی کے اچھّے فاضل ہیں اور جو وقتِ فرصت آپکو ملتا ہی اپنے طریقۂ رفاعیہ کے متعلّق کتابیں لکھنے میں گذارتے ہیں۔ ایشیائی رُوم میں سید احمد رفاعی نام ایک ولیِ کامل گذرے ہیں - شیخ موصُوف انہیں کے سلسلہ میں لوگوں سے بیعت لیتے ہیں - انکے ہاں ذکر بالجہر کا طریق جاری ہے اور اس بات پر بڑا زور دیا جاتا ہے کہ طریقت اور شریعت دونوں کو پہلو بہ پہلو ملحوظ رکھنا چاہیئے -

جب ہم نے باہر کے پھاٹک پر شیخ موصوف کے مُلازم کو اپنے کارڈ دیئے اور کہا کہ ہم شیخ ممدوح کی زیارت کرنا چاہتے ہیں تو وہ بنظرِ تعجب ہماری طرف دیکھنے لگا کہ انہیں کہاں موقع ملاقات کا حاصل ہو سکیگا - تاہم وُہ کارڈوں کو لیکر اندر چلا گیا اور ہمیں ایک دیوانخانے میں بٹھلا گیا - ابھی ہمیں بیٹھے چند ہی منٹ گذرے تھے کہ ہمیں اندر طلب کر لیا گیا - ہم ایک صحن اور چمن میں سے گذرتے ہُوئے حضرت کی خدمت میں پہنچے - ایک بڑے عالیشان اور آراستہ کمرہ کے ایک کونے میں آپ تشریف فرما تھے - چھوٹا سا سبز عمامہ سر پر تھا اور ایک ڈھیلا ڈھالا چوغہ زیبِ بر - شکل بہت ہی بارُعب و مؤثر پائی ہو - آنکھ میں ایک خاص تاثیر ہے جو ایسے لوگوں کا حصّہ ہی - جب ہم اندر داخل ہُوئے تو آپ نے لُطف آمیز تبسّم فرمایا اور بڑی مہربانی سے پیش آئے حتّٰی کہ ہمارے دِلوں میں سُنی سُنائی باتوں کی بنا پر انکی طرف سے جو خیالات بے التفاتی کے پیدا ہو گئے تھے وُہ سب یک لخت دُور ہو گئے - اثنائے گفتگو میں اہلًا و سہلًا کے الفاظ خیر مقدم اکثر آپ کی زبانِ مُبارک پر آتے تھے - آپکی گفتگو

دُنیوی مُعاملات کے متعلق نہ تھی بلکہ سرتاسر مذہبی و اخلاقی پند و نصائح پر مشتمل تھی - کہیں کہیں اپنی مذہبی تصانیف اور رفاعی بزرگانِ سلف کے اقوال و تحریرات کا حوالہ بھی ہوتا تھا - آپ نے ازراہِ مہربانی اپنی بعض تصنیفات کے نسخے بھی ہمیں مرحمت فرمائے - اور یہی ارشاد کیا کہ کل شام کو یہیں کھانا کھائیے اور ذِکر کے حلقہ کو بھی دیکھئے - جسے ہم نے بطیبِ خاطر منظور کیا اور اُن سے رخصت ہو کر گھر آگئے -

۶ ستمبر | آج صُبح کو ہز اکسلنسی نظیف بے ہم سے ملنے آئے جنکے دفتر کو ہم ایک روز بغرضِ ملاقات گئے تھے - مگر وُہ اُسوقت وہاں موجود نہ تھے - اب آپ مُلاقاتِ بازدید کے واسطے تشریف لائے - آپ فارسی بول سکتے ہیں - چونکہ ہز اکسلنسی ملازمتِ سرکاری اختیار کرنے سے قبل ایک مشہور مصنّف اور وقائع نگار رہ چکے ہیں - بڑے روشن خیال اور مذہبی معاملات میں وسیع المعلومات ہیں - اِسوجہ سے آپ کی مُلاقات میری لئے اور بھی باعثِ مسرت ہوئی - ٹوکیو پایۂ تخت جاپان میں جو مذہبی کانفرنس منعقد ہونے والی تھی وُہ اگر ہوتی تو اس میں شریک ہونے کے واسطے جو وفد ٹرکی سے روانہ ہوتا اُس کے ایک ممبر ہز اکسلنسی بھی منتخب ہُوئے تھے - مَیں نے آپ سے یہ خیال ظاہر کیا کہ مُسلمانانِ عالم کی ایک عام کانفرنس قائم کیجائے جس میں تمام اقطاع کے چیدہ چیدہ اشخاص شامل ہو کر مُسلمانان کے مذہبی تمدنی اور تعلیمی معاملات پر غور و خوض کیا کریں اور جس سے تمام مُسلمانوں کا سود و بہبود بلا کسی امتیاز و تفریق کے مقصود ہو - ہز اکسلنسی نے اس رائے سے اتفاق کیا اور فرمایا واقعی اس کی بڑی ضرورت ہے - مَیں نے عرض کیا کہ نظر بحالاتِ موجودہ اس قسم کی کانفرنس یا تو ہندوستان میں برٹش جھنڈے کے زیرِ سایہ قائم ہو سکتی ہی یا کسی مصر

جیسے مقام پر جہاں عہدِ برطانیہ کی برکت سے تحریر و تقریر کی آزادی حاصل ہے۔ اُنھوں نے فرمایا کہ ٹرکی والوں میں سے جو لوگ اِس میں شریک ہونا پسند کریں اُنکے لیے مصر کا مقام اِس کانفرنس کے قیام کے لئے زیادہ موزون ہے۔ مَیں نے کہا اِسے مَیں بھی تسلیم کرتا ہُوں کہ مصر اِس مقصد کے لئے ایک اچھا مرکز و موقع ہوگا اور چُونکہ اُس مُلک کی زبان عربی ہے۔ اِس لیے مُسلمانوں کی ایک عالمگیر کانفرنس کے لئے وُہ اَور بھی زیادہ مناسب ہے۔ کیونکہ عربی کو کم و بیش تمام ممالک کے تعلیم یافتہ مُسلمان و کلائے ملت سمجھ سکینگے۔

آج سہ پہر کو ہم پھر شیخ محمد عبدالہدیٰ کے مکان پر گئے۔ آپ اس وقت باغچہ میں ایک چھوٹے سے بنچ پر تشریف رکھتے تھے۔ آپ کا ایک مُرید بھی پاس تھا بعد میں چند اَور مُرید آ کر ارد گرد بیٹھتے گئے۔ گفتگو قلب اور زبان کے متعلّق ہو رہی تھی۔ اِس پر اُنھوں نے نہایت عالمانہ بحث کی۔ جب شام ہونے لگی تو پہلے کچھ سماع کا شغل شروع ہوا۔ پھر اُنکے تین مرید مِلکر عربی کا ایک قصیدہ بلا امداد مزامیر پڑھنے لگے جو سید احمد رفاعی کی شان میں تھا۔ شیخ موصُوف کے ہاں اس زبانی ترنّم کے سوائے اَور کسی قسم کا سماع مروّج نہیں ہے۔ بعد ازاں شیخ صاحب تو ادائے نماز کی غرض سے اندر چلے گئے اور باقی حاضرین مسجد کو جو احاطۂ مکان ہی میں بنی ہُوئی ہے۔ نماز کے بعد کھانے کا وقت تھا۔ اور کھانے کے بعد نمازِ عشا کا وقت۔ اِن سب کاموں سے فراغت پا کے ذِکر بالجہر شروع ہوا جس میں تمام اہلِ حلقہ مِل کر لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کے نعرے اس زور سے اور ایسے حزنانگیز و موثر لہجہ میں لگاتے تھے کہ دِل ہلائے ڈالتے تھے۔

، ستمبر آج خوجہ[1] موسیٰ کاظم آفندی مع ڈاکٹر ڈیوڈ کے تشریف لائے۔ ہم انکے ساتھ مسئلہ تعلیمِ نسواں پر گفتگو کرتے رہے اور انہیں اس کا بڑا مؤید پایا۔ آپ کی یہ رائے تھی کہ اکثر و بیشتر خواتین کے لئے تو معمولی نوشت و خواند ہی کافی ہوگی۔ لیکن جنہیں اسکی مقدرت ہو انکو اعلیٰ تعلیم کی بھی اجازت ہونی چاہئے۔ پردہ کے بارہ میں فرمایا کہ ٹرکی میں جیسا پردہ مروّج ہے وُہ بالکل کافی اور حق بجانب ہے۔ کیونکہ گو یہاں باہر نکلنے والی مستورات منہہ پر نقاب ڈالکر اور "چرابچہ" اوڑھ کر پھرتی ہیں۔ تاہم انہیں اتنی آزادی تو حاصل ہے کہ تازہ ہوا کھانے کو جا سکیں اور وقت بے وقت اپنے حسب منشار سودا خرید سکیں۔

نمازِ جمعہ کے بعد ہم نے طریقۂ مولویہ کے درویشوں کی مجلس دیکھی جو مولانائے رُومی جیسے بزرگ کے نام لیوا ہیں۔ اور ہر جمعہ اس تعلّق عقیدت کی یادگار تازہ رکھنے کے لئے مجلس سماع کرتے ہیں۔ بلادِ یورپ میں یہ لوگ درویشانِ رقاص کے نام سے مشہور ہیں۔ یہ درویش اپنے ہال کے برآمدہ میں سے اجنبیوں کو بھی تماشا دیکھنے کی اجازت دیتے ہیں اور اسے ایک ذریعہ آمد بنائے ہوئے ہیں۔ یورپ کے سیّاح بکثرت ہر جمعہ یہ تماشا دیکھنے آتے ہیں اور اسے عجائباتِ استانبول میں سمجھتے ہیں۔ ہمیں یہ بات پسند نہ آئی کہ یہ لوگ اس طرح اس رسم کو جو ان کے نزدیک مذہبی رسم ہے۔ ذریعہ آمدنی بنائیں اور اغیار کے لئے تماشا بنیں۔ اس مجلس کی صُورت یہ ہے کہ دو تین آدمی رہنما درویشوں میں سے ساز بجاتے ہیں۔ اور باقی رقص کے جامے پشواز نما پہنکر رقص کرتے ہیں۔ مگر اس رقص میں انہیں بیخود ہوتے نہیں دیکھا۔ غالباً

[1] خوجہ۔ ٹرکی زبان میں معلم کو کہتے ہیں اور اکثر علما اس لقب سے پکارے جاتے ہیں۔
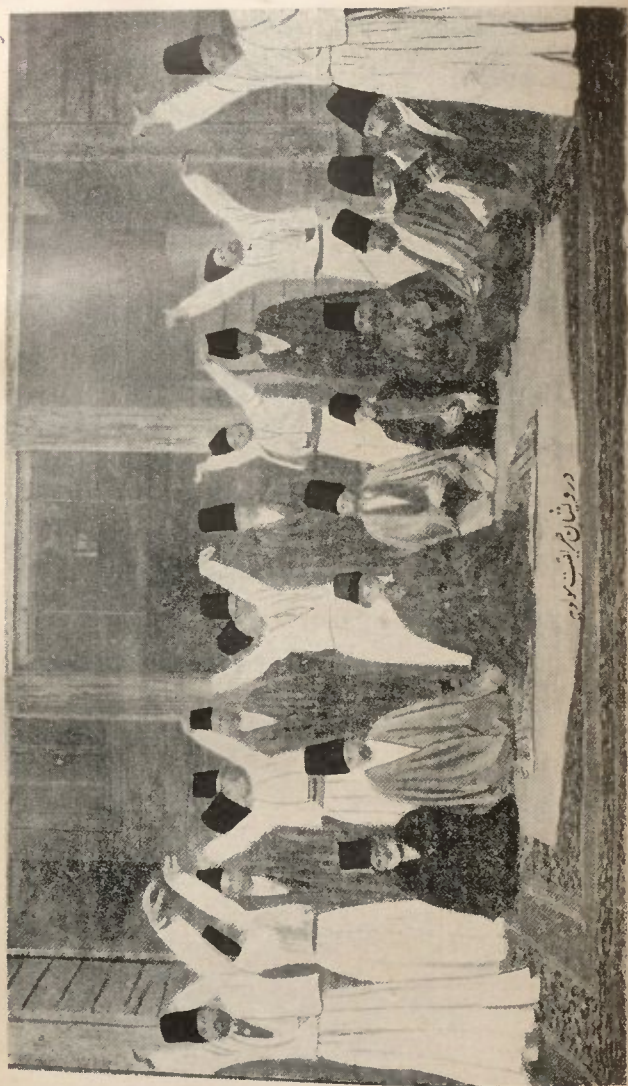
درویشان طریقت مولویه

اسکی ابتدا تو یہی ہوگی کہ صاحبانِ حال فرطِ بیخودی سے رقص میں آگئے۔ لیکن اب موجودہ یارانِ طریقت نے تو اسے ایک فن بنالیا ہے۔ اور بیٹھے بیٹھے جھٹ اُٹھ کر ساز کی آواز کے ساتھ دست وپا کی حرکات کو مِلاتے ہیں اور رقص کرنے لگتے ہیں۔ ایک فاضل ترک نے مجھے ایک حکایت سُنائی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مولانا کا یہ منشانہ تھا۔ کہ اُنکے سب پیرو بغیر صاحبِ حال ہونے کے یُوں رقص کریں۔ اس نے بیان کیا کہ روائت ہے کہ مولینا علیہ الرحمۃ ایک دفعہ تنہا بیٹھے تھے۔ حالتِ وجد میں اُٹھ کر رقص فرمانے لگے۔ دو چار مُرید جو آئے۔ اُنہوں نے مُرشد کو دیکھ کر تقلید کی۔ کچھ دیر کے بعد جب مولینا ہوش میں آئے۔ تو مریدوں کو اپنے گرد ناچتے پایا۔ ہنسے اور ارشاد کیا۔ مَیں نے تو کچھ دیکھا تھا اِس لئے خوشی کے مارے ناچنے لگا۔ تم نے کیا دیکھا ہے جو ناچ رہے ہو"۔ مثنوی شریف میں ایک لومڑی کی حکائت ہے کہ اُس نے اپنے حیلے سے شیر کو کنوئیں میں گرادیا تھا اور کنوئیں کے گرد خوشی سے ناچ رہی تھی۔ جنگل کے اَور جانور آئے اور اُسے دیکھ کر ناچنے لگے تو اُس نے انہیں کہا کہ مَیں نے تو کچھ دیکھا ہے جب ناچ رہی ہوں۔ تم بے دیکھے بھالے اور بے جانے بُوجھے کیا کر رہے ہو۔ میرے فاضل دوست کہتے تھے کہ اس حکایت میں مولینا نے اپنے اس واقعہ کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ مگر افسوس اُنکے نام لیوا اس ہدایت کی طرف سے بے پروا ہیں۔ اس طریقت کے درویشوں کا ایک خاص لباس ہے جس میں نمدہ کی لمبی ٹوپی خاکی رنگ کی خصوصیّت سے قابلِ ذکر ہے اور وُہ ہر جگہ اس اپنی وردی سے پہچانے جاتے ہیں۔

۸۔ستمبر | آج ہم دفترِ صیغۂ خارجیہ کو گئے، تاکہ اجازت حاصل کریں کہ جلال اُنسی بے
سیرِ بروسہ میں ہمارے ساتھ رہیں۔ یہ اجازت اُسی وقت مل گئی۔ اور ہماری روانگی
بروسہ سہ شنبہ کے روز قرار پائی۔

۹۔ستمبر | اس تاریخ میں کوئی قابلِ ذکر واقعہ پیش نہیں آیا۔

۱۰۔ستمبر | آج ایک ایسے شخص ہم سے ملنے تشریف لائے جنکی مُلاقات ہمارے لیے
نہایت دلچسپی کا باعث ہُوئی۔ وُہ کون؟ حاجی یوسف بے بحری کالج واقعہ جزیرۂ
ہلکی کے پروفیسر انگریزی جو بلحاظِ پیدائش باشندۂ سکاٹلینڈ ہیں لیکن اُنکے خاندان
کے تمام ارکین مع اُنکے والد بزرگوار کے مشرّف باسلام ہو چکے ہیں جسے چالیس
سال سے اُوپر عرصہ گذرا۔ آپ کا خاندانی نام "کاسل" ہے۔ اور جس زمانہ یہ گھرانا
میں داخل ہُوا ہے اُن دنوں انگلستان میں اس تبدیلِ مذہب کا بہت چرچا ہُوا
حاجی صاحب ممدوح کے قبولِ اسلام کی قدامت کو ملحوظ رکھ کر یہ سمجھنا چاہیے
میں نے ان سے پہلے کا نومسلم انگریز کوئی نہیں دیکھا۔ حاجی صاحب اب ترکی
زبان ایسی بے تکان اور بلا تکلف بول سکتے ہیں کہ گویا وُہ اُنکی مادری زبان
اور علاوہ اس کے اَور بھی کئی زبانیں جانتے ہیں۔ آپ ایک بڑے سیاح بھی
مختلف صُوبجاتِ ٹرکی کے متعلق پُوری پُوری معلومات رکھتے ہیں۔ کیونکہ
میں سے اکثر حصص آپ کے چھانے ہُوئے ہیں۔ عبادات و معتقداتِ اسلام
سے اُنہیں بڑی گہری واقفیت ہے۔ ایسی سطحی معلومات نہیں جو اکثر نومسلموں
کرتی ہیں پس آپ کی مُلاقات میں ہمارا جو وقت صرف ہُوا وُہ بہت ہی لطف
اور اگر ہمیں سیرِ بروسہ کے واسطے پاسپورٹ لانے کو جانا نہ ہوتا تو ہم اُن

کچھ دیر اَور بھی بات چیت کرتے رہتے۔ یہ دستور یہاں بڑا ہی ناگوار ہے کہ قسطنطنیہ سے باہر۔ خواہ قلمروئے عثمانیہ ہی میں جب کہیں آؤ جاؤ۔ تب بھی نیا پروانۂ راہداری حاصل کرنا پڑتا ہے۔ یہ قاعدہ خصوصًا اُن سیّاحوں کے واسطے تو اَور بھی زیادہ تکلیف دِہ ہے جو بلا کسی ایسی قیود کے سفر کرنے کے عادی ہوں یہ سلسلۂ آمد و رفت اور کاروبارِ تجارت کی ترقی میں بھی بلاشبہ بہت کچھ حارج ہے کیونکہ آمد و رفت کی آزادی پر ہی تجارت کا بڑا دارومدار ہے۔ مگر شکر ہے کہ اِس پروانہ (یول تذکرہ) کے ملنے میں ہمیں کچھ بہت تکلیف نہ اُٹھانی پڑی۔ بس اتنا ہوا کہ پہلے ہم قونصل خانہ برطانیہ کو گئے اور اپنا پہلا پاسپورٹ پیش کیا۔ جہاں فرنچ زبان میں ایک فارم کی خانہ پُری کی گئی یعنی ہمارا پتہ نشان وغیرہ درج کیا گیا۔ اور ہمیں مقامی پولیس آفیس کو جانے کی ہدایت ہوئی۔ وہاں اِس فرنچ فارم سے ترکی زبان میں پروانۂ راہداری تیار کیا گیا۔ اور دونو جگہ فارم ہائے مذکورہ کا خفیف سا عوضانہ حسبِ نرخِ مقرّرہ سرکاری لیا گیا۔

۱۱۔ستمبر | صبح سویرے ہی ہم مقام مدانیہ کو جانے کیلئے جہاز پر سوار ہونے گھاٹ کی طرف گئے۔ یہ وُہ مقام ہے جہاں عازمانِ بروسہ جاکر خشکی پر اُترتے ہیں جلال بے نے انسپکٹر بحری سے ہمارا تعارف کرایا۔ اِنہی کے کمرہ میں ہماری ڈاکٹر احمد رفیق پاشا سے واقفیت ہوئی جو فوجی کالج کے پروفیسر ہیں۔ ہمارا جہاز نو بجے کے قریب مدانیہ کو روانہ ہوا اور دو بجے وہاں جا پہنچا۔ یہ مسافت کسی بڑے جہاز میں اور ذرا زیادہ تیز رفتاری سے اسکی نسبت آدھے وقت میں طے ہوسکتی ہے۔ پھر بھی چونکہ دن اچھا تھا ہمارا یہ چھوٹا سا بحری سفر خاصے لُطف کا رہا۔

اُس روز سمندر سکون کی حالت میں تھا اور سورج کی کرنیں مشرقی یورپ کے نیلے پانی پر پڑ پڑ کر ہر طرف ایک نظر فریب سماں پیدا کر رہی تھیں۔ مدانیہ سے بروسہ کو ایک چھوٹی سی ریل گئی ہی جو زیتون کے خوبصورت باغات اور تاکستانوں سے گذرتی ہوئی قدیم پایہ تخت عثمانیہ کو جا پہنچتی ہے۔ اگر ہم اس میں سوار ہوتے تو کوئی ڈیڑھ ہی گھنٹے میں منزلِ مقصود پر پہنچ جاتے۔ لیکن چونکہ ہمیں بتا دیا گیا تھا کہ رستہ میں بہت سے قابلِ دید منظر ہیں جنکی سیر گاڑی میں بیٹھ کر جانے سے خوب ہو سکتی ہے۔ لہٰذا ہم نے ایک اچھی آرام دہ لینڈو گاڑی لی اور اس میں کوئی تین گھنٹے کے اندر بروسہ پہنچے۔ جس وقت ہم شہر میں داخل ہوئے ہیں شام ہو چلی تھی۔ اور اس قدیم بستی کا منظر مشہور "قلّہ کوہِ المپس" کی آغوش میں بکتا جاتا تھا۔ ہاں اس کے مکانات برابر برابر دامنِ کوہ سے سر نکالے اور اسکی چوٹیوں سے باتیں کرتے ہوئے بہت بھلے معلوم ہوتے تھے۔ یہاں جو ہوٹل ہمیں سب سے پہلے نظر آیا۔ ہم اُسی میں اُتر پڑے اور دیکھا کہ وہ بہت صاف سُتھرا اور آرام دہ ہے۔ گو وہ تکلفات اور سامانِ آسائش میں تو یورپ کے معمولی ہوٹلوں کی بھی برابری نہ کرسکتا تھا لیکن پھر بھی بعض باتوں کے لحاظ سے اُس میں انکی نسبت کہیں زیادہ آرام مل سکتا ہی اور کم خرچ ہونے میں تو کچھ شک ہی نہیں۔ اس ہوٹل کا مالک بھی مسلمان ہی اور مینجر بھی۔ ہم نے اس میں اپنی مرضی کے مطابق کمرے لے لئے۔ اور اپنا اسباب وغیرہ ٹھیک ٹھاک کرتے ہی والئے ولایتِ بروسہ کو کہلا بھیجا کہ ہم آن پہنچے ہیں۔ اور ساتھ ہی وہ معرفی کی چِٹھی بھی انکی خدمت میں بھیجدی جو ہمیں وزیر داخلیہ نے ازراہ مہربانی لکھ کر دی تھی۔
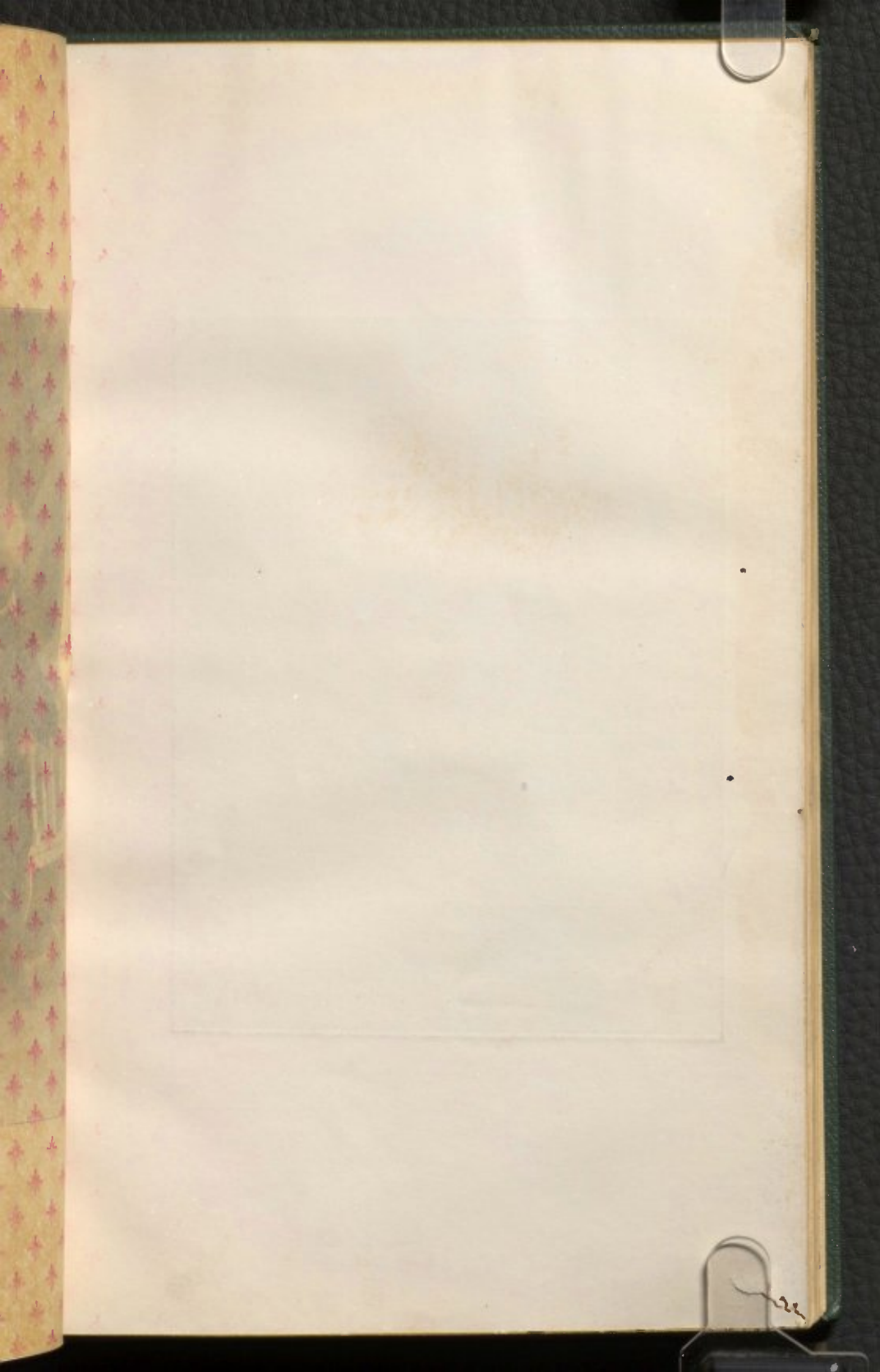
علو جامع (بروسه)

والئی بروسا کے ساتھ تین مہمان

اس سفر میں جلال النی بے کے سوا اُنکا چھوٹا سا صاحبزادہ مظہر النی بے جسکی عمر کوئی نو برس کی ہوگی ہمارے ساتھ ہو لیا تھا۔ مَیں نے ایسا ذہین اور خوش تربیت بچہ کم دیکھا ہے۔ اسکی بدولت والئی بروسہ کے ہاں ایک عجیب لطیفہ ہوا۔ جو چِٹھی ہم اُنکے نام لائے تھے اُس میں ہم تینوں کا نام تھا۔ جب ہم جناب والئی پاشا کی ملاقات کو گئے تو وُہ مظہر بے کو دیکھ کر متبسّم ہوئے اور پُوچھا تم کون ہو۔ اُس نے کہا مَیں بھی نصف مہمان ہُوں۔ اس کے والد نے کہا آپ کی خدمت میں "اوچ بچُق" یعنی "ساڑھے تین مہمان" استانبول سے آئے ہیں۔

۱۶ ستمبر ہم سویرے ہی سیر تماشے کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔ سب سے پہلے ہم نے مقامی دستکاریوں کی نمائش دیکھنے کا عزم کیا جو بروسہ میں نئی نئی کھلی ہی تھی۔ رستہ میں ہم کو وُہ مسجد ملی جسے "علو جامع" کہتے ہیں اور جو اس علاقہ کی مساجد میں سب سے بڑی ہے۔ یہاں کی قابلِ دید چیزوں میں ہے۔ قسطنطنیہ میں ہم نے جیسی مسجدیں دیکھیں یہ طرزِ تعمیر میں اُن سے مختلف ہے۔ اس کے اندر چھت کے درمیانی گنبد کے نیچے ایک خوبصورت حوض بنا ہوا ہے۔ جس کے بیچوں بیچ فوارہ لگا ہوا ہے اور گنبد اس طرح بنایا گیا ہے کہ ہوا اور روشنی بخوبی اندر آسکے اور مسجد کی ساری عمارت بھی اچھی طرح نظر آئے۔

مسجد سے ہم نمائش کو گئے جو دلچسپیوں سے لبریز تھی۔ محض مقامی صنعت وحرفت کی نمائش ہونے کے لحاظ سے اُس کا حسنِ انتظام بھی بہت قابلِ داد تھا اور اس سے ذمہ دار حکّام نیز والئے ولایت کی مستعدی و قابلیت عیاں ہوتی تھی جنہوں نے اسکی امداد و حوصلہ افزائی میں پُوری سرگرمی و توجہ کو

کام فرمایا تھا۔ میں چاہتا ہُوں کہ اس کا کچھ تفصیلی حال بھی ہدیۂ ناظرین کروں۔ کیونکہ ایک صُوبہ کے صدر مقام ہیں۔ اِس قسم کی نمائش کا باقاعدہ انتظام میرے نزدیک قلمروِ عثمانیہ میں حرفتی بیداری کی ایک نیک فال ہے۔ اس بیداری کو اگر درجۂ تکمیل تک پہنچنے کا موقعہ ملا تو اُمّید ہے کہ وُہ ٹرکی کو دُنیا کی ممتاز اقوام کے ہم پلّہ بنا دیگی۔

یہ نمائش ایک وضعدار اور جدید طرز کی خوشنما عمارت میں تھی جو خاص اسی غرض سے بنائی گئی تھی۔ اِس میں نمائشوں والی معمولی دلچسپیاں سب موجُود تھیں۔ فرش کی درستی بڑی احتیاط سے کی گئی تھی۔ اندر ہی بینڈ باجہ کا ایک سٹینڈ تیار کیا گیا تھا جس میں تیسرے پہر کو باجہ بجتا تھا۔ اشیاء نمائش دستکاروں کی ترتیب کو ملحُوظ رکھ کر سجائی گئی تھیں۔

سب سے پہلا کمرہ جس میں ہم داخل ہُوئے۔ مقامی مکاتب دستکاری کی کاریگریوں کے نمونوں سے بھرا پڑا تھا۔ اور اُس سے وُہ حرفتی تعلیم بخوبی عیاں ہوئی تھی جو وہاں طُلبا کو دیجاتی ہے۔ انکا لکڑی۔ لوہے اور پیتل کا تمام کام نہایت خوبصُورت تھا۔ مکتب کی دستکاریوں میں جلد بندی کا کام بھی حسن و خوبی میں کچھ کم نہ تھا۔ اور بُوٹ اور جوتے بھی جو طلبہ نے بنائے تھے بہت عمدہ تھے۔ چونکہ یہ تعطیل کے دن طُلبا حساب کتاب لکھتے تھے اور کچھ مصنوعات دکھلانیکی غرض سے وہاں موجُود تھے۔ دُوسرے کمرہ میں مختلف اقسام کے وُہ پتھر ایک ترتیبِ خاص سے سجائے گئے تھے جو نواحِ شہر میں دستیاب ہوئے تھے۔ نیز اُن پتھروں کی بنی ہُوئی چیزیں۔ اور ساتھ ہی وُہ مختلف اقسام کے معدنی پانی جنکے لئے بروسہ مشہور ہے۔

تیسرے میں چرمی اسباب تھا۔ اور چوتھے میں یورپی طرز کے جدید آلاتِ کشاورزی یہ آلات ایک مقامی کارخانہ کے تیار شدہ تھے جو کسی یونانی کی ملکیت ہے۔ ایک اور کمرہ میں کھانڈ اور اس سے بنی ہوئی تمام قسم کی مٹھائیاں۔ خاصکر لوکم وغیرہ شیرینیوں کی سجاوٹ بہت دلچسپ تھی۔ یہ سب خاصکر بروسہ کی بنی ہوئی تھیں اور چوکولیٹ وغیرہ ایسی چیزوں کے ساتھ جو یوروپین مذاق میں عام طور پر دلپسند ہیں نہایت خوش اسلوبی سے چنی ہوئی تھیں۔ اُنکے علاوہ پارچہ بافی۔ صابون سازی۔ قالین بافی۔ سگرٹ سازی وغیرہ ہر قسم کی دستکاریوں کے جُدا جُدا کمرے تھے۔ نقشہ کشی اور رنگسازی کا سامان اور نمونے بھی ایک عظیم الشان ہال میں سجے ہوئے تھے۔ عطریات اور عجائبات و نادرات جو بروسہ اور اس کے علاقہ گرد و نواح سے مخصوص ہیں۔ انکا حصہ بھی قابلِ دید اور لائقِ داد تھا۔ لیکن ان سب سے بھی زیادہ خصوصیت اُن کمروں میں پائی جاتی تھی جن میں ریشم کے کویوں کی پرورش۔ ریشم کے تننے بننے وغیرہ کے سامان دکھائے گئے تھے۔ اور بہت سے کمروں میں بروسہ کے بڑے بڑے قیمتی ریشمی پارچات اور بیش بہا ریشمی تولئے دھرے تھے۔ ہمیں حرفتِ ریشم کی ساری ترکیبیں بروسہ کے شاہی مکتبِ ابریشم کے ایک پروفیسر نے اچھی طرح سمجھا سمجھا کر دکھلائیں۔ غرض ہم اس نمائش کی سیر سے بہت ہی خوش ہو کر نکلے۔ اگرچہ ہماری جیب بہت کچھ ہلکی ہو گئی تھی۔

جب ہم اپنے ہوٹل کو واپس آئے تو سُنا کہ والئے ولایت کی طرف سے کوئی اہلکار صُبح کے وقت آیا تھا۔ مگر ہم وہاں موجود نہ تھے اِس لئے وُہ پھر کسی وقت آئیگا۔ چنانچہ چند ہی منٹ بعد وُہ صاحب پھر تشریف لے آئے۔ یہ نہیب سے

عیسائی تھے اور والئ ولایت کے ناظرِ اعلیٰ۔ آپ کا یہ پیغام لیکر آنا ہوا کہ والی صاحب یاد فرماتے ہیں اور بڑی خوشی سے آپ کا خیر مقدم کرینگے۔ ہم یہ سُنکر پراونشیل گورنمنٹ کے ہیڈ کوارٹر کو روانہ ہوئے اور ہز اکسلنسی توفیق بے کی خدمت میں پہنچے جو محکمہ امپیریل سیکرٹریٹ میں بڑے بڑے ذمہ واری کے مناصب پر ممتاز رہ چکے ہیں اور اب ولایتِ خداوندگار کے گورنر ہیں۔ ایشیائی ٹرکی کا اہم ترین صوبہ ہے اور جس کا بروسہ صدر مقام ہے۔ آپ کی گفتگو ہمارے ساتھ زیادہ تر ترجمان کے توسّط سے ہوئی مگر فرنچ بخوبی فرنچ جانتے ہیں اور اُس وقت بھی کسی قدر اسی زبان میں بات چیت کی۔ آپ کی عمر کوئی چالیس سال ہوگی۔ بڑے سنجیدہ اور متین آدمی ہیں اور اپنے کام میں بڑے محنتی و مستعد۔ آپ نے اپنے ایک معتمد اہلکار کو بلوایا اور اُن کی خدمات ہمارے سپرد کر دیں۔ اب ہمارے پاس دو سرکاری گائڈ ہو گئے۔ انکی معیّت میں ہم اس جگہ کے باقی قابلِ دید مقامات کی سیر کو نکلے۔ لیکن روانہ ہونے سے پہلے کچھ دیر احمد نظیف بے کے ساتھ مزے مزے کی باتیں کرتے رہے۔ جو والئ ولایت کے کاتبِ اوّل یعنی فسٹ سیکرٹری ہیں اور جنکے نام ثروت الفنون کے ایڈیٹر نے ہمیں چٹھی لکھدی تھی۔

پھر ہم وہ درسگاہ دیکھنے گئے جہاں ریشم کا کام سکھلایا جاتا ہے۔ یہ ایک خوبصورت عمارت ہے۔ ہر قسم کی ضروریات سے آراستہ۔ اب سے ۲۲ سال قبل جاری ہوئی تھی اور اب تک یہاں سے بڑے بڑے قابل آدمی کام سیکھ کر اس حرفت کے اکثر کارخانوں کو جاتے رہے ہیں۔ اور نئی عمارت جس میں یہ انسٹی ٹیوشن اب واقع ہے۔ کوئی دو ہی برس ہوئے۔ بنی ہے۔ اس میں ۸۵ طالب علم درج رجسٹر ہیں
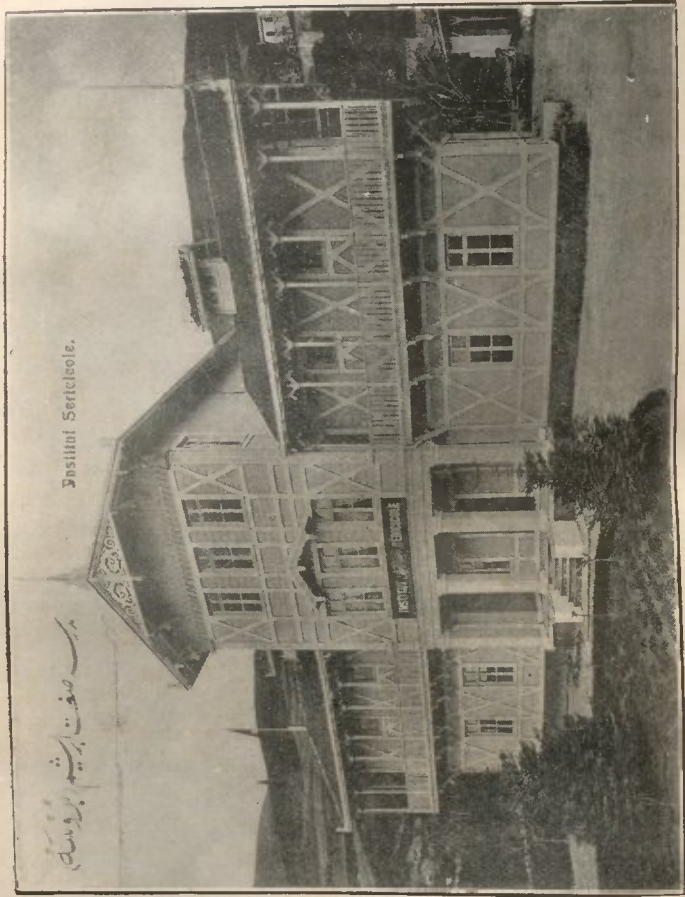
مدرسه صنعت ابریشم (بروسه)

Institut Sericicole.

اور یہ سکول روز بروز ترقی و ہر دلعزیزی حاصل کرتا جاتا ہی۔ اس کے پاس ہی ایک اور بھی جدید عمارت ہی۔ جس میں مقامی ہائی سکول واقع ہے۔ سکول سے ہم ریشم کے ایک کارخانہ کو دیکھنے گئے۔ چونکہ شہر میں اس کے کئی ایک کارخانے ہیں۔ ہم نے سوچا نمونتہً ایک تو اچھی طرح دیکھ ہی لیں۔ وہاں سے ہم مقامی ملٹری سکول کو دیکھنے گئے۔ جس کی عمارت شہر کے ایک ممتاز و بلند مقام پر واقع ہے اور سیاح کو دور ہی سے نظر آتی ہے۔ اس سکول میں کوئی دو سو طلبہ پڑھتے ہیں۔ اُن میں سے جو ذرا اعلیٰ تر نصاب کی تعلیم پاتے ہیں وُہ یہاں سے فارغ التحصیل ہو کر سنٹرل کالج قسطنطنیہ میں جا داخل ہوتے ہیں۔ ہمیں معلوم ہوا کہ فوجی تعلیم کے ایسے برانچ سکول دیگر صوبجات کے صدر مقاموں پر بھی ہیں مثلاً اورنہ اور ارض روم وغیرہ میں۔

سکول سے واپس ہوتے ہوئے ہم نے "ینشل جامع" یعنی سبز مسجد دیکھی جو ایک پرانی تاریخی مسجد ہی اس کی اینٹوں پر سبز روغن اس خوبی سے کیا گیا ہی کہ باوجود امتدادِ زمانہ روغن قائم ہی اور اسی لئے اسے کالی مسجد کہتے ہیں۔ وہاں سے لوٹ کر شہر کو آئے کہ سُلطان عثمان غازی کے مرقد پر فاتحہ پڑھیں۔ اس قبر کے کتبہ پر ایک عثمانی نشان آویزاں ہی جسے سُلطان عبد العزیز نے اپنے مورثِ اعلیٰ کی یادگار میں قائم کیا تھا۔

اس قبر کے پاس ہی ایک اور قبر سُلطان اورخان بن عثمان کی ہی۔ ان مزارات کی زیارت کر کے اور مینار کے اوپر سے شہر و نواحِ شہر کا دلفریب نظارہ دیکھ کر ہم گاڑی میں بیٹھ اپنے ہوٹل کو واپس آ گئے۔ واپس ہوتے ہوئے ہم نے رستہ خوجہ سعد الدین آفندی کے جا دستک دی۔ جو بروسہ کے ممتاز عُلماء سے ہیں۔ ہم تو آپ کو خاص

اسلامی تربیت کا ایک عمدہ نمونہ پایا۔ آپ نے ہمارے ساتھ فارسی زبان میں گفتگو کی جو آپ بڑی آسانی سے بول سکتے تھے۔ بخلاف اکثر دیگر علماء ٹرکی کے۔ اُنکے ساتھ ایک چار کی پیالی پی کر ہم ذرا تازہ دم ہوئے اور اُن سے اجازت طلب کی شام کو نیک دل خوجہ صاحب ہماری ملاقاتِ بازدید کو تشریف لائے۔ آپکے بھائی صاحب بھی ساتھ تھے۔ دونوں صاحبوں کی ملاقات سے ہم نہایت مسرور و متاثر ہوئے۔ کیونکہ ہم نے دیکھا کہ دونو کے دونو بزرگوار بڑے روشن خیال عالم ہیں۔

۱۳ ستمبر | بروسہ میں ہمارا پہلا دن تو بڑی مصروفیت میں گذرا ہی تھا لیکن دوسرا روز اس سے بھی زیادہ مشغولی کا رہا۔ پہلے ہم نے یہاں کے "چارشی" کو دیکھا جو ذرا چھوٹے پیمانہ پر ہوبہو اس بڑے بازار کا نمونہ ہے جسے ہم قسطنطنیہ میں دیکھ چکے تھے۔ وُہی وضع قطع۔ وُہی نقشہ۔ ویسی ہی مختلف قسم کی دوکانیں۔ اس میں داخل ہونے کے متعدد پھاٹک ہیں جن سے ملحق کئی کئی "خان" یعنی سرائیں بنی ہوئی ہیں۔ ان میں سے بعض میں ہزاروں پونڈ کچا ریشم روزمرہ آتا اور بکتا ہے۔ اکثر دوکانوں میں بڑے بڑے نفیس اور اعلیٰ قسم کے ریشمی مال بھرے پڑے ہیں۔ جو بیرونی دُنیا کو بہت کم معلوم ہیں اور اس قابل ہیں کہ اقطاعِ عالم میں انہیں بیش از پیش شہرت دیجائے اور دیساور میں بھیجے جائیں۔ اس بازار کی سَیر دیکھ کے ہم حمیدیہ مکتبِ صنعت وحرفت میں آئے اور اسکی سَیر سے بہت محظوظ ہوئے۔ کوئی دُو سو طلبہ اس میں داخل ہیں جو یہیں رہتے اور یہیں کتابی نیز عملی تعلیم پاتے ہیں۔ بین باشی[۱] حلمی بے پرنسپل مدرسہ نے ہمیں اپنی درسگاہ کے مختلف صیغے دکھلائے
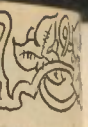
[۱] ایک فوجی رُتبہ ہے۔ ہندوستان کے شاہانِ مغلیہ کے عہدہ ہزاری کے برابر جس سے ایک ہزار سپاہ کی سرداری مراد ہوتی تھی

کارخانه ابریشم (بروسه)
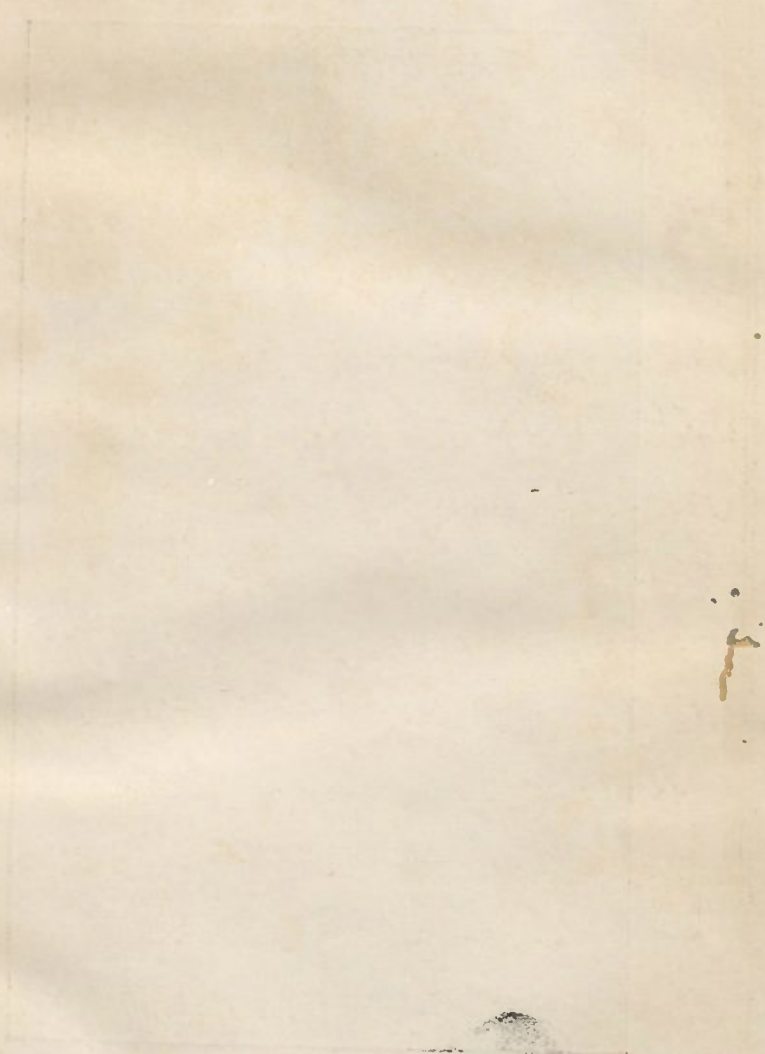
یہاں کوئی جماعت قالین بافی سیکھتی ہے۔ کوئی خیاطی۔ کوئی پاپوش سازی۔ کوئی جلدگری اور کوئی فوجی و سرکاری بینڈوں میں ملازمت کے لئے تیار کیجاتی ہے۔ ایک جماعت فنِ آہنگری کی بھی تعلیم حاصل کرتی ہے۔

اس درسگاہ میں ہر مذہب و ملّت کے طلبا، داخل ہو سکتے ہیں۔ داخلہ کی عمر دس سے بارہ سال تک ہے۔ چار یا پانچ برس میں یہ نو عمر لڑکے اچھّی طرح سیکھ کر کام کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ مختلف جماعتوں کی مدّتِ تعلیم بھی مختلف ہے۔ اوسط خرچ سالانہ قریبًا تین ہزار پونڈ ہے۔ سکول سٹاف میں آٹھ ٹیچر اور پانچ ماسٹر مختلف فنون کے ہیں۔ اس مکتب کی تاریخ بڑی دلچسپ ہے۔ اب سے ۴۴ سال قبل پبلک چندہ سے قائم ہوا تھا۔ اُسوقت اس کا سرمایہ جائداد کمپنی میں لگا دیا گیا تھا۔ جسکی آمدنی سے اس کے اخراجات چلتے رہے اور سلطانِ حال کے عہدِ مبارک میں اسکو بڑی معقول سرکاری امداد بھی ملنے لگی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج اسکی تمام ضروریات بھی بوجہ احسن پوری ہو جاتی ہیں اور کچھ رقم وافر بھی رہتی ہے۔ یہ توفیر اس کے سرمایہ مستقل میں شامل کر دیجاتی ہے۔ جو جائداد کی آمدنی سے جمع ہو گیا ہے اور بڑھتا رہتا ہے۔ میں نے سُنا ہے کہ وُہ عالیشان محل نما مکان جو والیِ ولایت کی جائے سکونت ہے اسی مدرسہ کی جائداد ہے گذشتہ پندرہ سال کے عرصہ میں تین سو آدمی مذکورہ بالا فنون کے پُورے پُورے ماہر بنکر اس انسٹی ٹیوشن سے نکل چکے ہیں اور ۴۲ نوجوان پچھلے امتحان میں کامیاب ہُوئے تھے۔ جب ہم سکول کی سیر ختم کر کے چلنے کو تھے تو جماعتِ موسیقی نے جو نہایت خوشنما وردی پہنے تھی ہمیں حمیدیہ مارچ سُنا کر مسرور کیا۔

اِس مدرسہ دستکاری کے پاس ہی شفاخانہ کی عمارت واقع ہیں جس ہیں زنانہ و مردانہ حصّے جدا جُدا بنے ہُوئے ہیں۔ رُشدی بے نے جو اس ہسپتال کے افسرِ اعلیٰ ہیں ہمیں عمارتِ متعلقہ کی اچھی طرح سیر کرائی۔ ہم نے دیکھا کہ یہاں تمام ضروری سامان اور جدید آلات وغیرہ موجُود ہیں جو ہم قسطنطنیہ میں دیکھ چکے تھے۔ جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ فنِ علاج میں ترکوں کی ترقی دار الخلافہ تک محدود نہیں۔ بلکہ صُوبجات میں بھی نظر آسکتی ہے ہسپتال سے چلکر ہم محلہ مرادیہ میں آئے۔ اس میں سُلطان مراد کا مقبرہ ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی سُلطان مرحوم کے نام پر ایک مسجد اور مذہبی مدرسہ بھی بنا ہوا ہے۔ اس مدرسہ ہیں نوّے کے قریب طلبا پڑھتے ہیں جنکو عربی و دینیات کی تعلیم دیجاتی ہے۔ اِتّفاق سے ہم ایسے وقت مدرسہ میں پہنچے کہ انہیں دوپہر کا کھانا کھاتے ہُوئے بھی دیکھ سکے۔ جہاں کھانا کھایا جاتا ہے اُسے ترکی بولی میں "عمارت" کہتے ہین۔ اس جگہ کل طلبا اکٹھے کھانا کھاتے ہیں۔ اگرچہ یہاں کا انتظامِ طعام بالکل سیدھا سادہ ہے لیکن اصُولاً اُسی ڈھنگ پر ہے جیسے کہ بلادِ مغرب کی ریزیڈنشیل یونیورسٹیوں ہیں درسگاہوں کے ساتھ ہی ڈائننگ حال بھی ہوتے ہیں جب ہم کمرہ کے اندر گئے طلبا اُسوقت جمع ہُوئے ہی تھے۔ یہ طلبا چھوٹے بڑے مختلف عمروں کے تھے۔ بیس سے چالیس سال تک۔ بعض بعض تو خاصی لمبی لمبی ڈاڑھیوں والے تھے۔ جنکی منقطع شکلیں قابلِ ادب اور واجب الاحترام معلوم ہوتی تھیں۔ یہ حضرات اُن نوجوانوں کے پہلو بہ پہلو بیٹھے تھے۔ جنکے ابھی مسیں ہی بھیگنی شروع ہُوئی تھیں۔ تھوڑی ہی دیر میں کھانا آگیا۔ جس ہیں ایک تو روٹیاں تھیں۔ جنہیں وہاں فدلہ کہتے ہیں اور جو ہندوستان کے نانوں سے ملتی جُلتی تھیں اور

اُنکے ساتھ "چوربا" یا سالن جو ہمارے ہاں کے شوربہ سے ذرا مختلف ہوتا ہے۔ روز تو اُن طلبا کو یہی کھانا ملتا ہے لیکن جمعرات کے دن پلاؤ و زردہ بھی دیا جاتا ہے۔

مُرادیہ سے ہم خداوندگار غازی کی مسجد کو گئے۔ وجہ تسمیہ اس مسجد کی یہ ہے کہ اسے اُسی سُلطان نے تعمیر کرایا تھا جسکے نام سے صوبہ خداوندگار موسوم ہے۔ یہ ایک چھوٹی سی مگر خوشنما عمارت ہے اور حال ہی میں اسکی تجدید و مرمت ہوئی ہے۔ اس مسجد کے قریب ہی وہ مشہور حمام واقع ہے جس کا پانی قدرتی چشمہ سے ہی گرم نکلتا ہے۔ مسجد سے واپس ہوتے ہوئے ہم نے ایک اور مشہور و معروف حمام دیکھا۔ اس کا پانی بھی اسی طرح قدرتی چشمہ سے گرم ہوتا ہے جس میں گندھک کا مادہ شامل ہے اور اکثر جلدی امراض میں اس کا غُسل بہت مفید پڑتا ہے۔

۱۴ ستمبر آج کی سب سے پہلی قابل ذکر بات یہ ہے کہ صُبح ہی صبح بروسہ نام ایک لوکل پرچے کا قائمقام ہم سے ملنے آیا۔ اس نے مسلمانانِ ہند کے متعلق کئی باتیں پُوچھیں جن پر بعد میں معلوم ہوا کہ اُس نے اپنے اخبار میں ایک طویل آرٹیکل شائع کیا۔ اور قسطنطنیہ واپس آنے پر وہاں کے ایک اخبار میں نقل شدہ وہ مضمون میری نظر سے بھی گذرا۔ نمازِ جمعہ ہم نے بڑی مسجد میں ادا کی جہاں شرکارِ جماعت کی تعداد بڑی معقول تھی۔ جب ہم مسجد سے لوٹ کر آئے تو پہلے رشدی مہتمم شفاخانہ تشریف لائے اور اُن سے تھوڑی دیر بعد ہز اکسلینسی گورنرِ صوبہ نے ملاقات بازدید کی غرض سے قدم رنجہ فرمایا جو درحقیقت ایک بڑی بھاری عزت افزائی اور ذرہ نوازی تھی۔ اور ہمارے لئے باعث فخر و مسرت۔ تیسرے پہر کو ہم وہ دیہاتی محل شاہی دیکھنے کے لئے گئے جو شہر کے قریب ہی ایک پہاڑ کی چوٹی پر سُلطان

عبد العزیز مرحوم کا بنایا ہوا ہے۔ جسپر سے نہایت دلفریب نظارہ دکھلائی دیتا ہے۔ اور جو بڑی خوش اسلوبی سے آراستہ کیا گیا ہو۔ گو سُلطانِ حال کے عہد میں یہ محل کبھی نہیں برتا گیا۔ پھر بھی ایسی اچھی حالت میں ہو کہ اس سے پایا جاتا ہے کہ اسکی نگہداشت بڑی احتیاط سے کیجاتی ہوگی۔

شام کو ہز اکسلنسی گورنر صاحب سے اُنہی کے دولتخانہ پر ملاقات ہُوئی۔ شب کو کھانا رشدی بے کے ہاں کھایا۔ یہ کھانا خالص تُرکی کھانے کا نمونہ تھا۔ اکثر کھانے نمک مرچ مسالے سے خالی ہوتے ہیں۔ ایک قسم کی شیرینی ضرور دسترخوان پر ہوتی ہو اور آخرین چانول آتے ہیں۔ چانولوں کا میز پر آنا اِس بات کی علامت ہو کہ کھانا ختم ہے۔

۱۵ ستمبر | آج ہم ہندوستانی "تکیہ" دیکھنے گئے اور وہاں اس مقبرہ کی زیارت کی۔ جس میں اس حصے میں قیام سلطنت اسلامی کے پیش رَو مدفون ہیں۔ ان صوفیائے کرام کی اسلامی خدمتیں اور اولوالعزمی بھی فی الواقع بڑی ہی حیرت انگیز قابلِ تعریف اور لائق داد ہیں کہ اُس زمانہ میں جبکہ سفر کی یہ سہولتیں خواب و خیال میں بھی نہ تھیں جو آج میسّر ہیں۔ اسلام کی تبلیغ و اشاعت کی خاطر تمام صعُوبتیں بطیبِ خاطر گوارا کرکے اُنھوں نے دُور دراز سفر طے کیے۔ غیر ملکوں میں غیر قوموں کے درمیان جہاں نہ انکا کوئی خویش تھا نہ یگانہ نہ واقف نہ آشنا سا۔ سکونت اختیار کی اور گویا اسلامی سلطنت کی بنیاد ڈال گئے۔ اس تکیہ میں شیخ نور اللہ قصُوری نے ہمارا خیر مقدم کیا۔ اپنا چھوٹا سا باغیچہ دکھلایا جو انکے اپنے ہاتھوں کا لگایا ہوا ہے اور جس میں ہر قسم کے پھلدار درخت موجود ہیں۔ یہاں کچھ درخت انجیر کے تھے

جنکی ٹہنیاں انجیروں سے لدی ہوئی تھیں۔ شیخ صاحب نے ہم سے فرمایا کہ اپنے ہاتھ سے توڑکر چکھئے تو سہی - ہمارے باغ کے پھل کیسے ہیں - یہ ہندی شیخ اب وہیں متوطّن ہیں اُنہوں نے وہیں شادی کر لی ہے اور ترکی خاتون کے بطن سے اُنکے دو بچّے بھی ہیں - تیسرا لڑکا جسکی عُمر کوئی پندرہ سال ہو گی آپ کی پہلی بیوی سے ہے جو عربی نژاد تھی -

ہم نے دوپہر کا کھانا ایک ہندی دوست سیّد محی الدین سُورتی کے ہاں کھایا - ان سے مل کر اور عرصہ کے بعد اپنے دیسی کھانے کھا کر طبیعت کو بڑی مسرت ہوئی - حلمی بے پرنسپل مدرسہ دستکاری ہم سے فرما چکے تھے کہ چار بجے ہمارے ہاں آئیگا - چنانچہ ہم سیّد محی الدین صاحب سے رخصت ہو کر مدرسہ کی طرف گئے - آپ اسوقت مع چند ممبرانِ سٹاف کے مدرسہ میں موجود تھے - دیر تک اس شاخِ تعلیم کے متعلق باتیں ہوتی رہیں جس سے پرنسپل صاحب کو خاصکر دلچسپی تھی - آپ سے یہ معلوم کرکے ہمیں بڑی خوشی ہوئی کہ جیسے سکول کے وہ پرنسپل ہیں اسی قسم کے اور بھی مکاتب اب قلمروئے عثمانیہ کے تمام صوبجات میں قائم ہو گئے ہیں - بلکہ آپ نے فرمایا کہ یمن جیسے دور اُفتادہ علاقہ تک میں ایک مکتبِ دستکاری موجود ہے - اور کہنے لگے کہ میرے خیال میں ان درسگاہوں سے مُلک کی مادی ترقی کو عنقریب ضرور بڑی معقول مدد پہنچیگی -

۱۲ ستمبر | ہم آٹھ بجے کے قریب مدینہ سے رخصت ہوئے - اس چند روزہ قیام میں یہاں ہمارے بہت سے دوست بنگئے تھے - جو صبح سویرے ہی ہمیں الوداع کہنے آگئے اور بعض ریلوے سٹیشن تک ہماری مشایعت کرنے چلے آئے - مدینہ کو واپس آتے ہوئے رستہ میں پھر وہی

دلفریب منظر دیکھنے میں آیا جاتے وقت نظر سے گذرا تھا۔ بلکہ اُس وقت کالے کالے بادلوں کا سین مزید براں تھا جو محیطِ آسماں تھے اور کچھ کچھ ترشح بھی ہو رہا تھا مگر ہم اپنی چھوٹی سی خوبصورت ٹرین کے اندر بھیگنے سے بچے رہے جو میدانوں سبزہ زاروں اور باغات کو طے کرتی ہوئی فراٹے بھرتی چلی جاتی تھی۔ ڈیڑھ گھنٹہ میں ہم مدانیہ جا پہنچے۔ جہاں افسر ضلع (جو وہاں قائم مقام والی کہلاتے ہیں) ہم سے ملے اور جب تک کہ قسطنطنیہ جانے کے لئے دُخانی کشتی پر ہم سوار نہیں ہو لئے ہمارے ساتھ رہے۔ کیونکہ انہیں والئے ولایت کی طرف سے ہدایت پہنچ چکی تھی کہ ہم سے ملیں اور ہمارے آرام کا بندوبست کر دیں۔ یہ ایک سن رسیدہ بزرگ تھے۔ اُنہوں نے چاہا کہ ہم ایک روز مدانیہ ہی میں قیام کریں اور وہاں سے اگلے روز روانہ ہو جائیں لیکن ہم نے اُنکا شکریہ ادا کیا اور تنگی وقت سے مجبوری ظاہر کی۔ ہم دو بجے قسطنطنیہ پہنچے مگر چونکہ سارا رستہ خاطر خواہ آرام سے نہ کٹا تھا بہت تھکے ہوئے تھے۔ اِس لئے ہم نے جلال بے کو گھاٹ ہی پر سے رخصت کر دیا اور گاڑی میں سوار ہو کر پیرا میں اپنے ڈیرہ پر چلے آئے۔

۱۷ ستمبر آج کا روز ہم نے ایک خوبصورت مکان میں گذارا جو سُلطان محمد فاتح کے تعمیر کردہ قلعہ قدیم موسومہ "رومیلیا حصار" کے قریب باسفورس کے دائیں طرف واقع ہے۔ یہ مکان حسین بے افسر تار و ڈاک کا تھا۔ یہ ایک عجیب بزرگ ہیں جو باوجود پیرانہ سالی کے جواں ہمت ہیں۔ کوئی پینتیس چالیس سال کی بات ہے کہ آپ ٹرکی کیطرف سے بمبئی میں قونصل جنرل تھے۔ اُردو بآسانی بول سکتے ہیں۔ گو ہندوستان چھوڑے آپ کو مدت گذر چکی۔ فارسی اور کچھ انگریزی بھی جانتے ہیں۔ اِسی لئے آپ کے ساتھ گفتگو کرنے میں ہمیں ہر طرح آسانی رہی۔ آپ کو ہندوستان اب تک

اچھی طرح یاد ہی جسکے ایک بڑے حصّہ میں سیر و سیاحت کر چکے ہیں۔ شمال میں اپشا ور بلکہ اس سے پرے تک کا علاقہ آپکا دیکھا ہوا ہی اور ہندوستان کے حالات و معاملات سے آپ گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ ہندوستان کے ساتھ آپکی ہمدردی اگرچہ ایک حد تک اس لئے بھی ہی کہ آپ عرصہ تک ہندوستان میں رہ چکے ہیں لیکن خصوصًا اسواسطے کہ ہمارے ملک سے آپ کو روحانی عقیدہ کا تعلّق ہی۔ آپ سلسلۂ نقشبندیہ میں مرید ہیں۔

ہم جیب بے کے پاس صبح کو گئے تھے اور دوپہر تک اُن سے بات چیت کرتے رہے جو اُنکے دفتر جانیکا وقت تھا۔ وہ ہمیں ایک صاحب کے سپرد کر گئے۔ جو اُنکے چھوٹے بچّوں کے اُستاد یا اتالیق تھے۔ ہم نے سوچا کہ جب تک آپ واپس آئیں ہم آس پاس کے قابلِ دید مقامات کی سیر ہی کر آئیں۔ چنانچہ ہم پُرانے قلعہ کے کھنڈرات کی طرف چلدئے۔ اور وہاں سے ذرا اور اوپر جاکر رابرٹ کرسچن کالج پہنچے۔ جو پہاڑ کی چوٹی پر اس کالج کی شاندار عمارت بنی ہوئی ہی۔ اسی پر بکتاشی فرقہ کے درویشوں کی بھی ایک چھوٹی سی جگہ ہی۔ اس فرقہ کی نسبت لوگوں میں کچھ عجب قسم کے افسانے مروّج ہیں۔ چونکہ یہ جگہ قریب ہی تھی ہم نے سوچا چلو ذرا اسے بھی دیکھ آئیں۔ چنانچہ وہاں گئے اور بکتاشیوں کے شیخ سے ملاقات کی۔ شیخ گو تعلیم یافتہ آدمی نہیں تاہم علم مجلسی میں ایک خاصہ ہوشیار شخص ہی۔ اس فرقہ کے لوگ تاج کی شکل کی ٹوپی اوڑھتے ہیں۔ انکے لباس۔ عادات اور گفتگو میں اور بھی بہت سی باتیں عجیب اور نرالی ہیں۔

۱۹ ستمبر | رومیلی حصار سے لوٹتے ہوئے سٹیمر پر ہم کونسل عالیہ کے ایک ممتاز ممبر احمد رشید بے سے ملے۔ ہمارے دوست جلال بے انہیں جانتے تھے۔ اُنہوں نے ہی آپ سے ہمارا تعارف کرایا اور ہمیں بتلایا کہ آپ مصر میں کئی سال رہ چکے ہیں اور مصر

ہیں خدیو المکرم کے مُصاحبانِ خاص میں تھی۔ آحمد رشید بے انگریزی بول سکتے ہیں۔ اسی زبان میں ہم اُن سے دیر تک بات چیت کرتے رہے اور اثناء گفتگو میں یہ بھی خیال ظاہر کردیا کہ ہم ہز ہائی نس خدیو مصر سے مُلاقات کا شرف حاصل کرنا چاہتے ہیں کیا اچھّا ہو اگر آپ اسکا کچھ بندوبست کرسکیں۔ اُنھوں نے کہا کہ میں شام کو خدیو سے ملنے جاؤنگا اور آپکی تمنّا گذارش کردونگا۔ اگر ہز ہائی نس نے منظور فرمایا تو آپکو اطّلاع دیدیجائیگی جب سے ہم نے خدیو کے دارالسعادة آنے کی خبر سُنی تھی اُسی وقت سے ہمیں ازحد اشتیاق تھا کہ کسی طرح سے ہم کو بھی مُلاقات کا موقعہ مل سکے۔ مگر ساتھ ہی اس کا انتظام مشکل نظر آتا تھا۔ خصوصًا بدیں وجہ کہ ہم چند ہی روز میں دارالخلافت سے رخصت ہونے والے تھے۔ مگر حُسنِ اتّفاق سے رشید بے کا اس موقعہ پر مل جانا ہماری اس مُلاقات کا ذریعہ بنگیا۔

۲۰ ستمبر صبح ہی جلال بے آئے اور آحمد رشید بے کا یہ پیغام لائے کہ خدیو المکرم آپ کو بطیبِ خاطر شرفِ باریابی بخشینگے۔ اگر آپ شام کو ۵ اور ۶ بجے کے درمیان ملنے جائیں۔ چنانچہ تیسرے پہر کو ہم بیک کی طرف گئے جو باسفورس کے کنارے واقع ہے اور جہاں خدیو کا محل ہے۔ یہ محل ایک شاندار سفید عمارت ہے جسکے گرد اگرد نہایت خوبصورت باغات لگے ہوئے ہیں اور باسفورس کا پانی اس کی سیڑھیوں سے آکر ٹکراتا ہے۔ ہم کو ایک کمرۂ ملاقات میں لیجاکر بٹھایا گیا۔ معلوم ہوا کہ خدیو صُبح سے بیمار ہیں لیکن اب تشریف لانے والے ہیں۔ اتنے میں ایک خوبصورت دُخانی کشتی باسفورس کے اس کنارہ سے آتی ہوئی جہاں ہز ہائی نس ایک نیا محل تعمیر کرا رہے ہیں نظر پڑی۔ آپ بہت سادہ لباس پہنے ہوئے تھے اور

چند آدمی پرائیویٹ سٹاف کے ہز ہائی نس کی خدمت میں تھے۔ ورود سے تھوڑی دیر بعد خدیو کے پرائیویٹ سیکرٹری ہمیں حضور خدیوی میں لے گئے اور ایک ایک کرکے پیش کیا۔ آپ نے ہمارے ساتھ مصافحہ کیا اور بیٹھنے کے لئے ارشاد فرمایا۔ ہز ہائی نس نے اس امر کے اظہار سے سلسلۂ گفتگو شروع کیا کہ آپ کے شوقِ ملاقات سے انہیں مسرّت ہوئی جس کے جواب میں مَیں نے عرض کیا کہ حضور کا شرفِ باریابی بخشنا ہمارے لئے بڑے فخر و مسرّت کا موجب ہے۔ ہز ہائی نس نے یہ خیال بھی ظاہر فرمایا کہ مسلمانانِ ہند کی ترقی سے جسکی خبریں پہنچتی رہتی ہیں ہمیں بہت خوشی ہوتی ہے۔ مَیں نے کہا کہ ہم مسلمانانِ ہند کو اس بات سے نہایت طمانیت و مسرّت حاصل ہوتی ہے کہ ہمارے مصری بھائی بھی بفضلہ میدانِ ترقی میں قدم بڑھا رہے ہیں اور عربی علم ادب کی حفاظت و اشاعت میں انکی مساعیِ جمیلہ ہمارے نزدیک بالخصوص قابلِ تعریف اور مستحقِ شکر گذاری ہیں۔ چونکہ خدیو المکرم انگریزی باآسانی بول سکتے ہیں۔ اِس لئے اُن سے ہماری بات چیت بلا وساطتِ ترجمان کوئی گھنٹہ بھر تک ہوتی رہی جسکے دوران میں اُنہوں نے یہ بھی فرمایا کہ اگر آپ ہندوستان کو واپس ہوتے ہوئے ہمارے دار الخلافہ میں قیام کرکے ایک بار پھر بھی ملیں تو انہیں بہت خوشی ہوگی۔ بھلا قاہرہ کی سیر کون نہیں چاہتا اگر اسے نصیب ہو۔ اور ہمارے دل میں تو مدّت سے اسکی تمنّا تھی۔ اور اب حضرت خدیو المکرم کے اس ارشاد سے یہ تمنّا اور بھی تقویّت پاکر عزم بالجزم کی شکل میں تبدیل ہوگئی۔ چنانچہ ہم نے عزم کیا کہ اس سے بڑھ کر ہمارے لئے اور کونسا امر موجبِ فخر و مباہات ہوسکتا ہے کہ ہمیں خاص حضور کے پایۂ تخت میں پہنچ کے آداب

بجالانے کی سعادت حاصل ہو۔ اس مُلاقات وگفتگو کے اختتام سے پہلے مَیں نے
حضرتِ خدیو سے یہ خیال ظاہر کیا کہ ہندوستان کے بہت سے ممتاز مُسلمان بھی
اس بارہ میں غور وخوض کر چکے ہیں اور قیامِ انگلستان کے زمانہ میں مجھے بھی اکثر
بارسُوخ مُسلمانوں سے جو گویا دیگر اقطاعِ عالم کے چیدہ افرادِ ملّت تھے اس بارہ میں
گفتگو کرنے کا موقعہ ملا ہے کہ مختلف ممالکِ دُنیا کے مُسلمانوں کی ایک عظیم الشّان
کانفرنس قائم ہونی چاہیئے جس میں بزبانِ عربی بحث ومشورہ ہُوا کرے اور وُہ مناسب
تدابیر سوچی جائیں جن کے عمل میں لانے سے مُسلمانانِ دُنیا کی تعلیمی۔ تمدّنی اور
تجارتی ترقی کا کوئی یکساں پروگرام اختیار کیا جاسکے۔ ساتھ ہی مَیں نے یہ
بھی گذارش کردیا کہ میری نیز اُن اکثر بزرگانِ ملّت کی رائے میں جن سے مجھے اس کے
متعلق تبادلۂ خیالات کا موقعہ ملا ہے حضور کا پایۂ تخت اس قسم کے اجتماعِ ملّی کیلئے
زیادہ تر موزون مرکز ہے۔ کیونکہ نظر بحالاتِ موجود ایسی کوئی مجلس ہندوستان یا مصر
ہی میں انعقاد پذیر ہوسکتی ہے۔ اس لئے کہ انہی دو ممالک میں قوانینِ برطانیہ کی
برکت سے تحریر وتقریر کی آزادی حاصل ہے۔ مگر بہ نسبت کلکتہ یا بمبئی کے قاہرہ بلحاظِ نسب
اور زیادہ باموقع ہوگا"۔ ہمیں اس بات سے بڑی ہی خوشی ہوئی کہ ہز ہائی نس نے اس
خیال سے دلی ہمدردی ظاہر فرمائی اور کہا کہ مابدولت بطیبِ خاطر اس مفید تجویز کے
معاون ہونگے جب کبھی اُس نے عملی شکل اختیار کی۔ ہم نے ہز ہائی نس کو ایک بڑا
روشن خیال فرمانروا پایا۔

۱۸ستمبر اگو قسطنطنیہ میں سیر کرنے اور نئی نئی ملاقاتیں پیدا کرنیکی بھی بڑی گنجائش
تھی مگر ہمارے پاس اب اتنا وقت کہاں رہا تھا؟ زیادہ سے زیادہ یہی ہوسکتا کہ

اس وقت تک جن حضرات سے مُلاقات ہُوئی تھی اُن سے رُخصت ہولیں اور اُنکی عنایت کا شکریہ ادا کریں۔ چنانچہ سب سے پہلے ہم ہز ہائی نس فرید پاشا سے ملنے گئے۔ آپ حسبِ معمول بڑی خوش خلقی و مدارات سے پیش آئے۔ ہم نے اس موقع کو غنیمت جانکر عرض کیا کہ لندن میں ایک مسجد بنانے کی بڑی ضرورت ہے۔ خیال ہے لندن واپس جاکر وہاں کے رہنے والے مسلمانوں کی طرف سے ایک عرضداشت حضورِ سُلطانی میں ارسال کریں۔ آپ سے بھی استدعا ہے کہ اس بارے میں ہماری اعانت فرمائیں۔ جناب ممدوح نے وعدہ فرمایا کہ مَیں حتی الامکان اس کام میں ساعی ہونگا۔

۲۲ستمبر۔ آج ہم باقی احباب سے آخری مُلاقات کرنے کے لئے گئے پہلے ہز اکسلنسی وزیرِ خارجیہ کمپجد منتیس پہنچے اور انکی عنایات کا شکریہ ادا کیا کہ آپ نے ہمیں جلال اُفندی بے جیسا قابل گائیڈ مرحمت فرمایا۔ سعد الدین بے حقی بے اور ہز اکسلنسی نوری بے اہلکاران صیغۂ خارجیہ سے بھی جاکر ملے۔

۲۳ستمبر۔ قصرِ یلدیز کے آخری دیدار پر ہمارے قیامِ دارالسّعادۃ کا خاتمہ تھا۔ وہاں جاکر ہم نے حاجی علی پاشا سے مُلاقات کی۔ اُنہی کی معرفت وُہ فوٹوگراف ہمیں ملے جنکا ادھم پاشا نے ازراہِ عنایت وعدہ فرمایا تھا۔ اس بلند نام سپہ سالار کی تصاویر کو جنپر دستِ خاص سے کلماتِ تہدیہ رقم فرمائے تھے۔ ہم ہمیشہ بڑے ادب و احترام سے اپنے پاس رکھینگے اور انکے عزیز رکھنے میں یہ بات جس سے ہم بہت متاثر ہُوئے کبھی نہ بھولیگی کہ آپنے اپنے وعدے کا اس قدر خیال رکھا کہ بغیر ہماری یاد دہانی کے خود ہی وقت پر اس کا ایفا فرمایا۔ پھر ہم غالب بے کی خدمت میں گئے۔ جنکی ترقی انہی دنوں عہدۂ

وزیرِ تشریفات پر ہُوئی تھی انہیں اس منصبِ اعلیٰ پر ترقی پانے کی مُبارکباد دی۔ ہم نے عرض کیا کہ ہم وداعی مُلاقات کو حاضر ہُوئے ہیں۔ آپ نے بھی مثلِ دیگر احباب کے یہی فرمایا کہ خُدا پھر بھی کبھی یہاں آنا نصیب کرے۔ محل سے ہم گاڑی میں سوار ہو کر قاضی عسکر سے ملنے گئے جنکی قابلیت اور التفات کا ہمارے دل پر پہلی ہی مُلاقات میں نہایت گہرا اثر پڑا تھا۔ مگر افسوس کہ وُہ اسوقت دولتخانہ پر تشریف نہ رکھتے تھے۔ اِس لئے ہم آخری ملاقات سے محروم رہے۔ اب وقت بہت تھوڑا رہگیا تھا۔ اپنے ڈیرے پر واپس آئے تو چند احباب کو وہاں بھی پایا جو بغرضِ مُلاقات ہمارے منتظر بیٹھے تھے۔ اُن سے رخصت ہو کر اور اُن میں سے بعض کو اپنے ساتھ لیکر ہم نے سٹیشن کی راہ لی۔ اِنہی میں جلال بے بھی تھے جو اخیر تک ہمارے ساتھ رہے۔ اور بڑی گرمجوشی سے ہاتھ ملاتے ہُوئے ٹھیک اُسوقت رخصت ہُوئے جب ریل گاڑی استانبول کے پلیٹ فارم سے چل پڑی۔ وُہی استانبول جس میں ہمارے چند ہفتے بہت ہی مفید سَیر اور پُرلُطف مُلاقاتوں میں صرف ہُوئے تھے اور جس کی مداراتیں اور مہمانیاں ہمیں غالبًا مدّت العمر فراموش نہ ہونگی +

ہز ہائی نس عبّاس حلمی پاشا ۔خدیو مصر۔